

دل کے ساتھ شیریں رنگ • زندگی کی تصویریں

کراچی

سچی کہانیاں

35 سال

SEPTEMBER

2018

وٹرز

تقدیر گزیدہ موبینہ تول

صفت فزعون محرقہ سم بلوچ

آبیبی مسکن ڈاکٹر عاشر نواز

محال کامل، سچی کہانیاں کا نیا ہوشربا سلسلہ جو پڑھنے والوں کو جادو کی کالی دنیا سے آشنا کرائے گا
'امانت اس' نہایت دلچسپ اور پراسرار سلسلہ جس کی ہر سطر خوف اور دہشت میں ڈوبی ہوئی ہے
'مسئلہ یہ ہے' آپ کے مسائل کا روحانی حل، سچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ

سچی کہانیاں

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانس سہام مرزا



مدیر اعلیٰ: منزہ سہام

مدیر: دانیال ششی

نائب مدیر: ماہم اوزلین

رکن آل پاکستان نوجوان سماجی
رکن نول آف پاکستان نوجوان سماجی

MEMBER
APNS
CPNE

خط و کتابت کا پتہ: 88-C II فرسٹ فلور خیابان جامی کرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 70 روپے * جلد: 35 - شمارہ: 09 * ستمبر 2018ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

ہر جلی کیشز کے تحت شائع ہونے والے ہر جوں ماہنامہ دو شمارہ اور جلی کیشز میں شائع ہونے والی ہر جری کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

منیجر مارکیٹنگ

زین ششی

0331-8221212

منیجر سرکولیشن

آفتاب عالم

0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مخدوم ایڈیٹنگ (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893121

021-35893123

BAKE
PARTOR

Khamay mein jab chacha huya twist
Toh Qeema Macaroni Instant Hui

Try our new Qeema Macaroni
with Bake Partor. You will get a
to add more delicious taste.



customerservice@bakepartor.com | www.bakepartor.com | @bakepartor

142	تماشہ فاطمہ عبدالخالق	136	فلندی طریقت تحسین جونیجو	130	حسد کی آگ کوشر اسلام	26	غلام مجیب ہزاردار ام ایمان (غزلہ عزیز)	08	احوال مدیرہ اعلیٰ	07	شکوہ کیسا؟... منزہ سہام
170	جوڈو گیا وہ مر گیا فقیمہ سعید	148	عامل کامل پیر محمد شاہ قادری	146	ڈھا کہ بوائے السان فاطمہ ارمان	42	تتلیاں قید تھیں زرین نسیم	34	یہ حقیقت جاوید راہی	32	آج کی مصنفہ شگفتہ شفیق
192	مسلم خواتین تہمینہ حبیل ظہیری	184	ڈاکے سیاست کرن شبیر	178	ناقابل شناخت نجیب عمر	68	تعارف فریدہ فری	62	بہو کی کتھا عظمیٰ شکور	54	نصیب حاجرہ عمران خان
223	پاکستانی شوبز ادارہ	216	جن کا انتقام ساحل ابڑو	200	کولڈ فیئر شبیبہ مظہر	84	گناہ گار ایم شاہ بخاری	80	قسمت کے کھیل شیخ معظم الہی	70	خناس حنا بشری
248	آپ کی ڈائری قارئین	240	مسئلہ یہ ہے ادارہ	226	امتاس شازی سعید مغل	124	منزل کی جستجو محمد شہزاد	121	غزلیں ادارہ	96	حصار ڈاکٹر علی ارسلان
256	شعرو سخن قارئین										

سچی کہانیاں ملنے میں اگر دشواری ہے تو ان نمبرز پر رابطہ کیجیے

0300-2680248	کراچی ایجنٹ
0300-4009578	لاہور ایجنٹ
0300-6301461	ملتان
0321-3060477	حیدرآباد
0300-6040080	سرگودھا
0344-9290185	پشاور
081-2820375	کوئٹہ
0333-6539585	فیصل آباد
0345-5058891	راولپنڈی
0344-3445464	نواب شاہ
0300-9311166	سکھر
نمائندہ خصوصی	
0300-4319264	عبد الغفار عابد
0300-9657926	ارشاد اقبال چوہان
0301-6540200	ممتاز احمد
0301-2868143	مور شاہد
0331-1173320	عمران مظہر
0301-7472712	مجید احمد جانی

شکوہ کیسا؟... گلہ کیوں؟

اب تک عید کے تہوار غریبوں کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے رمضان تو پانی اور نمک کے ساتھ گزری جاتا ہے مگر عید پر غریب جب اپنے بچوں کو رنگ برنگے کھلونے، نئے کپڑے اور جوڑے نہیں دلا پاتا تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ عید الاضحیٰ پر دوسرے کے جانوروں کو ترستی دگا ہوں سے دیکھنا بھی کم و بیش ہر سفید پوش اور غریب کا نصیب ٹھہرا۔

بڑے تو صبر کر رہی لیتے ہیں مگر بچے وہ تو معصوم ہوتے ہیں انہیں کون سمجھائے کہ بیٹا تمہارے باپ کی اتنی حیثیت نہیں کہ تم سال میں ایک بار بھی نیا کپڑا پہن سکو انہیں کون سمجھائے کہ قربانی کے جانور کو خریدنا ان کے والدین کے بس میں نہیں اور اب کچھ عرصے سے یوم پاکستان منانا بھی غریب کے بچے کے نصیب میں نہیں رہا پہلے تو صرف جھنڈے بکتے تھے بھریوں ہوا کھکر ان ایسے آتے چلے گئے جو ملک ہی بیچنے کے درپے رہے مگر اب تو جھنڈوں کے ساتھ ساتھ ہرے سفید جوڑے، فرائیں، جٹے، بندے، بالیاں، مختلف غیر ملکی کرداروں کے ماسک جو ہرے اور سفید رنگ میں رنگے ہوتے ہیں غریب کے بچے کا دل لپاتے ہیں..... وہ کچھ بھی نہیں خرید پاتے اور اپنی ہی نظروں میں سچے پاکستانی نہیں ٹھہرتے کیونکہ جس کے پاس خرچنے کو جتنا مال وہ اتنا سچا محبت وطن ہم نے غریب کے بچے سے خوشیاں تو جھینٹی ہی تھیں اب ان کی پاکستان سے محبت پر بھی سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ یہ کیسی محبت ہے یہ کیسا لگاؤ ہے؟ ہم اپنی آنے والی نسلوں کو کیا پیغام دے رہے ہیں کوئی یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اصل محبت تو ملک کی خدمت میں ہے..... قائد اعظم کے اصولوں پر چلنے میں ہے۔ ان کی طرح بے انتہا محنت میں ہے..... اب تک تو صرف قربانی کے جانوروں کے نام ہندوستانی فلم انڈسٹری کے کرداروں پر تھے مگر اب تہذیبی آگنی ہے غیر ملکی کرداروں کے ماسک بھی پاکستانی پرچم کے رنگ میں رنگے برائے فروخت ہیں۔ پتہ نہیں کیوں ہمارے وطن میں خالص جذبوں کی کوئی اہمیت اور وقعت نہیں رہ چیز برائے فروخت ہے اب وہ چاہے..... پرچم ہو یا ملک سچی بات تو یہ ہے کہ جس کی جو حیثیت ہے وہ وہی شے بچ ڈالتا ہے غریب جھنڈا بچ کر کما رہا ہے

اور میر ملک بچ کر..... پھر شکوہ کیسا؟... گلہ کیوں؟

منزہ سہام

احوال

مدیرہ علی

قارئین کے درمیان رابطہ آپ کے خطوط اور ان کے جواب

عزیز احوالو! امید کرتی ہوں کہ آپ سب کی عید بہت اچھی گزری ہوگی کہیں سیاہ بادلوں نے موسم کو دلفریب بنائے رکھا تو کہیں دم بھگم نے ماحول کو خوشیوں سے تر کیے رکھا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اسی خوبصورت اور دلفریب موسم میں ہم سب نے پورے قومی جوش و جذبے سے یوم آزادی بھی منایا۔ میں یہاں چند باتیں آپ سب کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں اور ایک عہد بھی لینا چاہتی ہوں۔ پچھلے کچھ سالوں سے یوم آزادی پر جوبلہ گلہ اور طوفان بدتمیزی برپا کیا جاتا ہے مجھے بتائیے کیا یہ ملک ہم نے اپنی آسانی سے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو بھول جائیں۔ دوران ہجرت و ہجرت و ہجرت کا بازار گرم کیا گیا تھا۔ خواتین کی عصمت دری کی گئی بچوں بوڑھوں اور جوانوں کو بلا تفریق قتل کیا گیا۔ کیا اتنی بڑی قربانی کے بعد حاصل کیے گئے اپنے پیارے وطن کے یوم آزادی پر بننا سائنس سارے شہر میں اڑنا بے ہنگم ناچ گانے خوشی کے نام پر بدتمیزی آتش بازی میں لاکھوں روپیہ ضائع کرنا کیا یہ سب ہمیں ذہب دیتا ہے۔ خوشی کا مطلب تماشا گناہ کا ہے ہو گیا؟ یہ دن تو ہمیں بہت احترام سے منانا چاہیے۔ مسجدوں میں عبادت کا اہتمام کرنا چاہیے رت جگے میں ملک کی سلامتی کی دعائیں کرنی چاہیے۔ رب العزت کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ سڑکوں پر دھما چوڑی بجانے کے بجائے اپنے مکے اپنے شہر کے لیے کچھ شہت کام کرنا چاہیے۔ آئیے مل کر عہد کریں کہ اگلے سال بے جا اصراف اور بے جا ہل بازی سے اجتناب برتیں گے اور ایک ذمہ دار پاکستانی ہونے کا ثبوت دیں گے۔ اس بار کچی کہانیاں کے صفحات میں آپ کے لیے ایک خاصے کی چیز پیش کی جا رہی ہے امید کرتی ہوں پسند آئے گی۔ چلیے اب بڑھتے ہیں اپنے پہلے خط کی جانب.....

محمد حنیف ننکانہ صاحب سے لکھتے ہیں۔ مدیر اعلیٰ پیاری سی بٹیا منزہ صاحبہ سدا خوش رہو اور خوشیاں بانٹتی رہو سلام مسنون اور سلام خلوص کے بعد خیریت کا طالب اللہ کے فضل سے خیریت سے اور امید کرتا ہوں کہ اللہ رب العزت کی مہربانی میری بیٹی کے ساتھ بھی شامل حالی ہوگی۔ کافی دنوں کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہو رہا ہوں اس غیر حاضری کی وجہ میرے بہنوئی کی وفات تھی۔ پیاری بٹیا زیت کے عنوان سے کہانی حاضر خدمت ہے غلطیاں بہت ہوں گی ان کی نوک نلک سنوار کر کسی قریبی اشاعت میں شامل کر لینا۔ کہانی کچھ لمبی ہے اگر مہنگائی کا ڈر ہو تو دو تین اقساط میں لگا لینا اگر شائع نہ بھی کرنی ہو تو مجھے واپس کر دینا آخر میں اپنی بیٹی کو بہت بہت پیار اور سلام ادارے کے سب افراد کو سلام سب قارئین کو بھی سلام دعا ہے کچی کہانیاں بہت بہت ہی زیادہ ترتی کرے آئیں۔

☆: حنیف انکل! اللہ آپ کے بہنوئی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آئیں۔ آپ کی تحریر موصول

ہوگئی ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔

☆: فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ! السلام علیکم! جولائی کے مہینے کے شمارے کا انتظار کرتے ہوئے 4 جولائی کو شام جب گھر پہنچا تو بذریعہ ڈاک کچی کہانیاں موصول ہوئیں۔ جب کھول کے شمارہ دیکھا تو دل باغ باغ ہو گیا میرا خط اس مہینے کا بہترین خط ہے۔ ایڈیٹر صاحبہ یہ تو آپ کی حسن نظر ہے جو کہ میرے لیے حوصلہ افزا ہے۔

☆: فیصل بھائی تھیرہ کیونکہ پرانا تھا اس لیے حذف کر دیا۔ میں امید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی اپنے قیمتی وقت سے نوازیں گے۔

☆: ایم یعقوب احمدانی ڈیرہ غازی خان سے لکھتے ہیں السلام علیکم آپ کی منزہ سہام اور پوری ٹیم کچی کہانیاں کو الفت بھرا سلام قبول ہوا امید ہے خوش رہا بش لمحے گزر رہے ہوں گے آپ کی جی میں سب سے پہلے معذرت خواہ ہوں کچی کہانیاں سے رشتہ جوڑ کر الفت جاہت خلوص محبت نکھار کر نے سے کچھ عرصہ قاصر رہا امید معافی ملے گی شکریہ دلوں کی لگن کبھی زیادہ دوری پیدا نہیں کرنے دیتی۔ میں بھی کچھ عرصہ پالی پیٹ کے لیے دور رہا کاشی بھائی کے جانے کے بعد پرچہ نہ دیکھ سکا جس کا بہت دکھ ہے۔ پچھلے ماہ جون میں اسٹوری لگی تو بھائی عزیز نے بتایا۔ بہت خوشی دل کوئی۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جس سے ان الفاظوں میں شکریہ کہوں، جون کا پرچہ بڑی محنت سے ملا عمدہ عمدہ اسٹوری سے سرشار محبت سے بھرا تھا۔ کبھی دوستوں نے اچھا اور خوب محبت سے دکھ درد دیکھے تھے باقی خواہشات تو آج کی اس دور میں کسی کی ساری پوری نہیں ہوتیں اور آج میں ڈرتے ڈرتے محفل کچی کہانیاں میں حاضر ہوا ہوں اب انشاء اللہ ہر ماہ کو شش کروں گا کچی کہانیاں پوری ٹیم نے بہت عزیمت جو شاید کبھی نہ بھول پاؤں گا ایک اسٹوری کے ساتھ چند نونے الفاظ آپ کی نظر کرتے ہوئے اجازت طلب چاہتا ہوں وسلام فرح انیس، سدرہ انور علی، ارم ناز کراچی، ارم ناز ڈی جی خان یوسف لغاری ابو ہریرہ بلوچ، عبدالغفار عابد جوہری یاسر کی اور تمام خلوص دل سے عزت پیار سے بندہ ناچنے کا تھخہ سلام قبول ہو ہمیشہ خوش و خرم کے ساتھ زندگی کے حسین پل اپنوں کے ساتھ گزاریں اور میری زندگی جیسی آئینہ آئین۔

☆: بھائی ایم یعقوب ڈرتے ڈرتے کیوں پورے طعراق سے احوال میں آجئے۔ یہ آپ کی اپنی محفل ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم روزگار انسان کو بہت مصروف کر دیتا ہے مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کچی کہانیاں سے آپ سب کا پیار بہت عرصہ پہلے لوگوں کو اس سے دور نہیں رکھ سکتا تو جناب جرم آئیں۔

☆: شمیمہ مشتاق کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ آپ کی اور کچی کہانیاں فیصلی السلام علیکم! آج اگست کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا یقین کیجیے میرا تو دن خوشگوار ہو گیا۔ مگر گھر کے کام متاثر اور گھر والے متاثر ہوئے۔ اب کیا کریں ہمارے شوق کو کچی کہانیاں اور دو شیزہ کے پتھارے جو لگے ہیں۔ سب سے پہلے ڈیشیاں شیخ صاحب، مظفر علی برمانی صاحب اور نقیہ فضل صاحبہ کا بہت شکریہ جنہوں نے دعاؤں میں یاد رکھا ملازم حسین شیرازی صاحب، شاہد رفیق صاحب، ساحل ابڑو، حضرات نے کہانی لال جی کو سراہا بہت نوازش۔ فیصل ندیم بھٹی صاحب آپ کو بہترین خط لکھنے پر مبارکباد آپ کی قسمت پر رشک بھی آیا سال بھر کے لیے اعزازی رسالے کے مالک بن گئے۔ دعاؤں کے لیے نوازش! انیلا طالب اور عالیہ نور صاحبہ کے لیے دھیر دو دعائیں تمہیں جو نیچو آپ کی اچھی بات سے میں جی مشفق ہوں۔ ملازم شیرازی اور عبدالغفار صاحب کا خط عمدہ تھا فیصل مشتاق صاحب نے غالب کے خطوط کی یاد تازہ کر دی۔ برجستہ انداز بیان خط پڑھ کر بھی آپ کی لطف بھی مہر پر ویز صاحب کا تھیرہ شاندار تھا۔ مور شاہد صاحب سے مل کر خوشی

ہوئی ایم مسائل عشق حقیقی سلی نسیم بانو فرمانبردار اولاد اچھی کاوش تھیں۔ تقدیر برگزیدہ موہنہ بتول اردو ہندی مکالماتی انداز نے کہانی کا لطف دو بالا کر دیا جاوید راہی ہمیشہ کی طرح ایک جاندار تحریر پیش کرنے میں کامیاب رہے اللہ بوجھے کا منزہ آئی آپ ہم لکھاریوں کو نصرت دیتی ہیں۔ عمدہ برجستہ شگفتہ تحریر نے مسکرانے پر مجبور کر دیا کہانی میں جس کا سحر اختتام تک قائم رہا۔ میں جانتی ہوں خط طویل ہو رہا ہے۔ مگر آج جن چند باتوں نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا آپ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں پچھلے دنوں چند ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے میری نظر میں دو چیز اور سچی کہانیاں کا معیار اور بھی بلند کر دیا ہے اور اس کا سہرا بلا شرکت غیرے منزہ آپ کے سر جاتا ہے۔ ہمارے ارد گرد ہر شے (Materialistic) ہو چکی ہے۔ ہر جگہ برینڈڈ اور نمبرڈ آگے ہیں۔ تو نمبروں کی دوڑ سے شمارے اور لکھاری کہاں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ چند لوگوں نے اگر اپنے ذہنوں میں معیار کا ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے تو یہ ان کی ذہنی اختراع کے سوا کچھ نہیں اور یہی وجہ ہے جو انہیں نئے لکھنے والوں سے خوف زدہ رکھتی ہے۔ اکثر کہانیاں اسی بنا پر مسترد کر دی جاتی ہیں۔ چاہے کہانی کتنی ہی معیاری ہو۔ قدیم لکھنے والا کتنی ہی بوس کہانی ارسال کرے چھاپ دی جاتی ہے۔ چند مخصوص موضوعات کو ہی پیش کیا جاتا ہے۔ کون عظیم لکھاری ہے کون نہیں اس کا فیصلہ قاری کرتا ہے۔ چند مخصوص اذہان نہیں یہی وجہ ہے کہ دو چیز اور سچی کہانیاں معیار کے لحاظ سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ اس سلسلے میں منزہ آپ کی اہمیت کی داد دوں گی جو رسک لینے سے خوف زدہ نہیں ہوتیں۔ جنہیں خود پر اعتماد ہے۔ انہوں نے ہمیشہ نام سے زیادہ کام کو عزت دی۔ میں تہہ دل سے ان کی مشکور و ممنون ہوں جو احسان انہوں نے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں پر کیا ہے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں متفرق کہانیوں کا وہ گلدستہ بن گیا ہے جو ہر مزاج کے آگن کو مہم کا تا ہے۔ ہر ذوق کو تسکین دیتا ہے۔ منزہ آپ جیسے زرخیز ذہن ہی نے دور کی کسی حسینہ معین انور مقصود یا مشتاق احمد یوٹی کو جنم دیں گے۔ اگر آپ جیسے کلمے ذہن کے لوگ نہ ہوں تو ہمارا ادب بے ادبوں سے بھر جائے۔

☆ شہینہ ڈیر! تمہارے خط نے تو مجھے بھلا کر کیا کر دیا۔ بس اب زیادہ تعریف مت کرو میرا تو طرہ بقہ ہی ہے میں شخصیت برستی کی بالکل قائل نہیں جو اچھا لگے گا وہ ضرور چھپے گا ذاتی تعلقات کو پیشی سے میں بھی آپ کی میرٹ کا قائل نہیں کر سکتی چاہے سانس میری اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

☆ ارشد اقبال چوہان بڑا نوالہ سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہنا منزہ صاحبہ السلام علیکم! شمارہ تو ماشاء اللہ وقت پر ہی مل گیا تھا مگر بیحد مصروفیت مطالعہ جلدی نہ کر سکا۔ اس لیے خط میں ذرا دیر سے پہلے احوال کی احوال بھائیوں کی میری اور آپ کی بھی رائے لا حاصل بحث کو ختم کرنے کی ہی ہے تو آئندہ کے لیے قیمتی صفحات ضائع نہ ہی کیے جائیں تو بہتر ہے۔ رہا اب شیر صاحبہ نے میرے خیال کو اچک لیا ہے ریشم کے دھاگے بند ہی کر دیں حامل کامل انشاء اللہ اس کی کمی پورا کر دے گی۔ آپ نے نمائندہ بنانے کی اجازت طلب کر کے شرمندہ کر دیا ہے۔ سچی کہانیاں پر جس طرح ہمارا حق ہے اسی طرح سچی کہانیاں کا ہے اور اس کے تا طے آپ کو پورا اختیار ہے۔ ڈھلے بیروں کا بھی بس کچھ نہ گیا ہو۔ انعام حاصل کرنے والوں کو بہت مبارکباد۔ مگر فیصلہ ندیم بھی صاحب سے مجھے ہمدردی ہے کہ 6 شمارے 70x60 بہر حال مبارکباد پر ان کا بھی حق ہے۔ ضدی ماں جی اور آخر گناہ کیا تھا بہت خوب ہیں باقی ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اس دفعہ ابھی تک کوئی کوتاہی نظر سے نہ گزری ہے خوب۔

☆ بھائی ارشد! دیکھیے آپ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے ریشم کے دھاگے پہلے ہی بند کر دی گئی ہے۔ آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔ فیصلہ آباد میں سچی کہانیاں پڑھنے والوں کو ملنے میں کافی دشواری ہے میں آپ

کو اسی سلسلے میں زحمت دوں گی۔ لوگ آپ سے رابطہ کریں گے آپ مجھے آگاہ کیجیے گا انشاء اللہ آپ کا تعاون رہا تو فیصلہ آباد جیسے بڑے شہر میں سچی کہانیاں ہر اسٹال پر دستیاب ہوگا۔

☆: یہ کچھ کل فیصلہ آباد سے لکھی ہیں۔ ایک طویل عرصے کی چھٹی کے بعد حاضر خدمت ہوں امید ہے اس محفل کے نئے اور پرانے لکھاری ٹھیک ہوں گے اور درگزر کریں گے ان تمام قارئین کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری کاوش کو سراہا میری حوصلہ افزائی کی سب سے زیادہ شکر گزار منزہ آپ کی اور مرحوم ایڈیٹر صاحب ناصر رضا صاحب سے جب پہلی دفعہ بات ہوئی تھی مجھے کہانی بھیجئے کا محرک ملا ان کے یہ الفاظ ابھی آپ انتظار کس بات کا کر رہی ہیں۔ جلدی سے قلم اٹھانے اور کہانی لکھ بھیجیں۔ میری ٹینشن ختم۔ اپریل کے بعد میں ایک نئی کہانی کے ساتھ حاضر خدمت ہوں یہ کہانی معاشرے کی ایک حق حقیقت پر مبنی ہے۔ جو نا صرف میرے بلکہ آپ کے ارد گرد موجود ہوگی یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے عورت ہی قربانی دیتی ہے۔ اور قربانی سال بہ سال نسل در نسل چلتی ہے۔ نرس ہزاروں سال بھی روتی رہے اپنا نصیب نہیں بدل سکتی۔ یہاں تک کہ سانس ختم ہو جاتی ہے۔ مجاہد خدا سونے کا احساس انہیں اپنے انا کے خول سے باہر نکلنے نہیں دیتا حالانکہ آپ بھی میری اس بات سے متفق ہوں گے کہ مجاہد خدا بھی خدا نے ایک اعلیٰ مقام بنایا ہے۔ جس کے ساتھ ذمہ داریاں اور فرائض جڑے ہیں ان فرائض اور ذمہ داریاں نبھانے کے بعد ہی مرد اس مقام پر پہنچتا ہے کہ بیوی کے سجدے کے قابل ہو سکے۔ دو بچوں کی پرورش کرنے والا جنت میں حضرت محمد ﷺ کے برابر کھڑا ہوگا۔ پرورش و تربیت نامی ذمہ داریاں بذات خود مقام ہیں۔ اس بارے میں اور میری کہانی کے بارے میں اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

☆: پیاری مدد بچا جانے والوں سے کیسا گلہ تم تو ان کی مغفرت کی دعا کیا کرو اب تمہیں کوئی بھی دشواری ہو پر چاٹنے میں تو ہمارے نمائندہ خصوصی فیصلہ آباد ارشد چوہان صاحب کو فون کر کے آگاہ کر دینا اور لڑکی خدا را پچس سے خط مت لکھا کرو مجھ تک پہنچتے پہنچتے لکھاری بالکل مٹ چکی ہوتی ہے تمہاری تحریر مل گئی ہے پڑھ کر آگاہ کر دوں گی

☆: فرزاد نگہت لاہور سے لکھتی ہیں۔ بے حد پیاری منزہ باجی السلام علیکم! امید ہے اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل سے بخیریت ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بے پناہ رحمتوں اور برکتوں کا نزول فرمائے۔ اعلیٰ کامیابیوں اور مراہب سے نوازے آئیں۔ بہت عرصہ بعد حاضر خدمت ہو رہی ہوں۔ کچھ حالات ہی ایسے رہے کہ نہ قلمی تعاون کا موقع ملا نہ سچی کہانیاں سمیت دیگر رسالوں کے مطالعہ کا۔ اب انشاء اللہ یہ کوتاہی نہیں ہوگی۔ کوشش رہے گی کہ سچی کہانیاں کے لیے لکھتی بھی رہوں اسے پڑھتی بھی۔ یہ کہانی "میم" جی حاضر خدمت ہے۔ ہمارے خاندان میں بھی ایک ایسی ہی "میم" جی موجود تھیں مگر ان کی کہانی مختلف ہے۔ یہ کہانی ساتھ پیش آنے والا واقعہ ہے۔ جو صفحہ قرطاس پر بصورت کہانی اُتار دیا گیا ہے۔ امید ہے آپ کو دلچسپ بھی لگے گی اور قابل اشاعت بھی۔ اور..... میں اب مستقل طور پر لاہور آ گئی ہوں۔ آپ کے تعاون تو توجہ محبت اپنائیت خلوص کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں دیگر اراکین ادارہ کی خدمت میں سلام آداب۔

☆: فرزاد! میں کب سے آپ کی منتظر تھی اب آگئیں ہیں تو بس ہم سے جڑی رہیے گا۔ انشاء اللہ جلد آپ کی تحریر سچی کہانیاں کا حصہ ہوگی۔

☆: عظمیٰ صدیقی لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! امید ہے منزہ سہا مصاحبہ ادارہ اور تمام احوال باخیریت ہوں گے وہ ماہ سے شمارہ بہت لیٹ مل رہا ہے آج اگست کی پانچ تاریخ ہے۔ مل نہ پایا ہمیں شمارہ آج بھی اس

لیے دل زرد دکھی ہے کسی بھی کہانی خط اور دوسرے سلسلوں پر تبصرے سے محروم ہوں لیکن اس کے باوجود دل بے حد خوش ہے کہ سچی کہانیاں کے ریڈرز میں اضافہ ہمارے لیے خوش آئند بات ہے رسالے کے لیے ڈھیروں دعا اور آپ کی صحت و سلامتی کے لیے بھی کہ آپ نے سچی کہانیاں کو داپس لاکھڑا کیا اس ماہ تین بار میں بک اسٹانڈ پر سچی خبیثوں بار سبکی جواب ملا باقی آپ لیٹ آئیں وہ رسالہ تو بک گیا میں آپ کو ایک دن بعد لا دوں گا جو مجھ سمیت آپ کے لیے باعث خوشی ہے۔ آخر میں تبصرہ نہ کرنے پر معذرت۔

☆: اچھی سی عظمتی! تمہیں پرچہ اتنا تاخیر سے کیوں مل رہا ہے ہا کر یا اسٹال والے سے معلوم کرو۔

بس تم لوگوں کا ساتھ چاہیے۔

☆: امان حیدر آباد سے لکھتے ہیں۔ منزه آپ! السلام علیکم! امید ہے آپ اور تمام قارئین سچی کہانیاں ٹھیک ہوں گے ماہ اگست 2018 کا شمارہ پانچ تاریخ کو مل گیا تھا لیکن کچھ مصروفیات کی وجہ سے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں ابھی تک صرف آپ کا ادارہ احوال اور تعارف ہی پڑھا ہے اور یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو دو کہانیاں آپ کو ارسال کی تھیں وہ دونوں کہانیاں فرضی ہیں امید ہے پھر بھی شائع ضرور کریں گی اور آپ نے ٹھیک کہا کمپوز صاحب بھی تو انسان ہیں نا اور غلطیاں تو انسان سے ہی ہوتیں ہیں جیسا کہ میرے خط میں آپ کو غلطیاں ملیں گی جو کمپوز صاحب ٹھیک کر دیتے ہیں یا پھر آپ ٹھیک کرتی ہیں۔ شیرازی صاحب میرا خط پسند کرنے کا شکریہ دیئے آپ خط بہت اچھے اور طویل لکھتے ہیں آپ کے خطوط مجھے بہت اچھے لگتے اور فیصل مشتاق صاحب میرا خط پسند کرنے کا شکریہ آپ کا خط اچھا لگا۔ اب اجازت چاہوں گا۔ اگلے ماہ تاہم شمارے پر تبصرے کے ساتھ احوال میں حاضر ہوں گا۔

☆: امان یو تیز یادتی ہے مجھے تبصرے کے ساتھ آیا کرو۔ تمہاری کہانیاں نمبر آنے پر ضرور شائع ہوں گی۔

☆: ایم حسن نظامی کو بولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہنا منزه سہام صاحبہ امید ہے آپ اور ہمارے من پسند پرچے سے جڑے سبھی احباب بخیریت ہوں گے اگست کا پرچہ اپنی تمام تر عنایتوں سے ہاتھوں میں ہے۔ بہت ہی دلکش، جاذب نظر اور معیاری پایا، آپ اور سبھی احباب بھرپور محنت، تعاون اور لگن سے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا رہے ہیں اور اس کا معیار کاش کی دستوں کو چھو رہا ہے۔ سچی کہانیاں کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنے قارئین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں اولین ترجیحات پر ویکم کرتا ہے اور نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو اشاعت کے قابل بنا کر انہیں مزید لکھنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اور یقیناً یہ بہت ہی محنت طلب کام ہے جو ایڈیٹر صاحبہ اور سینئر رائٹرز یہ کام سر انجام دے رہے ہیں۔ منزه سہام صاحبہ تحریروں کی سلیکشن اپنے علمی تجربہ اور قابلیت کی بنیاد پر بہتر سے بہترین کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے جس سے پرچہ دن بدن نکھار کی طرف گامزن ہے۔ اب کی بار انہوں نے اپنے ادارے میں بہت ہی اصلاحی اور منفرد پیغام دیا جو متاثر کن ہے۔ احوال کی پھولاری رنگا رنگ خوبصورت پھولوں اور کیوں سے مہک رہی تھی۔ افضل شاہین، رفعت، رفیع، طاہر عباس شجاع، اور شیخ خالد عروش کو پرچے میں آمد پر سچی آیاں نوں اور اب سدا آتے رہنا سچی، پرنس صاحب، حمیرا وحید، حمین جو نیو، عالیہ نور، ممتاز احمد، ملازم حسین شیرازی، سمیں غزالہ نہاں، عبدالغفار عابد فیصل مشتاق، مہر پرویز احمد، دولو اور نفیسہ فضل نے بہترین خطوط لکھ کر تبصرہ نگاری کا حق ادا کر دیا۔ سمیں غزالہ اور انیلا طالب کو اللہ تعالیٰ صحت کا مدد عطا فرمائے فیصل مشتاق صاحب میرے آرٹیکل پسند کرنے کا شکریہ میری تعلیم ایم اے ایل ہے۔ حمیرا وحید کے ایک شمارے میں دو خطوط شائع ہونے پر خوشی ہوئی فیصل ندیم بھی صاحب آپ کو سال بھر کے لیے رسالہ بطور اعزاز جاری ہوا یقیناً آپ اس کے اہل اور خوش قسمت ہیں۔ غزالہ عزیز نے حضرت ثوبان کے متعلق لکھ کر روح خوش کر دی۔ ام منال کی عشق حقیقی پر بھی یقین ہو گیا کہ واقعی تاجدار ختم نبوت ﷺ کے غلاموں کا کفن میلان نہیں ہوتا۔ مور شاہد حسین کا تعارف اور کہانی دونوں لا جواب آپ کی دین اسلام، کرکٹ، سچی کہانیاں اور پاک آری سے محبت کو میرا سلام، ممتاز احمد کی دوسرے کے بیوی، منفرد اور غیر تھاک کہانی ہے۔ ارشاد رہا ہے

منال نے عمدہ تحریر رقم کی۔ عثمان غنی نے چوہدریوں اور وڈیروں کے ظلم و ستم پر معیاری لکھا۔ سلیسیہ بانو نے فرمانبرداری پر خوبصورت طبع آزمائی کی اور تحریر سے عمدہ اسباق ملے۔ تعارف عمدہ اور معطر سلسلہ ہے۔ مور شاہد حسین کے بارے میں آگاہی ہوئی بہت اچھا لگا ایک عزیز کے بارے میں جان کر ان کی تحریر بھی پسند آئی مومنہ بتول کے لفظوں میں بھی درد کی آمیزش محسوس کی۔ ممتاز احمد نے گھٹیا سوچ رکھنے والوں کے منہ پر زور دار طعناں خیر رسید کیا۔ اور تحریر معیاری پائی۔ جاوید راہی بھی منفرد پیغام لے کر آئے۔ سادہ لوٹ گئے میری حقیقت پر سچی تحریر کو سچی کہانیاں کے صفحہ فرطاس پر نکھیرنے اور ساتھیوں کا اسے پسند فرمانے پر ڈھیروں شکریہ منزه سہام صاحبہ نے اپنی تحریر میں لا جواب الفاظ کی آبیاری کی اور تحریر عمدہ پائی۔ پیر شاہ احمد قاری بھی لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے عامل کامل کی دوسری کڑی پسند آئی۔ وہ سبکی اور بدی کی جنگ پر اچھا لکھ رہے ہیں۔ رینا کرمنٹ ایماننداری سے اپنا فریضہ سر انجام دینے والوں کے لیے ایک سبق آموز تحریر ہے۔ حسانت روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے انہوں نے پردہ اٹھایا۔ آئینی مسکن، ڈا عشق بھی معیاری پائیں۔ قمر علی عباسی کا سفر نامہ بہت ہی اہمیت کا حامل ٹھہرا۔ شازی سعید فضل کا ناول بہتر جا رہا ہے۔ اسے ہر ماہ جگہ ملنا چاہیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی ڈائری اور شعرو سخن عمدہ اور معیاری سلسلے ہیں جو ہر قاری پسند کرتا ہے۔ میری طرف سے اس قدر منفرد معیاری اور عمدہ مواد کی سلیکشن پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ لکھاری ساتھیوں کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی پر انعام دینے کا ڈھیروں شکریہ خوش رہیے اور ایک دوسرے میں خوشیاں بانٹنے رہیے۔

☆: حسن بھائی ادارہ یہ پسند کرنے کا شکریہ میری کوشش ہے کہ سچی کہانیاں میں ان لوگوں کو شائع کریں جو سچی کہانیاں کا مزاج سمجھتے ہیں آپ سے تو فون پر بھی بات ہوئی تھی آپ کو میں نے ایک اہم مسئلے سے آگاہ بھی کر دیا تھا مگر میں مطمئن ہوں سچی کہانیاں کے دوست بہت ہیں لہذا دشمنوں کی مجھے فکر نہیں۔

☆: ڈاکٹر عامر شہزاد تنکانہ صاحب سے لکھتے ہیں۔ محترمہ ایڈیٹر صاحبہ اسٹاف ادارہ، شعراء، رائٹرز اور قارئین السلام علیکم! اگست کا شمارہ چار تاریخ کو بطور اعزاز ارسال کرنے اور میری کہانی شائع کرنے پر ادارے کا شکریہ مکمل مطالعہ کے بعد اب رسالہ زیر تبصرہ ہے سرورق خوبصورت منفرد اور جاندار لگا لیکن میرے خیال میں اسے سنگل ہونا چاہیے اس کی موجودہ حالت اسے جلد کمرور کرنے کا باعث بن رہی ہے۔ وزرلسٹ میں نام آنے پر میری طرف سے افتخار چوہدری، مہر پرویز دولو اور حمیدہ انجم کو مبارک ہو۔ اشتہارات میں موجود شہرت جام شیریں گل بہار اور چھلکا اسپنول واقعی مفید ہیں۔ سہام مرزا صاحب کی تصویر اچھی لگی۔ جوتیوں میں دال کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اصل دہشت گرد کون ہیں؟ احوال میں افضل شاہین، امان صاحب، ایم حسن نظامی، رفعت، رفیع، عالیہ نور، حمیرا وحید، حمین جو نیو، الماس فاطمہ، ارشدہ خان، ملازم حسین شیرازی، سمیں غزالہ نہاں، عبدالغفار، فیصل مشتاق، مہر پرویز احمد، دولو اور نفیسہ فضل نے بہترین خطوط لکھ کر تبصرہ نگاری کا حق ادا کر دیا۔ سمیں غزالہ اور انیلا طالب کو اللہ تعالیٰ صحت کا مدد عطا فرمائے فیصل مشتاق صاحب میرے آرٹیکل پسند کرنے کا شکریہ میری تعلیم ایم اے ایل ہے۔ حمیرا وحید کے ایک شمارے میں دو خطوط شائع ہونے پر خوشی ہوئی فیصل ندیم بھی صاحب آپ کو سال بھر کے لیے رسالہ بطور اعزاز جاری ہوا یقیناً آپ اس کے اہل اور خوش قسمت ہیں۔ غزالہ عزیز نے حضرت ثوبان کے متعلق لکھ کر روح خوش کر دی۔ ام منال کی عشق حقیقی پر بھی یقین ہو گیا کہ واقعی تاجدار ختم نبوت ﷺ کے غلاموں کا کفن میلان نہیں ہوتا۔ مور شاہد حسین کا تعارف اور کہانی دونوں لا جواب آپ کی دین اسلام، کرکٹ، سچی کہانیاں اور پاک آری سے محبت کو میرا سلام، ممتاز احمد کی دوسرے کے بیوی، منفرد اور غیر تھاک کہانی ہے۔ ارشاد رہا ہے

اس ماہ کے ونرز

- 1 بہترین کہانی تقدیر گزیدہ مومینہ بتول
- 2 بہترین کہانی صفت فرعون محمد قاسم بلوچ
- 3 بہترین کہانی آسیبی مسکن ڈاکٹر عامر شہزاد

ونرز کو انعامی رقوم ان کے موبائل نمبرز پر ارسال کی جا رہی ہیں۔

پہلا انعام =/1500

دوسرا انعام =/1000

تیسرا انعام =/700

بہترین خط فیصل مشتاق سرگودھا

بہترین غزل نفیسہ فضل محمود کراچی

نائب مردوں کے لیے نیک عورتیں اور بد مردوں کے لیے بد عورتیں دیے میں نے دوسروں کی بیویوں پر عطا کی نگاہ رکھنے والے بہت سوں کے گھر چڑتے اور بعض کو سر بازار جوتیاں پڑتے بھی دیکھا اللہ ہدایت عطا فرمائے۔ عابدہ مغل کی کہانی وڈا عشق کے ابتدائی اشعار نے بھولی بسری ایک کہانی یاد دلا دی۔ ان کے علاوہ سکینی نسیم کی فرمانبردار اولاد و مومنہ بتول کی تقدیر گزیدہ، جاوید راہی کی شرمندگی، شگفتہ شفیق کی اس ماہ کا شاعر نسیم زہرا کی برانجام، محترمہ منزہ سہام صاحبہ کی اللہ پوچھے گا اور شعیبہ مظہر کی کولڈ فیئر بہترین کہانیاں ثابت ہوئیں۔ سلسلہ وار کہانیاں بھی اچھی چل رہی ہیں مسئلہ یہ ہے اور انعامی سلسلہ عوام میں بھرپور اہمیت حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کی ڈائری میں شانلہ نوید نورین جبران، افضل شاہین، امینہ بی بی رضیہ، فرزانہ رشید، کنول نسیم، نوشین علوی، عبدالوہاب، کول فرحان، رضوانہ لطیف، انیلہ سلطان، کاشفہ، کرن اور رضوانہ تاج نے اچھی اور دل کو چھو لینے والی تحاریر لکھ کر دل خوش کر دیا۔ شعرو سخن میں ایم حسن نظامی، ذیاعلی، نفیسہ فضل، رفعت خان، فاطمہ حسن، فرح، نسیم مراد اور زاہدہ سرور نے بہترین اور منفرد شاعری تخلیق کی۔ میری محمد عقیف شاکر، ماسٹر خالد عباس، دعا علی بخاری اور محترمہ نینا خان سے گزارش ہے کہ آپ بھی کچی کہانیاں کے لیے لکھا کریں کیونکہ ہم سب نے مل کر اس کو ترقی کے عروج پر لے کر جانا ہے انشاء اللہ آخر میں دعائے خیر ہے کہ کچی کہانیاں کا اقبال ہمیشہ بلند رہے آمین۔

بھائی عامر! کچی کہانیاں آپ کو اچھا لگ رہا ہے مجھے یہ جان کر بہت اچھا لگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ پابندی سے احوال کا حصہ بننے رہیں گے۔

فیصل مشتاق قبولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ امید ہے کچی کہانیاں سے جڑے تمام ساتھی اور آپ منزہ بخیریت ہوں گے۔ پچھلی بار شمارے نے بہت انتظار کروایا مگر اس مرتبہ بہت جلد مل گیا۔ احوال میں بھی دوست حاضر تھے۔ آپ منزہ کا احوال کو پیغام پسند آیا۔ پرنس افضل شاہین بھائی بہت دنوں بعد نظر آئے ان کا خط اچھا لگا اور میں آپ کی بات سے مطمئن ہوں کہیں تھوڑی سی کمی ہے اور وہ ڈاکٹر طارق محمود آکاش کی ہے۔ سر حسن نظامی، مقصود احمد بلوچ، قاسم خان بلوچ، محسن طالب، پرنس افضل شاہین، ان سب کی محفل ایک خاص رنگ جماتی تھی۔ مجھے امید ہے ڈاکٹر طارق اپنی مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر ضرور آئیں گے۔ میں بلاشبہ ان کے خط اور کہانیاں مس کر رہا ہوں۔ خطوط میں ایم حسن نظامی، محسن طالب، اروشہ خان، ملازم حسین شہرازی، حمیرا وحید، عبدالغفار عابد، نفیسہ فضل، مہر پرویز، ممتاز احمد اور دیگر ساتھیوں کے خط بلاشبہ اچھے لگے۔ فیصل ندیم بھٹی کو بہترین خط کی کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں نے پچھلے تبصرے میں بھی ذکر کیا تھا کہ ان کا خط مجھے بہت پسند آیا۔ جن دوستوں کو میرا خط پسند آیا ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ محسن علی طالب اچھا دوست ہے۔ حسن میں جلد تمہاری کہانی پڑھنے کا خواہشمند ہوں۔ منزہ آپ کی کو میرا خط پڑھ کر کہی آئی اور مجھے خود اپنا خط پڑھ کر بہت ہنسی آئی جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے ساری دل کی باتیں لکھ دیں۔ آپ میں آپ کے مشورے پر ضرور عمل کروں گا میں جلد ہی آپ کو ایک مزاحیہ کہانی ارسال کر رہا ہوں امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ مور شاہد حسین بھائی بہت ہی اچھے ہیں عزیزان کا انٹرویو پڑھ کر اندازہ ہوا۔ وہ واقعی ایک بہترین شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا انٹرویو پڑھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ انہیں ڈھیروں کامیابیاں اور خوشیاں عطا کرے آمین۔ کہانی بھی بہت عمدہ لگی اب میں کہانیوں کی بات کروں تو اس مرتبہ دو کہانیوں کی تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ وڈا عشق تو میرے سر سے گزرنی۔ بڑے محسن سے پڑھ رہا تھا مگر اختتام پر جب دیکھا لڑکی خواجہ سرا تھی۔ مجھے بہت حیرانگی ہوئی اور کچھ سمجھ نہیں آئی۔ خیر عابدہ

ماہ آپ کے ادارے کا..... اور ہمیشہ کی طرح آپ نے نہایت حساس اور نازک موضوع پر طبع آزمائی کی ہے اور اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ لکھنے والوں کا طبقہ تو ہوتا ہی ہے حد حساس اور درد مند دل کا مالک، عشق حقیقی میں مصنفہ نے ایک نہایت ہی عظیم بزرگ کے حالات زندگی کا احاطہ کیا، جس سے ایمان تازہ ہو گیا۔ ایسی تحریریں تو معاشرے کے لیے مشکل راہ ہوتی ہیں۔ مکافات عمل ایک طویل عبرت ناک کہانی ہے واقعی گناہ گار اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ اللہ کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں کھلے گا طوق بہترین سزا پر اندھیر تحریر ہے۔ اللہ پوچھے گا دلچسپ تحریر ہے اور یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ منزہ کی تحریر ہے دراصل میں نام پڑھے بنا ہی تحریر پڑھنا شروع کر دیتی ہوں تجسس ہو کر نام دیکھا تو حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی ویل ڈن منزہ باقی تحریریں بھی یقیناً اچھی ہوں گی فی الحال یہی پڑھ کی ہوں شکریہ وسلام۔

☆ بہت اچھی نسرین! تمہارا خط پاکر بہت اچھا لگا اسی طرح احوال میں شرکت کیا کرو میری تحریر پسند کرنے کا شکریہ۔

☆ ملازم حسین شیرازی نکھر سے لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم! امید ہے بخیریت ہوں گی۔ 18 اگست کا احوال نامہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ سب سے پہلے احوال نامے میں شرکت کرنے والوں سے استدعا ہے کہ ہر کہانی، خط پر یک سطر کیوں نہ ہو اپنے تجسس ضرور دیں۔ اس سے لکھاری حضرات کی نہ صرف حوصلہ افزائی ہوتی ہے بلکہ تبصرہ نگار کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے کہ وہ کس لگن اور دلچسپی میں محو مطالعہ ہے خط و تبصرے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ اگست 2018 کے شمارہ کا ٹائٹل خوبصورت ماڈل کی سوچ میں خوبیت کا مظہر ہے ادارہ آپ نے صحیح فرمایا کہ جنہوں نے ملک کے غریب اور مظلوم عوام کے اربوں روپے بیرون ملک جائیدادوں میں توسیع اور خرید و فروخت میں لگائے۔ اپنی اولادوں کو ارب پتی بنایا۔ انہی پر عدالتوں میں پوتی کے موقع پر منوں کے حساب سے گل پاشی ہوتی ہے۔ زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے ہیں اگر جیل میں ایک رات چار پائی کے بغیر نیچے سوئے تو ایسا دوا بیلچہ گیا جیسے سولی پر لٹک رہے ہوں۔ دوسری طرف سالوں سے پھانسی کی کوٹھیوں میں تجوس اور عمر قید گزارنے والے رجحان نظروں سے انصاف کے متلاشی ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ غلام بنے سردار ام ایمان حضرت ثوبان کی نبی پاک ﷺ سے محبت کی سرشاری مودت اور عقیدت کا ایثار ہی تھا کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے آپ نے آزادی حاصل کی تو اپنے عزیزوں یا خاندانوں میں واپس جانے کو قبول نہ کیا۔ غلامی رسول ﷺ میں زندگی بسر کی، عشق حقیقی ام مثال روح پرور واقعات سے مزین خوبصورت قصہ اچھی تحریر مکافات عمل عثمان غنیؓ مکافات عمل ایک گناہ کی سزا عدل و انصاف حشر پر موقوف نہیں زندگی خود بخود گناہوں کی سزا دیتی ہے فرمانبردار اولاد و شاہکی نسیم ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری کرنے والی اولاد بھی ناکامی نہیں دیکھتے ہمیشہ سرخوردہ رہتے ہیں۔ اچھی تحریر تعارف مور شاہد حسین تعارف حاصل کر کے بہت خوشی ہوئی جن سے خلوص و جاہت کے رشتے ہوں ان کے حالات سے آگاہی ضروری ہے کھلے کا طوق پر اثر کہانی بہت عمدہ تحریر نقد پر غروریدہ مومنہ بتول بڑا رے کے نتیجے میں ہونے والے حالات و واقعات کے زخموں کی کک آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ عم و ریح دیتی تحریر لیکن آخر میں تسکین کا باعث بنی بہت خوب دوسرے کی بیوی ممتاز احمد موجودہ دور کی زہر آلود سچائی، سبق آموز کہانی، اللہ پوچھے گا منزہ سہام دائی خوشی اور نیک مقصد کے حصول کے لیے جن کی عاشقی کا دوا بیلچہ کیا گیا۔ نتیجتاً شہینہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی جہاں چاہتی تھی وہیں شادی ہوئی، مزاح اور سٹپنس سے بھرپور خوبصورت دل گداز کہانی، عمدہ تحریر زندگی شرمندگی جاوید راہی بعض

اوقات انجانے میں ایسے واقعات حالات رونما ہو جاتے ہیں کہ بد نصیبی ڈورے ڈال دیتی ہے قسمت کی دیوی رومی رہتی ہے عبرت دیتی کہانی آج کا شاعر شگفتہ شفیق عمر تنہا کے بارے میں شگفتہ جی کی پرمغز بہترین تحریر شعروادب میں اپنے ہم عصروں سے الگ کامیاب اور مقام قبولیت کے چمکے گاڑنے والے عمر تنہا شعری دنیا کے شور شرابے میں تنہا سفر کرنے والے ساون لوٹ گئے حسن نظامی دل پر اثر کرتی بہترین اور اچھوتی تحریر عامل کامل طاغوتی قوتوں اور شیطانی طاقتوں کے خلاف ایک دہندار اور ایماندار بندہ نیک نے لکھ کر ان کی کالی دنیا کو اپنے ایمان کی روشنی سے منور کرنے کی جرتیں کیں بہت خوب تاریخ کے مہر ناموں سے تہینہ جلیل اسلامی معلومات فراہم کرتی بہترین تحریر ان معلومات اور علمی میدان میں مسلمانوں کے عالم کارناموں سے ساری دنیا کے مذاہب استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ بہت عمدہ حماقت غلام مرتضیٰ کسی بھی کمزوری یا خباہی پر احساس کمتری میں مبتلا رہنا اپنے آپ کو ناقابل تلافی نقصان میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ آئینی مسکن ڈاکٹر عامر شہزاد جنات کے وجود سے انکار احکام خداوندی سے منحرف ہونا ہے غیر مری طاقتوں کا وجود اظہار من گھڑت ہے۔ وڈاشق عابدہ مغل، بلاشبہ ایک خوبصورت کہانی، باقی کہانیاں سلسلے ترکی میں عباسی، املتاس آپ کی ڈائری مسئلہ یہ ہے بہترین ہیں۔ احوال نامے میں پرس افضل شاہن کرسی صدارت پر فائز مبارکباد انیم حسن نظامی حسب سابق آپ کا خطنت غنی دلچسپیوں اور مہکی خوشبوئیں سینے منھاس سے لبریز ہے بہت خوب عالیہ نورجی کہانیاں کا ہر قاری لکھاری مالا میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح ہے۔ درد دل رکھتے ہیں سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اپنے آپ کو تنہا نہ سمجھیں رب بھلی کرے گا۔ رفعت رفیع آپ نے خط میں لکھا کہ مطالعہ کی بہت شوقین ہیں۔ حوصلہ افزائی کی منتی ہیں بہت اچھی بات ہے حاصل مطالعہ سے لکھنے پڑھنے میں آسانیاں ہوں گی۔ خط آپ نے عمدہ تحریر کیا۔ حمیرا وحید آپ نے خوبصورت خط لکھا ماشاء اللہ امید ہے جی کہانیاں میں شرکت پابندی سے کریں گی۔ حسین جونجو ہمیشہ کی طرح آپ کی تحریر لاجواب اور نہایت عمدہ باتوں کی حامل اگر مجھے اپنے آپ سے محبت ہے تو میں لازمی طور پر دوسروں کی عزت اور محبت کروں گا۔ ممتاز احمد آپ کا خوب صورت خط لکھا تو نہیں البتہ آپ کی مصروفیت نے آپ کے ہاتھ کو مزید لکھنے سے روک دیا۔ رانا نیوز بھکر بک اسٹال کی جی کہانیاں سے متعلق لاہر وہی غفلت اور عدم توجہی بارے آپ سے فون پر بات کروں گا۔ اردو شہ خان آپ کے احوال نامے میں شرکت سے دل سرور ہوا خط بہت اچھا لکھا حسن علی طالب آپ کے نام کے تینوں حروف اعلیٰ و ارفع ہیں خط بھی شاندار ہے۔ تبیس غزالہ نہاں آپ کا خط بہت دلچسپ ہوتا ہے آپ کی صحت اور گھریلو دائی خوشیوں کے لیے ہر وقت دعا رہتی ہے خوش رہیں۔ عبدالغفار عابد آپ کے خطوط و کہانیاں میں جہاں اچھی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں وہاں کبھی کبھی جی کہانیاں سے وابستہ قارئین لکھاریوں سے گلے شکوے کرنے میں اپنی صلاحیتوں کو زیر بار کرتے ہیں۔ اس بارے میں تھوڑا خیال رکھیے گا۔ گستاخی معاف مہر پرویز دولو آپ کے احوال نامے کو بڑی توجہی اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے خوب صورت و دیدہ زیب موتیوں بھری لڑی لگا ہوں میں چمک پیدا کرتی ہے۔ ماشاء اللہ باقی خطوط نہایت دلچسپ ہیں افسوس کہ ان پر تبصرہ نہ کر سکا۔ محترمہ منزہ سہام جی کہانیاں میں شائع شدہ کہانیاں جہاں نہایت دلچسپ اور متاثر کن ہوتی ہیں وہاں خطوط بھی نہایت محبت و عقیدت کے پھولوں سے پروئے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک شمارہ قارئین کی محبت نظروں کے سامنے رہتا ہے ہم رنج الم سے دوری کا سبب بنتا ہے۔ آپ کی زیر ادارت قارئین لکھاریوں کو جو عزت احترام اپنا بیعت نصیب ہوتی ہے آج کی اس مطلب پرست اور خود غرض دنیا میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

اس سال 71 واں یوم آزادی منایا جا رہا ہے ہر طرف جشن کا سماں ہے خدا کرے میں کروڑ عوام بےز ہلائی پرچم کے سائے تلے دائمی خوشیاں پائیں خط ہڈا کے ساتھ کہانی؟ کیسا ملاپ! ار سال ہے۔ چند دن پہلے کہانی کی مرکزی کردار سے ملاقات ہوئی اس کی حالت دیکھتے اور واقعات سننے کے بعد کئی دن آداسی اور عالم پریشانی میں رہا اگر قابل اشاعت ہو تو مہربانی فرما کر نزدیکی اشاعت میں جگہ دیں۔ جب کراچی آنا ہو سب سے پہلے آپ سے اور ادارے کے دیگر احباب سے شرف ملاقات حاصل کروں گا۔ اجازت چاہتا ہوں اللہ پاک آپ کو اہل و عیال کے ساتھ ہمیشہ سکھی رکھے آمین۔

☆ شیرازی بھائی! اتنے مفصل خط کے بعد اب میں کیا کہوں ہمیشہ کی طرح خوب لکھا، کہانی جلد آپ کی تصویر کے ساتھ شائع کروں گی اور ضرور تشریف لائیے یہ آفس آپ کا ہی ہے۔

☆ مور شاہد فخر شہداد کوٹ سے لکھتے ہیں۔ ڈیر آپ کی منزہ سہام دعائیں آداب اگست کا شمارہ دلکش سرورق کے ساتھ موصول ہوا۔ آپ کا ادارہ جو تئیں میں دال زبردست ورق پلٹتے ہی اپنیوں کی محبتوں کی محفل احوال میں قدم رکھا۔ فرس افضل صاحب صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ بھلی کرے آیا خوش آمدید! عالی نور اللہ آپ کی مشکلیں آسان فرمائے۔ ایلا طالب کی صحت یابی کے لیے دعائیں! ام حسن نظامی ممتاز احمد ملازم حسین شیرازی، تبسم غزالہ (مبارکباد اللہ پاک آپ کے پوتے کو صحت اور دارم عطا فرمائے آمین بھی مٹھائی کہاں ہے) عبدالغفار عابد فیصل مشتاق بھائی (موسٹ ویکم مبارکباد آپ کی مخلص محبت کا بے حد شکریہ) مہر یوز دو بلو پور تبصرے کے ساتھ احوال میں حاضر تھے۔ ادنیٰ حسین جو بیجو سلامت رہیں مٹی عزیز مئے آپ کی مٹی محسوس ہوئی۔ غلام جوئے سردار بہترین سلسلہ ہے جاری رہنا چاہیے۔ ام مسائل عشق حقیقی ہے شک محمد علی کے غلاموں کا کفن میلا نہیں ہوتا۔ عثمان غنی مکافات عمل بہت خوب زبردست سلسلے کی نیم فرمانبردار اولاد اچھی تھی۔ میرا تعارف اور کہانی آپ ہی بنا سکتے ہیں منتظر ہوں۔ مومنہ بتول تقدیر گزیدہ عمدہ تحریر پڑھنے کو دی۔ ممتاز احمد دوسرے کی بیوی سبق آموز لا جواب جا دیدہائی زندگی شرمندگی ایم حسن نظامی ساون لوٹ گئے شاندار تحریروں لائے۔ اس ماہ کا شاعر شگفتہ شفیق صاحب عمر تنہا کا زندگی نامہ سناری تھیں۔ محمد قاسم خان مفت فرعون زبردست تبسم زہرا انجام سبق آموز عمدہ تحریر لائی۔ آپ کی منزہ سہام اللہ پوچھتے گا۔ مزاح سے بھر پور تحریر پڑھنے کو دی پیر محمد شاہ عامل کامل دلچسپ حامد تابی ریٹائرمنٹ تہنید جلیل تاریخ کے جبر کوں سے غلام مرتضیٰ حماقت اچھی تھی شہید مظہر کو لڈ فیر اعلیٰ قسط کا انتظار ڈاکٹر عامر شہزاد آسیبی مسکن عابدہ مغل و عاشق پسند آئی۔ قرطی عباسی معلومات کا خزانہ شانازی سعید مغل المتاس عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے مسئلہ ہے آپ کی ڈائری شعر و سخن رسالے کی جان سمجھو۔ اب اجازت۔

☆ بھائی شاہد! سچی کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ آپ نے درست کہا آپ کا تعارف پڑھنے والوں کو کیسا لگا وہ بھی بتائیں گے۔ آپ کی شاعری شعر و سخن کے صفات پر شائع کر رہی ہوں۔ آپ سے فون پر بات ہوئی تھی فالتو لوگوں کے مہیج کی پرواہ مت کریں ہمارے پاس کرنے کو بہت کام ہیں اور یہ بیچارے صرف سازشیں کر رہے ہیں میں تو کہتی ہوں کہ بھی بہت قابل ہو تو دوسرے میاری ڈاکٹروں میں بھی چھو۔ سارا زور سچی کہانیاں پر ہی رکھیں؟

☆ ام مسائل ایسٹ آباد سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ باجی! السلام علیکم! میری طرف سے تمام اشاف کو دلی جذبوں کے ساتھ عید الفصحی مبارک ہو جن کو انعامات ملے انہیں میری طرف سے بہت بہت مبارکباد ایلا طالب کے ساتھ ساتھ باقی وہ سب جو ہست علالت پر ہیں ان کی صحت یابی کے لیے دل کی گہرائیوں سے

دعائے طالب ہوں جو دنیا سے چلے گئے اُن کے حق میں دعائے مغفرت کرتی ہوں اور جو رشتہ ازدواج میں بندھے ہیں اُن کے لیے بہترین زندگی کی دعا کرتی ہوں اور جو اب تک کنوارے ہیں ان کے حق میں بہترین جیون ساسھی کی دعا کرتی ہوں اللہ سے امید ہے کہ وہ میری تمام دعائیں قبول فرمائے آٹھ اگست کی خوشوار صبح ساون لوٹ کر برس رہا تھا اور ایسٹ آباد کی سڑکوں پر گھنٹوں تک پائی تھا ایسے جھکے موسم میں بیگا بیگا سا سچی کہانیاں آیا تو موسم کا لطف دو بالا ہو گیا جلدی جلدی اپنی کہانی پڑھی تو مزید خوشی دہنی ہو گئی کیونکہ اس دن آگست صبح منے ہی دروازے پر کھلی ہوئی تھیں اور پوری امید تھی کہ آج ڈاکٹسٹ ضرور آئے گی اور امید پوری بھی ہوئی۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف کہانی انسانی معاشرے کا عکاس ہوتی ہیں اور حقیقت کی نمائندگی ہے پہلے واقعہ ہوتا ہے پھر وہ واقعہ کہانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس نتیجے میں جنم لینے والی وہ کہانی کسی انسان کی اصل زندگی سے مشابہت اختیار کر لیتی ہے۔ زیر نظر شمارے میں بھی کہانیاں کسی انسان کی حقیقی زندگی سے جڑے واقعات کی عکاسی کر رہی ہیں اور وہی معاشرے کے دکھتے ہوئے ناسور محبت پیار، عشق، نفرت بدلہ، غربت رشتہ قربانی اور مکافات عمل کے گرد گھومتی ہوئی کہانیاں ہیں سب سے پہلے مکافات عمل جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے دنیا مکافات عمل کا دوسرا نام ہے۔

ویسے تو علامہ اقبال کی پوری شاعری ہی سبق آموز ہے مگر مجھے اُن کا یہ شعر بہت پسند ہے فرمانبردار اولاد احکامات الہی پر کبھی کسی ایک سبق آموز تحریر ہے دنیا میں جس رشتے کا درجہ سب سے بلند ہے جب انسان اُس کو تکلیف پہنچاتا ہے تو عرش بھی روتا ہے اور زمین بھی مل جاتی ہے اور پھر بدلہ دیتی ہوتا ہے جس کو دنیا مکافات عمل کا نام دیتی ہے شاہد حسین بھائی بچپن تو ہوتا ہی ایسا ہے جس کی یادیں انسان مرتے دم تک نہیں بھولتا وہ دور ایسا ہوتا ہے جب انسان ہر فکر اور ہر عمل سے آزاد ہوتا ہے گلے کا طوق کلام الہی میں بہت برکت ہے آج ہم جس مشینی دور سے میں سانس لے رہے ہیں اور بھاگی دنیا کے مسافر بنے ہوئے ہیں وہاں کلام الہی سے جیسی دور ہوتے جا رہے ہیں صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا کے ہر مسئلے کا حل کلام پاک میں موجود ہے ادھر ادھر بھگت رہے ہیں اگر ہم کلام الہی کی حقیقت سمجھ جائیں تو پھر اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی ہمارا بال پرکا نہیں کر سکتا تقدیر گزیدہ کسی دوسرے کی خواہش کی خاطر اپنی خوشیوں کو قربان کر دینا ہر ایک کی خاصیت نہیں ہوتی یہ اعلیٰ ظرفی تو اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو ہی حاصل ہوتی ہے اور سلطانان میں سے ایک تھیں دوسروں کا صبر آزما تو بہت آسان ہوتا ہے مگر خود صبر کرنا انسان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

قیام پاکستان کے لیے قربانیاں دینے والے بہت اعلیٰ ظرف اور بلند کردار لوگ تھے جنہوں نے اپنا سب کچھ پاکستان پر قربان کر دیا۔ دوسرے کی بیوی اُن مردوں کے لیے سبق آموز ہے جن کی نظریں دوسری عورتوں پر سے ہٹتی ہی نہیں ہیں ساون لوٹ گئے ایک دھڑ رشتوں اور چھوٹے بیٹے کی قربانیوں سے بندھی جاندار تحریر بھی یہاں بھی وہی چھوٹے بیٹے کی قربانیوں کی داستان جس نے مرتے دم تک خاندان کو ایک لڑی میں باندھ رکھے کے لیے ہر رشتہ نبھایا بقول شاعر

کسی کو گھر ملا کسی کے حصے میں دکان آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا میرے حصے میں ماں آئی

بر انجام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے برے کا انجام برائی ہوتا ہے انسان اگر وقت پر ہوش کے ناخن لے لے تو اسے مستقبل میں پچھتاوانہ پڑے۔

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چک گئیں کھیت

تاریخی کہانیوں پر کیا تبصرہ کروں یہ تو اپنی مثال آپ ہوتی ہیں یہ ہستیاں تو اپنی ذات میں خود ہی تعریف ہوتے ہیں ان ہستیوں کی شان میں تو الفاظ بھی چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ اس خط کے ساتھ آپ کو ایک کہانی بھیج رہی ہوں پڑھ کر بتائیے گا کیسی ہے اور قابل اشاعت ہے یا نہیں.....

☆: ام منال! تمہاری تحریر میں ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی شاندار تبصرہ بھیجے گا شکریہ۔
☆: مختصر حیات روڈہ محل سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! محترمہ پیاری آپ منزہ سہام آپ کیسی ہیں امید کرتا ہوں آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو سدا خوش رکھے سلامت رکھے اور کبھی عمر دے آپ ہمیشہ خوش رہیں اگست کا پرچہ اگست کو مل گیا۔ آئی یہ کیا اگست کا شمارہ بغیر ٹاکسل کے کیوں آ گیا۔ مزہ پیکا پڑ گیا۔ اس کے بعد جب شمارے کے اندر گیا تو ادھار کیا بات ہے شمارہ ہر لحاظ سے سپر ہٹ تھا۔ سب کہانیاں بہت بہت ہی زبردست اور اچھی تھیں عمدہ اور سبق بھی تھیں۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ لیکن مجھے جو سب سے زیادہ اچھی لگی ان میں عشق حقیقی فرمانبردار اولاد، گلے کا طوق، زندگی شرمندگی، سادون لوٹ گئے، برا انجام، اللہ پوچھے گا، تاریخ کے جھروکوں، آسبی مسکن اور وڈا عشق شامل ہیں۔ یہ کہانیاں مجھے بہت بہت ہی سپر ہٹ لگیں ان کہانیوں نے دل ہی جیت لیا۔ اس کے بعد شمارے میں چٹنی بھی شامل تھیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں لیکن نسیم مراد صادق آباد، زاہد سرور ایم حسن نظامی، شفیق احمد ندیم کی غزلوں نے بہت متاثر کیا ان کی غزلیں سب سے اچھی تھیں۔ آپ کی ڈائری، پورے شمارے نے مزہ ہی دو بالا کر دیا آپ کی شاعری کا سلسلہ تیرنیم کش ہوا کرتا تھا وہ کدھر گیا کہاں کم ہو گیا اس کو ڈھونڈنے کے لیے اس کو واپس لائیے۔ اب ٹیک کے لیے اتنا ہی زندگی رہی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے آمین۔

☆: مختصر! اب سچی کہانیاں میں صرف وہ شاعری اور کہانیاں شائع ہوتی ہیں جو لوگ ارسال کرتے ہیں تیرنیم کش کی ڈاک برائے نام ہے۔ ٹاکسل کے بغیر تو شمارہ چھپ ہی نہیں سکتا یہ تمہارے ہا کر کا مال ہے کہ بتا ٹاکسل والا رسالہ بھی نہیں بچ دیا۔

☆: اور یہ دوسرا خط ارشد اقبال چوہان جڑا نوالہ سے لکھتے ہیں۔ دعا گو ہوں کہ سچی کہانیاں سے منسلک سب لوگ بخیریت ہوں آمین سب سے پہلے ماہ جولائی کی سرگزشت کا خط لکھ کر ایک دوست کو دیا کیونکہ مجھے شہر سے باہر جانا تھا۔ مگر ایک پرانا لطیفہ کہ اگر ریلوے اسٹیشن جارہے ہو تو میرا یہ خط پوسٹ کر دینا ہفتہ بعد ملاقات پر خط پوسٹ کرنے کے حوالے سے جواب دیا کہ اگر اتنی جلدی ہے تو یہ لو خود حوالہ ڈاک کر دو..... کیونکہ ریلوے اسٹیشن سے کبھی ہر آدھا گھنٹہ بعد ڈاک روانہ کی جاتی تھی اور ٹرینوں کے ساتھ ڈاک کا ڈبہ بھی ہوتا تھا اب ریلوے ہی سمندر برد ہو گیا ہے ڈاک کا ڈبہ کہاں سے آئے گا؟ اب دیکھیں تبدیلی کیا رنگ لائی ہے۔ بہر حال اس مہر بان کا بھی شکریہ لیکن مجھے یقین ہے کہ خط آپ کو ملا ضرور ہوگا مگر دیر سے..... آپ اسے خدا را پڑھ لیں۔ شکریہ شمارہ جولائی تفصیلاً بعد میں پڑھا تھا اور خط ڈیل لائن سے پہلے ہی لکھ دیا تھا۔ جو کہ دوست کی غیر ذمہ داری کی نذر ہو گیا اور شمارہ اگست میں چلے نہ پاسکا جولائی کے حوالے سے میں ہاتھ باندھ کر کرن شیر صاحبہ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمارے سچی کہانیاں کی جان چھوڑ دیں اور چوری شدہ کہانیاں چھوڑنے سے باز آ جائیں کاشی چوہان صاحب کے دور میں ان کی ایک کہانی 'بوسہ سرگزشت' میں شائع ہو چکی تھی بعد ثبوت ایڈیٹر صاحب کو شکایت تحریر کی تھی۔ اور انہوں نے معذرت بھی کی تھی مگر ایک طرح سے کرن شیر صاحب کا شکریہ ادا کر رہی ہوں کہ ان کی وجہ سے تحریری رابطہ شروع ہوا۔ جو بعد میں ناصر رضا

صاحب (مرحوم) کے اور اب اپنی بہن کے خلوص کی وجہ سے جاری ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ شمارہ جولائی میں بھی انہوں نے کسی اور کی کہانی اجالا کے ٹاکسل سے اپنے نام سے شائع کروائی ہے۔ اللہ واسطے یہ اخلاقی جرم بند کروں اپنا ذہن استعمال کریں۔ ام منال صاحبہ کی اگست میں شائع ہونے والی عشق حقیقی نے بہت متاثر کیا۔ عثمان غنی صاحب کی مکافات عمل سبق آموز ہے۔ موینہ بٹول صاحبہ کی نقد برگزیدہ غنی نسل کے لیے مشعل راہ ہے کہ ہمارے اجداد نے یہ ملک پاکستان کتنی عزیز قربانیوں سے حاصل کیا ہے۔ اللہ کرے ہمارے خطر انوں کو بھی احساس ہوا کہ وہ غنی نسل کو دو قومی نظریے سے آگاہی دیں کہ ہمیں آزادی کی قدر ہو، ہم نول، امت ہیں کہ ہمارا جنم ایک آزاد ملک میں ہوا یہ اللہ کی رحمت بھی ہے اور نعمت بھی اس کے لیے ہمد و بہد کرنے والوں کے اللہ درجات بلند کرے اور ہمیں اپنے پاکستان سے محبت کرنے کی توفیق دے آمین جاوید راہی صاحب کی زندگی شرمندگی پہلے بھی کہیں شائع ہو چکی ہے۔ شاید ان کے نام سے ہی یا شاید انہوں نے بھی کرن شیر والی حرکت کی ہے۔ مگر ثبوت دینے سے قاصر ہوں۔ لیکن یہ بات اپنی یادداشت کے سہارے پورے وثوق سے لکھ رہا ہوں۔ اب اس کا جواب راہی صاحب ہی دے سکتے ہیں محمد قاسم خان بلوچ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے جعلی پیروں کی نشاندہی کر کے کمزور عقیدوں والوں کی رہنمائی کی ہے۔ اللہ جاہل لوگوں کو عقل دے عامل کامل کا جواب نہیں۔ آخر میں سب کو سلام دعائیں۔

☆: ارشد بھائی! میں منتظر ہوں کہ کرن شیر صاحبہ اپنا موقف بھی پیش کریں اس لیے اس بار بھی وہ فہرست میں موجود ہیں جواب نہیں دیں گی تو ان پر عائد الزام کو بچھا جائے گا۔ جاوید راہی صاحب ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ میں جانتی ہوں کچھ دنوں میں آپ کو نامعلوم نمبروں سے نامعلوم دہلی آتما نہیں بھیج کریں گی ان بے وقوفی کے بیانات کی پرواہ مت کیجیے گا ہمارے تمام خصوصی نمائندگان کو ایسے بھیج کیے جارہے ہیں۔ اتنے بہادر ہیں بھیج کرنے والے کہ بھیج کرتے ہی فون بند کر دیتے ہیں یا کم نکال دیتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ EMI نمبر سے پیسہ چل جاتا ہے کہ چور کون ہے خبر آپ جیسے پڑھے لکھے لوگوں کا ساتھ ہی سچی کہانیاں کو دور کار ہے امید کرنی ہوں کہ یہ تعلق اب ہمیشہ رہے گا۔

☆: عثمان غنی پشاور سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! ماہنامہ سچی کہانیاں، امید ہے پورا ادارہ ٹھیک ٹاک ہوگا اور احسن طریقے سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہوگا۔ سچی کہانیاں ایک منفرد رسالہ ہے جس کے چاہنے والے دنیا کے کھونے کھونے میں موجود ہے۔ اور مجھے بھی یہ رسالہ دل کی گہرائیوں سے پسند ہے۔ سب سے پہلے تو پورے ادارے کو اور خاص کر سب سے بااخلاق خاتون منزہ سہام صاحبہ کو دل کی گہرائیوں سے عیدالاکھی کی خوشیوں کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اور پھر سارے لکھاری بہن بھائیوں کو اس کے بعد پیارے قارئین کو، سچی کہانیاں ماہ اگست کا شمارہ بہت دیر سے ملا۔ مگر شکر ہے کہ مل گیا۔ ٹاکسل پر ایک خوبصورت سی لڑکی موجود تھی۔ میری طرف سے پیارے رسالے کے لیے ایک شعر

رسالوں میں سب سے پیارا ہے سچی کہانیاں
جس کی کور پر ہوتی ہے پیاری سی مہارائیاں

ارے میں بتا دوں کہ میرا اپنا بالکل نیا شعر ہے۔ مگر ایڈیٹر صاحبہ ہمارے ملک میں صرف خوب صورت لڑکیاں نہیں ہے بہت خوبصورت اور دلکش لڑکی بھی اس ملک میں موجود ہیں۔ ان پر بھی نظر کرم کیجیے گا، جیسے عمران عباس، نواد خان، شاز خان وغیرہ، ان کے فونوز بھی کور پر چاپ دیتے گا۔ ویسے بھی ملک میں تبدیلی کی لہر چلی ہے، آپ بھی کسی تبدیلی کو اپنے ادارے کا حصہ بنا لیجیے گا۔ سب سے پہلے میں یہ بتا دوں وزیر کو میری طرف

پُر اسرار نمبر

اس بار پُر اسرار نمبر رات کی تنہائی میں مت پڑھیے گا
☆ سچی کہانیاں کا شمارہ نومبر 2018 پُر اسرار کہانی نمبر ہوگا۔
اس یادگار نمبر میں نامور لکھاریوں کی ایسی کہانیاں شامل ہوں
گی جنہیں آپ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کر سکیں گے۔
جنتی کہانیاں، ارواح کہانیاں، شیطان اور آسیب پر لکھی
ہیبت ناک سچی کہانیاں، دہشت سے بھری ڈراؤنی کہانیاں
ہی اس نمبر کا حصہ نہیں ہوں گی بلکہ نیک روحوں اور مسلم
جنات کی دوستیوں کے قصے بھی شائع کیے جائیں گے۔
☆ لکھاریوں سے درخواست ہے کہ 25 ستمبر تک اپنی
کہانیاں ارسال کر دیں۔

ایجنٹ حضرات سے درخواست ہے کہ برائے کرم اپنے
آرڈرز سے ادارہ سرکولیشن کو فوری طور پر آگاہ کریں۔

سے بہت بہت مبارک ہوں، آپ آگے بھی اسی طرح سے محنت کرتے رہے گا۔ انشاء اللہ آگے بھی آپ کو
انعام سے نوازا جائے گا۔ جو تینوں میں دال پڑھ کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے۔ ایک طرف چودہ اگست کی
خوشیوں کو دل ہی نہ کیا۔ کہ منائے تو کیسے منائے؟ ہم نے ان سب کے لیے خدا سے دعا کی، کہ اللہ ان کی
معفرت نصیب فرمائے امین۔ مگر پتہ نہیں یہ بڑا سا پلہ کس کم بخت نے ایجاد کیا ہوگا، ہم جہاں کہیں بھی
گئے، اس منہوں کا آواز نے کانوں کے پردے تقریباً بھاڑ ہی دیے۔ مگر چلو پھر بھی خیر رہی، لوگوں نے جوش
و خروش سے چودہ اگست کی خوشیاں منائی۔ پھر بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں
ہوا۔ پرنس افضل کا شاہین کا خط بہت پیارا تھا۔ اس لیے تو بادشاہی کی کرسی ان کو سوچنی پڑی تھی۔ امان اس بار
شمارے میں کوئی بھی غلطی نہیں ہوگی۔ احوال میں بہت سے نئے دوستوں سے ملاقات ہوئی، بہت اچھا لگا۔ اور
ایڈیٹر صاحبہ کے جملیات دل سے پسند آئے۔ ملازم حسین شیرازی آپ کا بہت طویل تبصرہ تھا۔ مگر بہت پسند
آیا۔ اور دوبار پڑھا۔ سٹیکس، میرا رشتہ سچی کہانیاں سے پچھلے مدیر کے دور میں بڑ چکا تھا۔ اس نے میری چھوٹی
کہانیاں بھی شائع کی تھی۔ پھر کسی وجہ سے ہمارا یہ رشتہ وقتی طور پر ٹوٹ گیا۔ مگر سٹیکس تو اللہ کے منزہ سہام صاحبہ
نے اپنے اچھے اخلاق سے پھر سے یہ رشتہ جوڑ لیا۔ اس بار اگست کے شمارے میں میری کہانی کا مکاتبات شائع
ہوئی۔ مگر سوری اور بہت پشیمانی سے بتا رہا ہوں کہ دراصل یہ کسی اور میگزین میں بھی شائع ہوگی۔ اصل میں
کہانی ان کو کافی پہلے بھیج رکھی تھی۔ مگر وہاں نہ لگ سکی تھی۔ تو یہاں بھیجوا دی۔ جہاں باوقار اور بہت پیاری سی
ہماری ایڈیٹر صاحبہ نے انہیں نہ دکھا کر شائع کر دی۔ مگر مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں کفر نہ کر سکا۔ یہ اسی ماہ کہیں
اور بھی لگ رہی ہیں۔ خیر انسانوں سے ہی خطا ہوتی ہے۔ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہیں ہوگی۔ پہلی کہانی غلام جو
بے سند سردار بہت دل سے لکھی تھی۔ عشق حقیقی بھی پسند آئی۔ میری کہانی کے لیے آپ سب بتائیں گے ممتاز
آحمد کی دوسری کی بیوی اچھی لگی۔ زندگی شرمندگی جرم اور سزا کی اچھی تحریر تھی۔ جاوید راہی کی کہانیاں جرم کے
اور گرد گھومتی ہے۔ مور شاہد سے ملاقات اچھی لگی۔ گلے کا طوق بھی بلاشبہ ایک بہتر کہانی تھی۔ اس ماہ کا شاعر عمر
تنہا سے بہت کچھ سیکھا۔ برا انجام نے بھی متاثر کیا۔ اللہ بوجھ گا بہت پیاری کہانی تھی۔ اور آپ کو اتنی اچھی
کہانی لکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ تاریخ کے جھروکے بہت پسند آیا، الماس ایک بہترین سلسلہ وار تحریر
ہے۔ اور ترکی میں عباسی نے تو مانو دل ہی خوش کر دیا۔ خطوط میں عمران قریشی کا خط دیکھ کر دلی خوشی
ہوئی، ارے عمران قریشی صاحب میں کو آپ سچی کہانیاں میں دیکھ کر تا ہوں۔ آپ نے تو جہاں بھی لکھا، وہاں
کامیابی کے جھنڈے گاڑ دے۔ سارے سلسلے بہت اچھے ہیں۔ آپ کی ڈائری، شعر و سخن، مسئلہ یہ ہے ہفت
فرعون دوسری ہی قسط میں ختم ہوئی، بہت اچھی تحریر تھی۔ جبکہ شہبہ مظہر کی سنوری کو لڈ فیر یقیناً اچھی ہوگی۔ میری
نئی کہانی ناقابل یقین آپ کے پاس محفوظ ہے۔ مہربانی فرما کر جلد شائع کیجیے۔ تاکہ جلد نئی کہانی ارسال
خدمت کر سکوں۔ باقی سب دوستوں کی تحریریں بھی بہت اچھی تھیں۔ ڈاکٹر عامر شہزاد کی کہانی بھی خوب رہی۔
☆ ڈیئر عثمان! اچھا ہوا کہ آپ نے وضاحت دی ورنہ میرے اصول بہت سخت ہیں۔ موقع سب کو
دیتی ہوں مگر سچی کہانیاں کے صفحات پر صرف وہی لوگ مستقل نظر آئیں گے جو ہر قسم کی بے ایمانی سے دور
رہیں گے تمہاری دوسری تحریر لکھی ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔

اس آخری خط کے ساتھ اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے اور سچی کہانیاں سے
متعلق کوئی بھی بات ہو بلا جھجک مجھ سے کہیے۔ میں منتظر رہوں گی۔
دعاؤں کی طالب
منزہ سہام

حضرت صہیب رومیؒ

[illegible]

غلام جوبنے سردار

ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ

غزاله عزیز

ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ

تاجروں سے انہیں خرید لیا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق ابن سعد کا بیان ہے کہ صہیبؓ فرار ہو کر مکہ پہنچے اور عبداللہ بن جدعان سے حلیفانہ تعلق قائم کر لیا۔

حضرت صہیبؓ ایک ہنرمند اور مفتی آدمی تھے لہذا مکہ میں قیام کے کچھ عرصے کے اندر انہوں نے اتنا روپیہ کمایا کہ مکہ کے صاحب ثروت لوگوں میں شمار ہونے لگے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اکرم ﷺ نے حق کی دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ حضرت صہیبؓ کے کانوں تک جب رسول اکرم ﷺ کی دعوت پہنچی تو وہ ایک دن حضرت ارقمؓ کے مکان پر حاضر ہوئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر رسول اکرم ﷺ کی رسالت کی گواہی دی۔ رسول اکرم ﷺ ان کے اسلام لانے سے بہت خوش ہوئے تھے اور فرمایا۔

”صہیب روم کا پہلا پھل ہے۔“

حضرت صہیبؓ جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو محض تیس آدمی حق کی گواہی دینے والے

سیدنا حضرت صہیبؓ بن سنان کا شمار حضرت بلال حبشیؓ، حضرت عمارؓ اور خباب بن ارتؓ جیسے عظیم المرتبت، اولوالعزم اور صبر و استقامت کے پیکروں کی صف میں ہوتا ہے۔

حضرت صہیبؓ عراق کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد نسان بن مالک شاہ ایران کی طرف سے ابلہ کے حاکم تھے۔ صہیبؓ ابھی کم سن تھے کہ اہل روم نے ابلہ پر حملہ کر دیا اور مال و اسباب کی لوٹ مار کے ساتھ ساتھ حضرت صہیبؓ کو بھی غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔

انہوں نے بچپن سے جوانی کا زمانہ روم میں غلام کی حیثیت سے گزرا۔ اسی لیے وہ رومی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ایک دفعہ عربوں کے ایک قبیلہ بنو کلب کے کچھ تاجروم کے اس علاقے میں گئے جہاں مصیبؒ غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان تاجروں نے ان کو خریدا اور اپنے ساتھ مکہ آئے۔ یہاں عبداللہ بن جدعان کلبی نے

نئے چنانچہ حضرت صہیبؓ نے سابقوں الاولوں کی جماعت میں شمولیت پائی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلام کا اظہار اپنے لیے ہر قسم کے مصائب کا دروازہ کھولنے کے مترادف تھا۔ سارے اہل مکہ متحد ہو کر مسلمانوں کو مظالم اور اذیتوں کے ذریعے اس نئے دین سے پھیر لے جانے کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔

لیکن حضرت صہیبؓ کا ذوق ایمانی انہیں اپنے دین کو بخفی رکھنے پر راضی نہ رکھ سکا۔ وہ غریب الوطن تھے۔ رشتہ داروں اور قرابت داروں سے دور تھے۔ قبیلہ کی حمایت سے محروم تھے۔ اہل مکہ کے مظالم سے بچنے کے لیے کسی قسم کی ڈھال موجود نہ تھی چنانچہ ایمان کے اظہار کے ساتھ ہی آپؐ پر ہرم کے مظالم کا آغاز ہو گیا۔

کبھی گرم ریت پر لٹائے گئے، کبھی پانی میں غوطے دیے گئے اور کبھی مار مار کر لہو لہان کر دیا گیا۔ ظلم کا ہر حربہ آزمایا گیا لیکن ہر حربہ حضرت سہیبؑ کے عزم کے آگے ہار گیا۔ ظلم کی چکی میں پستے ہوئے انہیں ایک لمحہ بھی حق چھوڑنے کا خیال نہ آیا۔

یوں مظالم بہتے بہتے ایک عرصہ گزر گیا یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ نے ہجرت مدینہ کی اجازت دے دی۔ صحابہ کی اکثریت ہجرت نبوی سے کچھ عرصے پہلے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تھے لیکن حضرت صہیبؓ مکہ میں مقیم رہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ رسول اکرم ﷺ کی معیت میں ہجرت کا شرف حاصل کریں گے۔

لیکن حالات و واقعات موزوں نہ تھے اور
مل ماہ آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور
نہ مل کر آپ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنالیا
اللہ! آپ کو حضرت ابو بکر صدیق کی معیت

میں خفیہ رہ کر ہجرت کرنی پڑی لہذا حضرت صہیبؓ
 یہ تبرک سفر آئے اللہ کے ساتھ نہ کر سکے۔

حضرت صہیبؓ کو جب آپ ﷺ کی ہجرت کے بارے میں پتہ چلا تو ان کے لیے ایک دن بھی مکہ میں گزارنا مشکل ہو گیا اور انہوں نے مدینہ کا ارادہ کیا۔

مشرکین مکہ کو جب پتہ چلا تو وہ طیش میں آ گئے۔ پہلے ہی وہ مسلمانوں اور بعد میں رسول اکرم ﷺ کی مدینہ ہجرت کے باعث غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔

حضرت صہیبؓ نے بے خوفی سے کہا۔
 ”اے اہل مکہ! تم خوب جانتے ہو کہ میرے
 تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا خدا کی قسم! تم میرے
 قریب نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ میں اپنے ترش
 کے تمام تیر تیر پر ختم نہ کروں اور اگر پھر بھی تم میں
 سے کوئی بیخ کن گیا تو پھر میں تلوار نکال لوں گا اور
 جب تک میری جان میں جان ہے تم سے لڑوں
 گا۔ اگر تم سلامتی چاہتے ہو تو میرا پیچھا چھوڑ دو اور
 اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔“

مشرکین نے اُن کو بھرا ہوا دیکھا تو پینتر ابدلہ
ورکھا۔

”اے صہیبؑ جب تم مکہ آئے تھے تو مفلس
ور قلاش تھے لیکن اب تم جبکہ یہاں سے جا رہے
ہو تو یہ مال و دولت جو یہاں سے لے جا رہے ہو
ہماری ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو اور
یہاں چاہے چلے جاؤ۔“

حضرت صہیبؓ نے لحوں کی دیر نہ کی اور تمام
ال واسباب ان کے سامنے پلٹ دیا اور خود خالی
تھ مدینہ کے لیے روانہ گئے۔

جلدی جلدی منزلوں پر منزلیں مارتے
قائے نامہ اعلیٰ کے پاس پہنچے۔ راستے میں

کچھ بیمار ہو گئے تھے اور ایک آنکھ دکھنے آئی ہوئی تھی۔

جب آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو بھوک سے بے حال تھے رسول اکرم ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ بھجوریں کھا رہے تھے۔

حضرت صہیبؓ نے سرور عالم ﷺ اور دوسرے اصحاب کو سلام کیا اور پھر بغیر کچھ کبے سنے بھجوروں کے شغل میں شریک ہو گئے۔

بھوک کی وجہ سے کھانے کی رفتار تیز تھی۔ حضرت عمرؓ بھی اس وقت موجود تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر رسول اکرم ﷺ سے کہا۔

”یا رسول اللہ ﷺ! ملاحظہ فرمائیے ان کی آنکھیں دکھ رہی ہیں اور کس شوق سے بھجوروں پر بھجوریں کھا رہے ہیں۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے کمال شفقت سے صہیبؓ کو مخاطب کیا۔

”سبحان اللہ! تمہاری آنکھیں آئی ہوئی ہیں اور تم بھجوریں کھا رہے ہو۔“

انہوں نے عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ میں اُس آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں جو اچھی ہے۔“ اُن کا یہ جواب سن کر آپ ﷺ اس قدر ہنسے کہ دندان مبارک کا نور ظاہر ہونے لگا۔ بھجوروں سے فارغ ہو کر وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا۔

”واہ جناب! آپ خود تو رسول اکرمؐ کے ساتھ آ گئے اور مجھے ساتھ نہ لیا۔“ پھر صہیبؓ نے حضور اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا۔

”یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ نے بھی عاجز کا خیال نہ فرمایا۔ میں

مکہ میں تمہارہ گیا اور قریش سے بڑی مشکل سے جان چھڑائی اور آپ تک پہنچا۔“ حضور اکرم ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”ابو یحییٰ! تم نے بڑی نفع بخش تجارت کی۔“ مدینہ میں آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرائی تو آپؐ کا مواخاتی رشتہ جلیل القدر صحابی حضرت ابوسعید حارثؓ بن صہبہ بخاری خراجی سے قائم کیا۔

مدینہ پہنچ کر جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپؐ نے تمام معرکوں میں حضور اکرم ﷺ کی ہمراہی میں شرکت کی آپؐ کو خاص طور سے تیر اندازی اور شمشیر زنی میں عبور حاصل تھا۔ آپؐ نے ہر معرکے میں اپنی مہارت کے جوہر دکھائے۔

اگر آپؐ کا سامنا کسی ایسے دشمن سے ہوتا جو مکمل طور پر زہرہ پوش ہوتا تو تاک کے نیزہ اس کی آنکھ میں مارتے کہ وہ الٹ کر جا گرتا۔

حضور اکرم ﷺ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت صہیبؓ کے بارے میں فرمایا۔

صہیبؓ اللہ کے اچھے بندے ہیں اگر وہ اللہ کا خوف نہ کرتے تب بھی اس کی معصیت نہ کرتے۔

حضور اکرم ﷺ حضرت صہیبؓ اور دوسرے ایسے ہی الولوالعزم بزرگوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت صہیبؓ حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت بلالؓ کہیں اکٹھے بیٹھے تھے۔ ادھر سے ابوسفیانؓ (قبول اسلام سے پہلے) گزرے تینوں نے انہیں دیکھ کر کہا۔

”اللہ کی تلواریں ابھی تک دشمن خدا کا سر قلم نہیں کیا۔“

حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی کہیں قریب ہی تھے فرمایا۔

”یہ شخص قریش کا سردار ہے۔ اس کے لیے ایسے سخت الفاظ منہ سے نہ نکالو۔“ اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کیا حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

”تمہارے ٹوکنے سے شاید یہ لوگ برا مان گئے ہوں گے ان کو ناراض کرنا گویا خدا کو ناراض کرنا ہے۔“

حضرت ابو بکر صدیقؓ رسول اکرم ﷺ کی زبان سے یہ ارشاد سن کر خوف کے مارے لرز گئے۔ اسی وقت لوٹ کر ان بزرگوں کے پاس آئے اور کہا۔

”پیارے بھائیو! میری بات سے تم ناراض تو نہیں ہوئے؟“ انہوں نے کہا۔

”نہیں اے ابو بکر! ہمارے دل میں تمہارے خلاف کوئی ملال نہیں اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔“

رسول اللہ ﷺ حضرت صہیبؓ پر اس قدر مہربان تھے کہ آپ ﷺ نے ان کی کنیت ابو یحییٰؓ جو بزرگ فرمائی۔ حالانکہ حضرت صہیبؓ کا یحییٰ نام کا لڑکا نہ تھا۔

مدینہ میں حضرت صہیبؓ نے رسول اللہ ﷺ کی صحبتوں سے خوب فیض اٹھایا لیکن اپنی متلاطیعت کے باعث روایت کی تعداد بہت کم ہے۔

آپؐ کے علم و فضل، صبر و استقلال اور شجاعت، ایمان و ہمت کے باعث آپؐ کا شمار اکابر صحابہؓ میں ہوتا تھا اور ان سونے پر سہاگہ رسول اکرم ﷺ کی صحبت تھی۔

حضرت عمرؓ کے دور میں جب حضرت صہیبؓ ملاقات کے لیے آتے تو حضرت عمرؓ سارا کام چھوڑ کر پہلے ان سے ملتے تھے۔ ایک دفعہ ابوسفیانؓ سہیل بن عمروؓ اور دوسرے سرداران قریشؓ حضرت عمر فاروقؓ سے ملنے آئے۔ اتفاق سے اسی وقت حضرت صہیبؓ حضرت بلالؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ بھی ملاقات کے لیے پہنچے۔

حضرت عمرؓ نے ملاقات کے لیے آنے والوں کے نام دریافت کیے۔

جب نام بتائے گئے تو انہوں نے حضرت صہیبؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت عمارؓ کو ملاقات کے لیے پہلے بلایا۔

حضرت ابوسفیانؓ سے ضبط نہ ہو سکا کہنے لگے۔ ”عجیب بات ہے کہ ان غلاموں کو تو فوراً ملاقات کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ہم انتظار کرتے رہتے ہیں۔“

حضرت سہیل بن عمروؓ فوراً بولے۔

”بھائی! اس کے لیے تو ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔ دعوتِ توحید تو ہم سب کو ایک ہی وقت میں ملی تھی لیکن یہ لوگ اس کو قبول کرنے میں آگے بڑھ گئے اور ہم منہ تکتے رہ گئے۔ اس لیے اگر امیر المؤمنین انہیں ہم سب پر سبقت دیتے ہیں تو کیا غلط کرتے ہیں؟“

حضرت عمر فاروقؓ حضرت صہیبؓ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک دن حضرت صہیبؓ ملنے آئے تو فرمایا۔

”صہیبؓ! تم مجھے بہت محبوب ہو لیکن تمہاری تین باتیں شکلاتی ہیں ایک یہ کہ زبان پر بھی لہجہ غالب ہے حالانکہ تم عربی ہونے کا دعویٰ کرتے ہو دوسرے تم اپنا مال بڑی بے دردی سے خرچ کرتے ہو اور تیسرے تم نے اپنی کنیت ایک پیغمبر

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا
کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو
ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ
سی کوشش۔

بہت جلد.....

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے
روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

بہت شہور اس انتظار.....

شکر گزاری

ایک نوجوان نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ ”اللہ تعالیٰ اپنے نافرمان بندوں سے اپنی نعمتیں چھین لیتا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے سب کے پاس پہننے اور ہنسنے کھانے پینے کے لیے سب کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ تو کسی سے کچھ بھی نہیں چھینتا۔“

بزرگ مسکرائے اور پوچھا: ”تمہاری نماز میں خشوع و خضوع ہے؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

”کیا قرآن کی تلاوت کرتے وقت لذت محسوس ہوتی ہے؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

”کیا پانچ وقت کی نماز دل سے پڑھتے ہو؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

”کیا نیکی کرنے کی طرف دھیان جاتا ہے؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

”کیا زبان اللہ کے ذکر کی عادی ہے؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

تب بزرگ نے جواب دیا۔

”یہی اللہ کی وہ نعمتیں ہیں جنہیں وہ نافرمانوں سے چھین لیتا ہے۔“

کاظمہ اقبال۔ حیدر آباد

کے نام پر رکھی ہے حالانکہ اس نام کا تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔“

یہ سن کر حضرت صہیبؓ نے جواب دیا۔

”امیر المؤمنین! میں واقعی عربی ہوں بچپن میں رومی پکڑ کر لے گئے تھے اور میں نے ان ہی

میں پرورش پائی ہے اس لیے میرے لب و لہجہ پر

عجمی رنگ غالب ہے۔ اس میں میرا قصور نہیں۔“

”دوسری بات اسراف کی تو اصل بات یہ

ہے کہ میں اسراف نہیں کرتا بلکہ رسول اکرم ﷺ

کے اس فرمان پر عمل کرتا ہوں کہ تم میں سے

بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور

سلام کا جواب دے جہاں تک کنیت کا معاملہ ہے تو

یہ میں نے خود نہیں اختیار کی بلکہ رسول اکرم ﷺ

☆☆☆☆



سے ضرور کلک کرے گی دعا ہے کہ۔ اللہ کرے
زور قلم اور زیادہ۔

☆☆.....☆☆



تویر کو جذبول کا اظہار کرنا آتا ہے لوگ بہت
ہم ہم کر سوچ سمجھ کر سچا سنوار کے مضامین تحریر کر
تے ہیں لیکن ان کے ہاں یہ ہم نہیں ہے ان کا ہر پیرا
کراف برا ہے ساختہ ہے جو کہ دل پر اثر کرتا ہے، اُن
نصوں نے حاشیے میں بسنے والوں کی کج ادائیگوں
لوہی بے نقاب کیا ہے جن کے سخت رویوں سے وہ
دل برداشتہ بھی ہوئیں لیکن پھر اپنی نیک فطرت کے
ہم اُس کو فراموش کر دیا۔ اُنھوں نے اس کتاب
میں اپنی زندگی کو بہت خوبصورتی اور بہترین انداز
میں اُجاگر کیا ہے کہیں بہت انکساری ہے اپنی ذات
کے بارے میں اور کہیں وہ کہتی ہیں کہ ہم تو ہیں ہی
بہت پیارے، لوگوں کی آنکھیں خراب ہیں جو اُنھیں
ہم حسین نظر نہیں آتے ہیں

مجھے لگتا ہے کہ تویر کا یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا
ہے اور اُن کی یہ کتاب اپنے اسلوب کی ندرت اور
جذبات کی شدت اور اظہار و بیان کی دلکشی کی وجہ



آج کی مصنفہ

تویر روف

تویر روف

شکستہ شفیق

تویر ایک بے حد عوامی شخصیت ہیں سادہ و پُرکار

نہیں ہے اپنی زندگی کے حقیقی واقعات سادے انداز
میں بیان کئے ہیں لیکن اُن میں اتنی کشش ہے کہ پڑ



جب بات کرتی ہیں تو محبتوں کا سمندر اُن کے لہجے
میں موجیں لے رہا ہوتا ہے مجھ سے ایک مشاعرے
میں ایسی ملاقات ہوئی کی ہم تو اُن کی زلف گرہ گیر
کے اسیر ہو گئے، بہترین زبان دان۔ کئی زبانوں پر اُ
نھیں عبور حاصل ہے بے شمار اردو شاعری انگریزی ز
بان میں ترجمہ کرتی ہیں جس میں اس خاکسار کی بھی
کئی غزلیں شامل ہیں

تویر روف کی سوانح عمری۔ زندگی خوبصورت
ہے۔ دنیائے ادب میں ایک لطیف اور مہکتا ہوا جھوٹکا
ہے، بالکل سادہ زبان میں باتیں کہیں ہیں جو کہ دل
میں اُتری جاتی ہیں کہیں بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے
اور کہیں حیرانی سے منہ کھل جاتا ہے اور بے حد خوش
قسمت کہ میکے والے یعنی ماں باپ بھائی بھابھ اور
بھتیجے جانشین سمدھیانے والے اُن پر فدا، دوست احبا
ب بھی کبھی اکیلے چھوڑنے پر راضی نہیں کہ میرے آ
دھے کھنڈے اُن کے گھر بیٹھے میں کئی فون آئے تھے جو اُ
ن کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ہے۔ یہ کوئی روایتی کتاب

ہنے والے کا دل کتاب شروع کرنے کے بعد اُسے
مکمل پڑھے بغیر چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا ہے

مرحبا عرق گلاب



دلیسی گلاب کا خالص عرق
قدرتی خوبیوں کا بے مثال تحفہ



اوکاڑہ سے بھیجی گئی انتہائی ہولناک داستان

یہ حقیقت تھی

وہ اُس حسینہ کے حسن پر فریفتہ تھا اور اس کی

سنگت ہر دن عید اور ہر رات شب رات کی مانند تھی.....

جاوید رانی

پابندی اور ٹینشن نہیں تھی۔ ایک روز خان صاحب نے مجھے پڑھتے دیکھ کر مجھے مخاطب کیا کہ تم کیا پڑھتے رہتے ہو۔

میرے بتانے پر وہ بہت خوش ہوا اور مجھے مزدوری کی مد میں پلازہ کی نگرانی پر مامور کر دیا اور پلازہ میں ہی رہنے کی اجازت دے دی۔ پہلے میں اسٹیشن کے باہر تیس روپے رات بھر کے لیے چار پائی بستر کرایہ پر لے کر سوتا تھا۔

اب پلازہ کی چھت پر سینٹ کے خالی تھیلے جو وہاں وافر مقدار میں موجود تھے نیچے بچھا کر اوپر لٹے سے لایا پرانا گدا جو دو سو روپے میں خریدا تھا ڈال کر رات کو سو جاتا کھانے کا بندوبست سڑک پار کھڑے کئی ٹھیلوں پر کچھ نا کچھ مل جاتا پراٹھے تو تمام رات ہی چلتے رہتے تھے۔ ایک پراٹھا اور چائے کا کپ لے کر پیٹ کا دوزخ بھرتا اور پھر چھت پر آ کر بلب کی روشنی میں دیر تک پڑھتا رہتا۔

پلازہ کی دوسری طرف ایک بہت بڑا خالی

میرا تعلق ایسے گھرانے سے ہے جہاں دو وقت کی روٹی کے لیے سارے گھر کے لوگوں کی مشقت کرنا لازمی قرار دیا جانا انتہائی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میں نے گرتے پڑتے ایف ایس سی مکمل کی اور مزید تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کر لیا یہاں پہنچ کر میں نے گھر سے لائے تھوڑے بہت روپے پھونک پھونک کر خرچ کرنے کا عہد کر لیا۔

کئی ایک پرائیویٹ ٹیوشن سنٹر پرائیویٹ کالجز اور ایسے ہی اداروں کا جائزہ لیا آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ صبح کام دھندہ اور نائٹ کلاسز میں گریجویشن کی تیاری۔

جس بلڈنگ میں مزدوری کر رہا تھا وہاں پر مسٹری کے ساتھ ایک مزدور تھا جس کے ساتھ میری ڈیوٹی تھی وہ پانچ وقت کا نمازی تھا جب وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا تو میں اپنی کوئی بک نکال کر ریڈ کرنے بیٹھ جاتا پلازہ کا مالک بھی نمازی اور پرہیزگار تھا اس لیے نماز پڑھنے والوں کو کوئی

صبح نیچے آتے رات کو ساتھ لائی کتاب لانا
روٹین میں شامل ہو گیا تھا۔ بیڑھیاں عبور کر کے
اوپر چھت پر آیا اور گدے میں لپٹی کتاب اٹھا کر
سیدھا ہوا تو غیر ارادی طور پر میری نظر پیچھے والے
پلاٹ پر گئی تو میری نظروں کے سامنے اس
کھنڈرات نما چھوٹی عمارت میں زندگی کے آثار
دکھائی دیے۔

کوئی خاتون تھی جو میری طرف پیچھے کئے شاید
گود میں بچے لیے بیٹھی تھی۔ میں سرسری نظر ڈال کر
نیچے جانے کے لیے بیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔
رات کو میں نے اوپر آ کر خالی پلاٹ کی طرف
دیکھا تو کمرے میں صرف مدھم سی روشنی کا احساس
ہوا مگر اندر زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

پلاٹ پر اتنا جس کے چاروں طرف اونچی دیوار
اور ماسٹے کی طرف بڑا سا گیٹ تھا۔ پلاٹ کے
اندراختہائی کو نے میں چھوٹا سا کھنڈرات نما کمرہ
اُس پاس خود رو جھاڑیاں اور کئی ایک بڑے
بے درخت تھے۔ چھت پر سے اس خالی پلاٹ
کا سارا نقشہ صاف دکھائی پڑتا تھا۔

کمرے میں اگر کوئی رہتا بھی تھا تو اس کے
نہ دکا کوئی علم نہ ہونے کے برابر ہی تھا بس مدھم
دی روشنی نظر آتی جو رات کو ہی دکھائی پڑتی سارا
دن نیچے کام پر ہی ہونے کی وجہ سے دن بھر اس
طرف دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی کبھی۔ دوپہر
کو کھانے کی چھٹی یا ریسٹ سمجھ لیں اس دوران
میں اسٹڈی کر لیا کرتا تھا۔

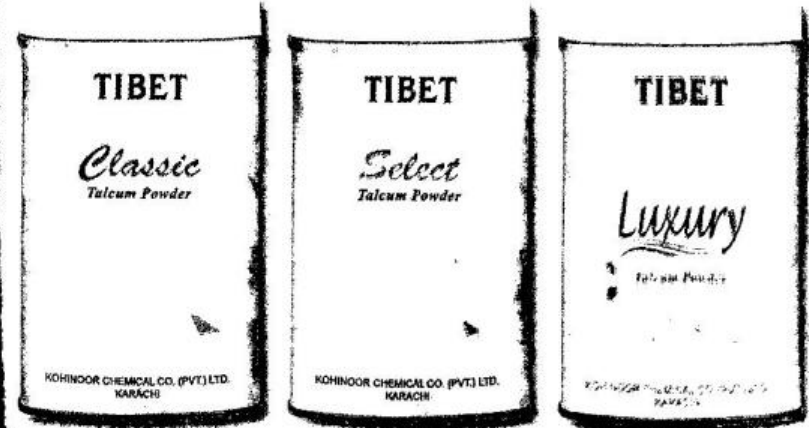


تبت

ٹالکس پاورڈر



اب نئی خوشبوؤں میں دستیاب



کلاسیک

سلیکٹ

لکڑی

تبت ٹالکس پاورڈر - جینج سے دنیا کی سب سے بہتر

میں بلب روشن کر کے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ پتہ نہیں کب نیند آگئی اور میں سو گیا۔ کھلے آسمان کے نیچے تاروں کی چھاؤں میں سونے کا مزہ ای کچھ اور ہوتا ہے ماحول کی سحر انگیزی میں ڈوبا تار یک رات کا منظر چاروں جانب خاموشی کا عالم اور سات منزلہ پلازہ کی چھت پر پڑا میں تن تھا۔

گھر سے دور تنگدستی سے اکتا کر لاہور چلا آیا پڑھائی جاری رکھے اور گھر والوں کی ہیلپ یہ میرا خواب اور شوق تھا۔

پتہ نہیں میں سو رہا تھا یا غنودگی میں تھا کوئی انسانی وجود چھت پر ادھر ادھر حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا ساتھ میں آگے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے پھر وہ چھت پر سے یوں پیچھے کی طرف چلتے دوسری طرف چلے گئے جیسے پلازہ کے ساتھ کوئی دوسری چھت بھی ہو۔ میری یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے ذہن میں وہ سارا منظر بدستور جگمگا رہا تھا۔

میں نے نیچے خالی پلاٹ کی طرف دیکھا وہاں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر یونہی گم صم بیٹھا رہا ہر سب کچھ ذہن سے جھٹک کر دوبارہ گدے پر دراز ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگا پتہ نہیں کب نیند نے دبوچ لیا۔ صبح جھنجھوڑ کر جگانے والا پلازہ کا نشی تھا۔

سورج سر پر اٹھ آیا تھا اور میں ابھی سو رہا تھا۔ جلدی جلدی میں نے بستر اکٹھا کیا اپنی کتاب سنبھالی اور نیچے کی طرف بھاگا۔ غلت کے باعث نیچے خالی پلاٹ کی طرف بھی نہ دیکھ پایا حالانکہ اُٹھتے ہی میری نظر ادھر جاتی تھی۔ دو پہر تک میں اپنے کاموں میں اُجھار رہا جب کھانے وقفہ ہوا تو

غیر ارادی طور پر سیڑھیاں عبور کرتا ہوا اوپر چھت پر آ گیا اپنا بستر سیدھا کیا اور بیٹھ کر کتاب کھول لی مگر میرا ذہیان نیچے پلاٹ کی طرف تھا درختوں کی طرف سے کوئی ٹپک جھپکتے نکلا اور بوسیدہ سے کمرے کے اندر گم ہو گیا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ میں چھت پر سے ادھر ہی متوجہ ہوں۔

مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں کوئی فیملی رہتی ہے۔ اس گھر میں رہنے والی لڑکی یا خاتون کو میں نے ایک دو بار جائزہ لینے والی نظروں سے دیکھا تھا اس کے جسم کی ساخت سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ جسمانی طور پر دلکش نقوش رکھنے والی تھی۔

میں جتنی دیر تک وہاں بیٹھا رہا کوئی بھی خاص بات سامنے نہ آئی اور میں دوبارہ چھت سے نیچے اتر گیا۔

دو دن گزار کر میں گھر سے واپس ڈیوٹی پر آیا تو سب سے پہلے میرے قدم اوپر چھت کی طرف اٹھ گئے اچھی طرح سے نیچے پلاٹ کا جائزہ لیا کوئی بھی حرکت اور نہ ہی ذی روح کا نام و نشان دکھائی دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس بوسیدہ سے گھر میں رہنے والی فیملی کے بارے میں کیوں دلچسپی لے رہا ہوں حالانکہ مجھے ایسے معاملات میں توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر میں کیوں اس بارے پریشان تھا۔

اس سلسلہ میں دو تین بار میرے ذہن میں آیا کہ کسی سے پوچھوں کہ ادھر کون رہا کس پذیر ہے پر میری ہمت نہ ہوئی کچھ پوچھنے کی کیونکہ میرے بارے میں یہاں سب لوگوں کے بہت اچھے خیالات تھے اور میں کوئی ایسا ایڈوٹ نہیں اٹھانا چاہتا تھا کہ مالکان پلازہ میرا اچھت پر جانا بند نہ کر دیں

وہاں میں نے ذہن میں آئے خیالات کو بسا دیا اور یونہی تاک جھانک پر اکتفا کر لیا۔ کمروں کا پلستر روک کر مالکان پلازہ بنے ہیں شید بنانے کا فیصلہ کرتے اضافی راج اور مزاور فارغ کر دیے اور یوں میرے پاس بنانے نام ہی کام رہ گیا۔ شید ڈالنے کے لیے ٹینک اور سریا باندھنے کا ہی کام ہو رہا تھا میں جب جی چاہتا باہر نکل جاتا اور مٹر گشت کر کے پلازہ لوٹ آتا۔

آج بھی میں کھانا کھانے نکلا تو میرے قدم پلازہ کے پیچھے والے حصہ کی طرف اٹھ گئے کافی اونچائی سے نیچے کا منظر دکھائی تو پڑتا تھا مگر قدرے دھندلا سا۔ جب میں اس خالی پلاٹ کی اونچی دیواروں اور بند گیٹ کے سامنے آن کھڑا ہوا تو گیٹ کے رنگ آلود تالے کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ یہاں مکین سائیڈ والے چھوٹے گیٹ کو ہی آنے جانے کے لیے استعمال کرتے ہوئے آگے ہیں کوئی اندازہ ہی لگا رہا تھا کہ اچانک سائیڈ والا نہہنگ ٹکھلنے کا احساس ہوا تو میں فوراً گیٹ بند کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ کھلنے والے حصہ کے دوسری طرف ایک خوبصورت دمکتا ہوا پارہ مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور مٹر کر گیٹ کے چھوٹے اندازے کے آگے اٹھرا ہوا۔ جی میں نے کہاں پہنچ کر رہے پوچھا۔

اندرا آجائیں گھر میں کوئی نہیں۔
نی آپ یہاں ایکی رہتی ہیں؟
میں نے حیرت زدہ ہوتے پوچھا۔
ہیں نہ امیاں اور میرا بچہ بھی ہے اس نے
ایک لمحہ سے میری حیرت کو بھانپتے
اب دیا۔

”تو آپ کا میاں نظر نہیں آتا۔“ میں نے بے خیالی سے پوچھا۔
”وہ دیر سے گھر آتے ہیں صبح مندا اندھیرے ڈیوٹی پر چلے جاتے ہیں سارا دن ہم دونوں ماں بیٹا گھر میں اکیلے ہوتے ہیں۔ میں کئی دنوں سے آپ کو دیکھ رہی ہوں کہ آپ ادھر دیکھتے رہتے ہیں۔“

اس نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے میری چوری کا راز فاش کرتے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

جواباً میں جھدپ کر رہ گیا اور نظریں پھیر لیں۔

”اندرا آجائیں باہر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں۔“ اس نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

چند بل میں نے سوچا اور سائیڈ گیٹ عبور کر کے اندر آ گیا چاروں طرف ویرانی کا راج تھا پورے پلاٹ میں اونچی اونچی گھاس اور بڑی بڑی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں ابھی میں ادھر ہی متوجہ تھا کہ چھوٹا سا لڑکا اندر سے باہر آ کر اپنی ماں کے ساتھ لگتا میری طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”میرا بیٹا روی ہے۔“ اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اس کا نام بتایا۔ میں نے برجستہ اس لڑکی سے اس کا نام پوچھ لیا۔ اس نے دھیمے لہجہ میں بتایا۔
”سلوی!“

”خوبصورت نام ہے۔“ میں تعریف کی۔
آپ ادھر آجائیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں سلوی نے بے ترتیب انٹوں پر قدم آگے بڑھاتے روی کا بازو پکڑتے مجھے ٹوٹے پھوٹے کمرے کے اندر آنے کی دعوت دی۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی سلوی کے پیچھے چلتا ہوا بوسیدہ سے کمرے کے اندر آ گیا۔ دروازے کی جگہ لوہے کی چوکتھ پر پرانا سا پردہ لگا کر دروازے کا کام لیا گیا تھا اندر ایک چارپائی اور تھوڑے سے پرانی طرز کے کچے اور سلور کے برتن بے ترتیب پڑے تھے ایسے ہی کھڑکیوں پر پرانے پردے لنگ رہے تھے۔

دیوار میں دو لوہے کے سرے ٹھونک کر اس کے اوپر لکڑی کی پٹی پر دو چار ڈبے رکھے ہوئے تھے شاید چینی پتی وغیرہ بھی اس میں کونے میں انٹیں جوڑ کر چولہا بنایا ہوا تھا اور پاس ہی کونے میں سوکھی جھاڑیوں اور گھاس پھوس کا گھٹا پڑا ہوا تھا۔

جو شاید پلاٹ سے اکٹھا کر کے استعمال میں لاتی تھی وہ رومی کو میں نے پیار سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا اور اس کا سر بہلانے لگا۔ سلوی کو میں نے چائے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا اور میرے قریب ہی چارنی پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ کا نام.....؟“ اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے مجھ سے دریافت کیا؟ ”ناصر علی۔“ میں نے اپنا نام بتاتے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ اس طرح مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر سیٹھ گئی اور رومی کو مجھ سے لے کر اپنی گود میں لٹا کر بے باکی سے اپنی میٹھیں اوپر کرتے اپنی چھاتی اس کے منہ کو لگا دی۔ سلوی کی اس حرکت پر میں یکدم گڑبڑا گیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے پوچھا اور میٹھیں کو تھوڑا نیچے کرتے رومی کا منہ چھبایا۔

”آپ کب سے اس پلازہ میں کام کر رہے ہو؟“ ”زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ دراصل میں لاہور میں پڑھنے آیا ہوں میرا خاندان انتہائی غریب ہے سب مل کر کماتے ہیں تو گزارہ ہوتا ہے۔ سوچا کہ اپنی تعلیم مکمل کر کے کوئی اچھی نوکری کر لوں تاکہ اپنے گھر والوں کو سنبھال لوں۔“ کہہ کر میں خاموش ہو گیا ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان سلوی نے بتایا۔

”جن کے پلاٹ میں ہم رہ رہے ہیں میرا خاوند ان کی فیکٹری میں ملازم ہے صبح منہ اندھیرے کام پر جاتا ہے اور شام بلکہ رات گئے واپس آتا ہے آپ کا جب دل چاہے آجایا کریں اسی بہانے میرا اور رومی کا دل بہل جایا کرے گا“ سلوی کے لہجہ میں اپنائیت اور بیچارگی کا درد بھرا ہوا تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

”جب فارغ ہوا کروں گا ادھر آجایا کروں گا۔“ میں نے بھی اپنے اندر سلوی کے لیے ہمدردی کا عنصر جاگتے محسوس کر لیا تھا۔ رومی دودھ پیتے سوچکا تھا وہ اسے چارپائی پر لٹاتے اپنی میٹھیں درست کرتی میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں چمکتی خود سپردگی کو میں نے محسوس کرتے وہاں سے اٹھ کر جانے میں ہی بھلائی تصویر کی۔

”اچھا جی میں چلتا ہوں منشی غصہ ہو گا بہت دیر ہو گئی ہے۔“ میں نے بات بناتے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی میرے ہمراہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں پردہ ہٹا کر باہر نکل آئے دروازے سے تھوڑا پیچھے ہی تھے کہ سلوی نے میرا بازو تھامتے التجا بھرے لہجہ میں کہا۔

”ناصر جی آپ آیا کریں گے نا؟“

میں نے جذبات سے بے قابو ہو کر سلوی کو اپنے دونوں بازوؤں میں لیتے اپنے سینے سے اکٹاتے اسے بھرپور یقین دلایا۔ کافی دیر تک ہم دروازے کے قریب کھڑے ایک دوسرے کو نہ دس کرتے رہے اور پھر میں اجازت لے کر باہر آ گیا اور تک پڑے خالی پلاٹوں کے سوا وہاں کوئی بھی دوسرا انہیں میرے سوا۔

میرا اب سلوی کو ملنے کے لیے دل بیقرار رہنے لگا تھا رات کو میں چھت پر اور وہ باہر چارپائی پر آکر بیٹھ جاتی اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔

یہ سلسلہ روز بروز آگے ہی بڑھتا چارہا تھا۔ رومی مجھ سے خاصا مانوس ہو چکا تھا کبھی کبھی مجھے اس دیرانے کی خاموشی سے ڈر لگنے لگتا تھا مگر پھر یہ سوچ کر میں دل بڑا کر لیتا کہ یہ عورت ہو کر چوڑے سے بچے کے ہمراہ دن رات اکیلی رہ رہی ہے مگر مرد ہو کر ڈر جاتا ہوں۔ میں نے سلوی کو منع کر دیا تھا کہ تم کچھ نا پکایا کرو میں تمہارے لیے دوپہر کا کھانا وغیرہ باہر سے لے آیا کروں گا مگر اس نے منع کر دیا۔

”میں عادی ہو چکی ہوں وہ رات جو کھانا لاتے ہیں وہ اتنا ہوتا ہے کہ صبح کا ناشتہ بھی پیٹ پر لگتی ہوں وہ تو ناشتہ فیکٹری جا کر کرتے ہیں۔“ میں مطمئن ہو گیا۔

اب میں بلا روک ٹوک جب دل چاہتا جا رہا تھا وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتی ایک دوبار میں نے نوش کی کہ دونوں ماں بیٹے کو باہر لے سواں کہمانے کے لیے مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

”اگر انہیں پتہ چل گیا تو بہت برا ہوگا۔“ اور یہ کہہ ہی اپنا نہیں لگتا جب ہم آزادی سے

یہاں پر مل لیتے ہیں تو باہر جا کر کیا کریں گے۔ چھٹی کر کے جب میں سلوی کو ملنے گیا تو اس نے بتایا۔

”میرا بندہ مالکوں کے کام سے شہر سے باہر گیا ہے آج رات وہ گھر نہیں آئے گا اگر تمہیں کوئی دقت نہ ہو تو تم ادھر ہی رُک جاؤ؟“

”نہیں کوئی دقت نہیں ہوتی میں چوکیدار کو بتا کر رات کو آ جاؤں گا۔“ میں نے اس سے وعدہ کر لیا اور واپس پلازہ آ گیا شام کو چھٹی کر کے میں نہا کر تیار ہوا اور چوکیدار کو بہانہ بتا کر وہاں سے نکل آیا ادھر ادھر پھرتے اندھیرا پھیل گیا اور میں پلازہ کے پیچھے والی سڑک پر چلتا ہوا سلوی کے غیٹ پر آ گیا وہ میری منتظر تھی۔

چھوٹا دروازہ کھولتے اس نے میرا ہاتھ تھام کر اندر کر لیا اور کندی لگاتے میرے ساتھ کمرے میں آگئی چارپائی کے ساتھ اس نے انٹیں جوڑ کر چھوٹا سا چوہترایا بنایا تھا جس پر رومی بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ چارپائی پر بڑے سلیقے سے بستر بچھا ہوا تھا میرے بیٹھے وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔

”سلوی۔“ جی اس نے خود کو میرے قریب کرتے جواب دیا۔

”یہ کئی بات ہے نا کہ تمہارے میاں کے آنے کی کوئی امید نہیں؟“

”نہیں اس بارے پریشان نہ ہوں وہ اکثر کئی کئی راتیں نہیں آتا مالکان اسے ادھر ادھر بھجواتے رہتے ہیں۔ سلوی نے مجھ پر قربان ہو جانے والے انداز میں مجھے تسلی دی اور میرے قریب دراز ہو گئی۔ رات گئے تک وہ مجھ پر اپنی محبت کی بارش برساتی رہی۔ تمام رات اس کا بیٹا رومی مل بھر کے لیے بھی ادھر سے ادھر نہ ہوا اور

بے خبر پڑا سوتا رہا۔ پتہ نہیں کب میری آنکھ لگ گئی صبح میں نے روئین کی عادت کو فراموش کر دیا اور یونہی سلومی سے لگ کر پڑا سوتا رہا میرا پورا جسم نقاہت میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر دن کے اجالے کی روشنی پردوں میں سے چھن کر اندر کمرے میں نیم تار کی کا سماں پیش کر رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے سلومی کو خود سے الگ کیا اور چار پائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

رومی اس پوزیشن میں پڑا ہوا تھا بالکل
ساکت میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا تو سخت
چھٹکا لگا وہ کسی لاش کی طرح پڑا ہوا تھا میں نے
گھبراہٹ میں سلومی کو جھنجھوڑا وہ بھی اسی طرح
ساکت محسوس ہوئی میں اس صورتِ حال سے گھبرا
کر اٹھ بھاگنے کو تھا کہ یکدم سلومی کے جسم میں
حرکت ہوئی وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف
دیکھ رہی تھی۔

”اُٹھ گئے۔“ اس نے تو یہ شکن انگڑائی لیتے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے لمبی سانس بھری اور جواباً مسکراتے ہوئے بولا۔

”مجھے تو ساری رات ہوش ہی نہیں رہا۔“
 ”ہم ایسے ہی ہوش اُڑا دیتے ہیں۔“ اس
 نے شوخی سے کہا اور اُٹھ کر رومی کی طرف متوجہ ہو
 گئی جواب کر وٹ بدلے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔
 پھر سلمیٰ نے اسے اٹھا کر گود میں لے لیا اور بے
 تکلفی سے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

”اچھا سلمیٰ میں اب کام پر چلتا ہوں دوپہر کو آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے مسکراتی نگاہوں سے میری جانب دیکھتے روی کو دوسری طرف کیا۔ میں مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میرے جسم سے جیسے جان نکلی پڑی ہو اس

سارا وقت میں بے دل سا ہو کر بیٹھا رہا۔ میرا سارا جسم تھکاوٹ سے چور ہو رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ سلوی کے ساتھ گزر وقت مجھے بڑا خواب ناک محسوس ہو رہا تھا وہ پہر کو تو مجھے ناٹم نہ ملا شام کو چھٹی کر کے میں سلوی کو ملنے پہنچ گیا دونوں بڑے تپاک سے ملے میں نے روی کو اٹھا کر گود میں لیا اور دوسرے بازو سے سلوی کو اپنے ساتھ لگا کر خیر خیریت دریافت کی اور اس کے میاں کے بارے میں پوچھا جواب میں اس نے برا سامنے بناتے۔

”اُس نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے دو تین دن لگ سکتے ہیں شاید کل آئے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے لیتے اندر کمرے میں آگئی اس چوہترے نما تہڑے پر کافی کچھ پڑا تھا فروٹ، دودھ، دو بوتلیں کوکسی۔

”آپ بازار گئی تھیں؟“ میں نے سامان دیکھ کر در پافت کیا۔

”جی ہاں کل رات آپ کی خدمت نہ کر سکی مجھے خوشی کے مارے کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے تو پیٹ بھر کے کھا لیا ہے اب یہ سب کچھ آپ کا حصہ ہے۔ میں بھی آپ کا ساتھ دوں گی مگر جب مجھے بھوک لگی۔“ اس نے کا فرانہ ادا سے کہا۔

”تو آج بھی مجھے آپ کا مہمان بننا ہوگا۔“
میں نے اس کا ارادہ بھانپتے شرارت بھرے لہجے

١١١

آپ کا دل نہیں چاہتا میرے پاس ٹھہرنے
 لہذا سلومی نے روٹھنے والے انداز میں میری
 آنکھوں میں دیکھتے برجستہ پوچھا۔

”ارے نہیں میں نے تو یونہی کہا ہے۔“
 جس نے اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔ پھر
 ہم دونوں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو
 گئے۔

”سلومی ایک بات کروں؟“

”ہاں دو کرو.....“ وہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔

”اگر آپ کامیاں اچانک آگیا اور اس نے مجھے دیکھ لیا تو کیا بنے گا۔“ میرے لہجہ کا ڈر محسوس کرتے وہ مسکرائی اور بولی۔

”میں اسے صاف صاف کہہ دوں گی کہ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو مجھے فارغ کر دو۔ میں ناصر صاحب کو نہیں چھوڑ سکتی۔“ اس کے لہجہ میں مہربانہ اور محسوس کرتے میں نے اپنے اندر ایک طرح کے حوصلہ کو جگہ دی۔ رات بھر ہم دونوں دنیا سے بے نیاز اپنے آپ میں گم رہے رومی کو سلوی نے اسی طرح اس چوتھے پرلتا دیا تھا اور وہ تمام رات پڑا سکون سے سوتا رہا اور ہم دونوں اس کی فکر سے آزاد پڑے ہوئے تھے۔ صبح اٹھ کر میں پانزہ آگیا اور اپنے کام میں مصروف ہو کر سلوی کے خیالوں میں کھویا رہا۔ یہ سلسلہ مسلسل دو ماہ جاری تھا کبھی راتیں اور کبھی دن۔ اب وہ اندر سلوی سانسون کی طرح چلتی تھی۔ میں نے دوبار کہا کہ ہم یہاں سے بھاگ چلتے ہیں۔ دوسرے شہر اس نے انکار تو نہ کیا مگر یہ کہہ دیا کہ میں اس کام چل رہا ہے اسے مجھے ملے گا۔ اب کوئی مسئلہ بننا تو یہ بھی کر لیں گے شیڈ

کی چھتیں مکمل ہو چکی تھیں اور مالکان نے کام بند کر دیا اور مجھے بھی وہاں سے فارغ کر دیا گیا یہ بات میں نے سلوی کو بتائی تو اس نے یہ کہہ کر میری ہمت بندھائی کہ اتنا بڑا شہر ہے کسی اور جگہ کام کر لو تلاش ٹھیک ہے میں نے اس کی بات کی تائید کی اور مزدور اڑے پر آ بیٹھا یہاں کوئی ناکوئی کام مل جاتا تھا۔ شام کو میں کام سے واپس آ کر جب سلوی کے گھر ملنے آیا تو وہاں کچھ لوگ کام کر رہے تھے وہ کھنڈرات نما کمروں کو مسمار کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ سلوی اور رومی ادھر ہی ہو گا مگر وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دیئے ابھی میں اسی ادھر بن میں کھڑا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”ہاں جی کیا مسئلہ ہے۔“ سوال کرنے والا
بارعب سا بندہ تھا؟

”جی وہ یہاں جو اس مکان میں رہتے تھے وہ
کدھر گئے.....“

”اُسے بھائی یہاں جو رہتے تھے وہ تو اوپر چلے گئے ہاں ماں اور بچے قتل کرنے والا جیل میں ہے اسے مل لو جا کر۔ چار سال ہو گئے اس واقعہ کو پتہ نہیں وہ سزائے موت پا گیا یا عمر قید۔ اگر کام چاہیے تو تم بھی مل سے آ جانا مزدوری کے لیے.....“ وہ کہتا ہوا دوبارہ وہاں کام کرنے والوں کی طرف گھوم گیا۔ میں اس کے منہ سے یہ جملہ سن کر سکتہ میں آ گیا تھا کہ ماں اور بچے کو اس کے خاوند نے قتل کر دیا تھا اور خود وہ جیل میں تھا میں نے لرزتے قدم جو آگے بڑھنے سے گریزاں تھے ہیشٹے آگے بڑھا دیے۔ تو کیا میں اس کھنڈرات نما کمرے میں اتنے ماہ پر روح کے حصار میں تھا۔

کراچی سے ارسال کردہ تحریر

تتلیاں قید تھیں مقدر کی

لڑکیاں بھی تو تتلیوں کی مانند ہوتی ہیں

جہاں پیار ملتا ہے وہیں ٹھہر جاتی ہیں.....

زریں قمر

~~~~~

~~~~~

~~~~~

شام کا جھٹپٹا پھیل رہا تھا سردی کی شدت سے بچنے کے لیے وہ جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی اس نے کبل کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا تھا ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھلی ہوئی کھڑکی سے کمرے میں آرہے تھے ہر جھونکے کے ساتھ وہ کپکپا جاتی تھی لیکن اس نے کھڑکی بند نہیں کی تھی اسے یہ موسم پسند تھا تیر بارش میں چپکنے والی آسانی بجلی اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی تھی وہ بچپن سے اس موسم کی دیوانی تھی اسے اچھی طرح یاد تھا جب موسم کی اس رنگینی نے اس کی سدھ بدھ بھلا دی تھی اسے اپنے اندر ہونے والی تبدیلی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا نہ ہی ایسا ہونے میں کچھ دیر لگی تھی سب کچھ ہلک جھپٹکے میں ہو گیا تھا ایک لمحے پہلے وہ مارہ تھی اپنے مئی پاپا کی پیاری مارہ اور دوسرے لمحے وہ فضاؤں میں اڑ رہی تھی۔

اس کی کوئی منزل نہیں تھی بارش کے قطرے اس پر برس رہے تھے اور سامنے ایک وسیع اور لامتناہی کائنات بکھری تھی وہ دیکھ رہی تھی کہ لوگ

خود کو بارش سے بچانے کے لیے درختوں، عمارتوں اور چھتر یوں کے نیچے چھپ رہے تھے پھر جب تیز ہواؤں نے اس کے نازک اور رنگین پیروں کو نشانہ بنایا تو اس نے چپنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق سے نہ نکل سکی کیونکہ اس کے ہونٹ غائب تھے جسم غائب تھا وہ خود غائب تھی اگر وہ چاہتی تب بھی وہ رو نہیں سکتی تھی وہ ایک تتلی بن گئی تھی اور تتلیاں اپنے برادران کے دلکش رنگ نہیں دیکھ سکتیں وہ نہیں دیکھ سکتیں کہ وہ کتنی خوبصورت ہیں دوسرے ان کی خوبصورتی سے محفوظ ہوتے ہیں۔

برستی بارش میں اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان جوڑا اپنے کپڑوں پر گرنے والے بارش کے قطرے جھاڑ رہا تھا۔ اس کا بھی جی چاہا کہ وہ اپنے براؤن بالوں سے قطرے جھاڑ دے بارش میں ناچے، تہقہ لگائے اس کا بھی کوئی ساتھی ہو جس کے ساتھ وہ اس موسم کا لطف اٹھائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی کیونکہ بارش اسے بے بس

اگر وہی تھی اسے اڑنے سے روک رہی تھی جبکہ وہ اڑنے پر مجبور تھی وہ اڑتی ہوئی سڑکوں اور گھروں پر سے گزرتی رہی ان لوگوں پر سے گزرتی رہی ان کے چہرے اسے صاف نظر نہیں آرہے تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ بھی ان جیسی ہی ہے اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ کر انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلائے شاید ان میں سے کوئی اس کے بکھرے وجود کو جوڑ دے۔

اچانک اسے فضا میں ایک جانی پہچانی خوشبو کا احساس ہوا یہ خوشبو وہ پہچانتی تھی یہ اس کی پسندیدہ چائے کی خوشبو تھی اس کے دائیں جانب چائے کی وہ دکان تھی جہاں اس نے اپنی دوست تانیہ کے ساتھ اکثر چائے پی تھی۔ اس کے اندر اس چائے

تیز زوردار بارش کے باوجود وہ اس موسیقی کو بخوبی سن رہی تھی اسے لگا جیسے وہ سر اسے اپنی طرف کھینچ رہے ہوں انہوں نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا ہو۔

”بھلا یہ آواز مجھے اتنا کیوں بھاری ہے؟“ اس نے حیرت سے سوچا پھر اس کے پر غیر





ارادری طور پر اسے ایک سڑک پر اڑانے لگے یوں جیسے اسے اس بے حس دنیا میں خوشی اور امید کی چھوٹی سی کرن کی تلاش ہو جیسے ہی وہ مڑی تھی اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی تھی جو اپنے گھر کے لان میں بیٹھا گنٹار بجا رہا تھا وہ اس لان کے درخت کی ایک شاخ پر بیٹھ گئی۔

جہاں بارش سے بچنے کے لیے پتوں کا سہارا موجود تھا اس نے اپنے سنہرے پروں کو زور سے ہلایا تاکہ بارش کے قطرے جھاڑ کے لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے یہ کوشش چھوڑ دی پھر وہ پوری توجہ سے گنٹار سے نکلنے والی موسیقی سننے لگی تھی۔

جیسے جیسے موسیقی اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی وہ ہر سکون ہوتی جا رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ اس کی ساری پریشانیاں ختم ہوتی جا رہی ہیں اس کا ذہن گانے کے ہر بول کے ساتھ غیر ارادی طور پر سرسور اور مسرور ہوتا جا رہا تھا پھر اس نے ایک تھر جھری لی تھی لیکن اسے علم نہیں تھا کہ ایسا ٹھنڈ کی وجہ سے ہوا تھا یا موسیقی کے جادو سے وہ درخت کی شاخ سے اڑ کر اس ریٹنگ پر آ بیٹھی تھی جو اس لان کے شید کے گرد لگی تھی جہاں وہ لڑکا بیٹھا تھا اب وہ اس لڑکے کے سامنے بیٹھ گئی کی آٹھیں بند تھیں وہ اپنے گانے میں مگن تھا وہ اس کے دل کی کیفیت محسوس کر سکتی تھی اس کے گانے کی سریلی آواز شام کے چھپنے میں فضا میں تحلیل ہو کر اس کے وجود میں اتر رہی تھی۔

اے میری روح میرا ساتھ دے

اے میرے دل مجھے چھوڑ کے نہ جا

میں سوچ بھی نہیں سکتا

کہ تو بے وفا ہے

اے خدا! وقت کے دھارے کو

آہستہ کر دے

اے میری روح میرا ساتھ دے

ماڑہ کا دل چاہا کہ وہ لڑکا ایک بار آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھے اس کی موجودگی کو محسوس کرے لیکن وہ جانتی تھی ایسا نہیں ہوگا وہ ایسا نہیں کرے گا۔

بھلا اس کی حیثیت ہی کیا تھی اتنی بڑی دنیا میں ایک چھوٹی سی تلی بہت خوبصورت لیکن غیر اہم تھا سائیز اور وہ اسے نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ وہ اس وقت ماڑہ نہیں ایک تلی تھی۔

پھر اچانک لڑکے نے آنکھیں کھولی تھیں اور تلی کی طرف دیکھا تھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی اسے لگا جیسے وہ کسی انوکھی چیز کو تک رہا ہو اسے حیرت تھی کہ وہ اس کی توجہ کا مرکز بنی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا تلیاں بارش میں بھی اڑ سکتی ہیں اسے لگ رہا تھا جیسے انہی تلیوں کا ایک جھنڈ آئے گا اور اسے اپنے ساتھ لے جائے گا وہ اب بھی گارہا تھا اور خوبصورت تلی اس کے سامنے ریٹنگ پر بیٹھی تھی اپنے سفید اور سنہرے پروں کے ساتھ اس کے پر آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور ان پر بارش کے قطرے نمایاں نظر آ رہے تھے لڑکے نے اپنا گنٹار شید کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور اسے قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا اس کی کوشش تھی کہ تلی کو خوفزدہ نہ کر دے۔

”خوبصورت.....“ وہ بڑبڑایا اور اس نے

ایک قدم آگے بڑھایا۔

وہ بیٹھی رہی۔

اس نے دوسرا قدم بڑھایا۔

وہ پھر بھی بیٹھی رہی۔

وہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ اس کے جادو کی

پروں سے ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گیا۔

”خوبصورت..... بہت خوبصورت.....“

اس نے آہستہ سے تعریف کی اور ماڑہ کا دل زور سے دھڑکا۔

”اوہ..... یہ واقعی حقیقت ہے۔“ لڑکے نے غیر یقینی انداز میں کہا وہ غور سے تلی کو دیکھ رہا تھا اس کے پروں سے پانی کے قطرے ریٹنگ پر گرے تھے ان میں سنہرے نیلے ہرے چمکدار رنگوں کے ذرات ناچ رہے تھے اور قطرے نیچے گر رہے تھے۔

لڑکا محسوس کر رہا تھا جیسے تلی کی آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی ہوں جسے اس کی موجودگی نے خوبصورت تلی کو اڑنے سے روکا ہو جیسے وہ اس کے اور صرف اس کے لیے وہاں آئی ہو۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی مگر آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لڑکا خوبصورت تلی سے آنکھیں ہٹانا نہیں چاہتا تھا اسے ڈرتا تھا کہ وہ پلک جھپکتے ہی اڑ نہ جائے اور پھر ایسا ہی ہوا تھا بس ایک لمحے کو اس کی پلکیں جھپکی تھیں اور وہ سنہری خوبصورت فضا میں بلند ہو کر غائب ہو گئی تھی۔

وہ ایک خواب تھا اور ماڑہ اس کی منتظر بھی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے جسم پر اتنی سردی لے باوجود سینے کے قطرے موجود تھے گزرے لمحوں کی تبدیلی کو وہ اب بھی محسوس کر رہی تھی اس نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا دیوار پر لگی گھڑی صبح لے تین بج رہی تھی وہ اپنے گھر میں اپنے بیڈ پر تھی اور اس کا کنبل اس کے پیروں سے پھسل کر بیڈ کے نیچے گر گیا تھا اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا جیسے یقین آ رہی ہو کہ وہ ماڑہ ہی ہے اور پھر ہر سکون ہو کر کمرے کی سانس لیتی ہوئی بیڈ کی پشت سے نکل گئی۔

میں مسلسل چھٹی رات تھی جو ماڑہ یہ خوب دیکھ رہی تھی اسے ہر تفصیل اچھی طرح یاد تھی کیونکہ اس

نے خواب کو بھلانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی لیکن ایک خلا تھا ایسا خلا جو وہ پرنہیں کر سکتی تھی اسے یاد تھا وہ گیارہ سال کی تھی اسے زندگی سے محبت تھی جب بھی کبھی بارش ہوتی تھی وہ چاہے جہاں بھی ہوتی اسے یہی خواب نظر آتا وہ چلی بن جاتی اور دنیا کی سیر کرتی پھر جیسے ہی بارش ختمی اور اس کی آنکھ کھلتی وہ ماڑہ ہی ہوتی وہ اکثر سوچتی کہ شاید ایسا اس لیے ہے کہ وہ تلیوں کو بہت پسند کرتی ہے ان کے چمکدار رنگ اسے لگاتے ہیں اور اس کی والدہ اکثر اسے تلیوں کے بارے میں بتاتی ہیں ان کی تعریف کر کے اسے زندگی کی اچھی مثالیں دیتی ہیں۔

”نہیں پتہ ہے زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تبدیلی بہت ضروری ہے۔“ ایک بار اس کی والدہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جیسے ایک خوبصورت تلی میں تبدیل ہونے کے لیے طویل مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اتنے خوبصورت رنگ حاصل کرنے اور آزاد فضاؤں میں اڑنے کے لیے اسے کیڑ پلر کے خول سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح انسانوں کو بھی دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔“ اس کی والدہ نے وضاحت کی تو اسے اُن کی بات بہت پسند آئی۔

خواب میں ہمیشہ ماڑہ کی کوشش ہوتی کہ وہ بارش سے بچنے کے لیے کوئی سایہ دار جگہ تلاش کر لے ایسا اس کے ساتھ اکثر ہوتا تھا لیکن اس نے کبھی اپنے والدین کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا وہ نہیں جانتی تھی اس بارے میں جاننے کے بعد ان کا کیا رویہ ہوگا لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی دوست تانیہ کو اس بارے میں بتا سکتی ہے تانیہ

اس کی ہی ہم عمر تھی دونوں میں بے حد دوستی تھی دونوں ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں اور اب میٹرک کرنے کے بعد دونوں کا داخلہ ایک ہی کالج میں ہو گیا تھا۔

تانیہ کو کہانیاں لکھنے کا شوق تھا اور وہ ایک اچھی فوٹو گرافر بھی تھی۔ مائرہ نے اس کی کہانیاں کبھی پڑھی نہیں تھیں اس وقت بھی مائرہ اس کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی اس کا خیال تھا کہ وہ تانیہ پر بھروسہ کر سکتی ہے اس نے پھر گھڑی کی طرف دیکھا ساڑھے چار بج گئے تھے۔

وہ بیڈ سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے لان میں چہل قدمی کرے ابھی بہت صبح تھی لیکن وہ مزید بیڈ پر لیٹنا نہیں چاہتی تھی۔

لان میں آکر وہ ایک درخت کے نیچے رکھی بیچ پر بیٹھ گئی اس نے درخت کے تنے سے پشت لگا لی تھی اور اپنی گرم شال اپنے گرد لپیٹ لی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں وہ ایک بار پھر نیند کی وادی میں پہنچ گئی تھی وہ پھر اس سڑک سے گزر رہی تھی جہاں سے پہلے بھی کئی بار گزر چکی تھی پھر وہ اس جانے پہچانے لان میں پہنچی تھی جہاں اڑان کے دوران پہلے بھی جا چکی تھی وہ خالی تھا وہاں وہ درخت بھی تھا جس کی شاخ پر وہ بیٹھ چکی تھی اسے وہ لڑکا بھی نظر آ رہا تھا وہ بہت خوبصورت تھا اس میں کوئی جادوئی کشش تھی جو مائرہ کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اس کے ہاتھوں میں گٹار تھا وہ بہت پُر سکون تھا ہوا سے اس کے بالوں کی ایک آوارہ لٹ اڑ کر اس کے ماتھے پر آگری تھی اس کی آنکھیں بند تھیں وہ گنگنارہا تھا۔

”اسارنی.....“ مائرہ نے دل میں اس کی تعریف کی۔

اچانک مائرہ کی آنکھوں میں بجلی کی تیزی سنہری چمک کووندی ساتھ ہی بادلوں کی زوردار گرج سنائی دی سفید شہد میں درختوں کی آوارہ پتیاں رقص کرتی پھر رہی تھیں اور ان کے سرسراہنے کی مدھم آواز طوفانی گرج وچمک میں دب گئی تھی وہ لڑکے کے قدموں کو چوم رہی تھیں وہ اب بھی گٹار کی دھن پر گنگنارہا تھا یہاں تک کہ ایک سنہری تپتی اس کے سامنے آگئی اس نے آنکھیں کھول دیں وہ اس تپتی ہی کے لیے زکا تھا۔

خدا کو پہچاننے کے لیے دیکھو

وہ تلی جو مدتوں بعد

ہزاروں دوریاں طے کرتی

پھر وہیں لوٹ آتی ہے

اسی درخت پر

اس شاخ پر

خدا کو پہچاننے کے لیے دیکھو

وہ گنگناتے لگا..... اور سردی کی شدت اور بجلی کی چمک نے مائرہ کو چونکا دیا اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ لان میں بیچ پر بیٹھی سردی سے ٹھٹھری رہی تھی وہ اٹھ کر واپس اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ جہاں ہر چیز بکھری ہوئی تھی پھر اس نے زمین پر بڑا ہوا کمبل اٹھایا جو سوتے ہوئے اس سے ہی گر گیا تھا اور خود کو کمبل میں لپیٹ کر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

اس کی آنکھ اپنی والدہ کی آواز پر کھلی تھی جو باورچی خانے سے اسے بکار رہی تھیں۔

”مائرہ جلدی اٹھو تمہیں کالج کے لیے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اُسے بلارہی تھیں۔

”آج تمہارا کالج کا پہلا دن ہے اور آج ہی تم لیٹ ہو جاؤ گی۔“

ان کی آواز پر وہ تیزی سے اٹھی تھی اور ہاتھ

وہ ان میں چلی گئی تھی اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تھا اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جن میں ہاتھ جکھڑا اور نفرت کی لہریں بنی تھیں جو خاصی مسم نہیں براؤن آنکھوں کی پتلیوں میں سنہری نہاں تھی جو شاید رات کے جادو کی خواب کا اثر تھا۔ یہی وہ چیزیں تھیں جو اسے یقین دلاتی تھیں کہ اس نے خواب بخش خواب نہیں۔

اس نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کا ایک بہرہ مارا اور گہری پُر سکون سانس لی پھر چہرے پر پُر سکون مسکراہٹ بکھیرے ذہن سے اسارنی کا خیال بھوکھریا۔

بچن کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی والدہ کو دیر سے اٹھنے کے بارے میں کیا بتائے گی جو ناشتہ کرانے کے لیے بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

میز پر موسم کے پھل اور نچ جوس اور سینڈویچز موجود تھے اور مائرہ کی والدہ سنک کے پاس کھڑی پانچ کام کر رہی تھیں۔

”اوہ تم آگئیں۔“ انہوں نے مائرہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ ناشتہ دیکھ کر حیران ہو؟“ انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مئی! کوئی خاص موقع ہے؟ ناشتہ پر اتنی باتیں؟“ اور میرے پسندیدہ فروٹس.....؟“

”بس میں نے سوچا..... آج تمہارا کالج کا پہلا دن ہے۔“ انہوں نے توتھیں خوش کر دیا جائے۔“ انہوں نے کہا۔

”لیکن ڈیڈی؟“

”وہ ہاتھ مل گئے ہیں انہیں آج صبح جلدی ہو رہی ہے۔“ انہوں نے بتایا تو

”نہ مل کر انہیں دیکھا اس کے ڈیڈی ایک

ڈاکٹر تھے اور مقامی اسپتال میں ملازمت کرتے تھے اپنی مصروفیت کی وجہ سے وہ اکثر فیملی کو زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے لیکن اس کی مئی نے بھی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔

”میرا خیال ہے وہ جلدی آجائیں گے۔“ مائرہ نے کہا۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔“ اس کی والدہ نے جواب دیا پھر وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں تھیں۔

”آج تم دیر تک سوئی رہی ہو خیریت تو ہے؟“

”میرا خیال ہے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی ابھی کالج کا وقت ہے۔“ مائرہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی روزانہ کے مقابلے میں دیر سے اٹھی ہو۔“ انہوں نے ڈانٹنگ ٹینل سے ایک سیب اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں کل رات سر میں کچھ درد تھا نیند دیر سے آئی تھی۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”تمہارے چہرے کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ کئی راتوں سے نیند پوری نہیں ہوئی۔“ انہوں نے کہا تو مائرہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا جیسے اس کی والدہ نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔

”کیا؟“ اس نے چونک کر کہا وہ اور نچ جوس پیتے پیتے رک گئی تھی۔

”تائیں سب جانتی ہیں تم ان سے کچھ نہیں چھپا سکتیں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم کئی راتوں سے جاگ رہی ہو یا دیر سے سو رہی ہو۔“

”ہاں ایک خواب مجھے روز تک کرتا ہے۔“

”کیا؟“

”میرا خیال ہے وہ جلدی آجائیں گے۔“

اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

”کیسا خواب؟“ انہوں نے پوچھا اور مائرہ ایسا جملہ تلاش کرنے لگی جو اس کے سچ سے قریب تر ہو وہ سوچ رہی تھی کہ خواب میں سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے چنانچہ وہ انہیں سچ بھی بتا سکتی ہے وہ اسے محض خواب ہی سمجھیں گی سچ نہیں۔

”یہ بڑا عجیب خواب ہے..... میں دیکھتی ہوں کہ میں ایک تلی بن گئی ہوں۔“

”اوہ..... یہ تو بڑا دلچسپ خواب ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا اب بھی تم نے ایسا خواب دیکھا ہے؟“

”ہاں..... میں نے دیکھا کہ سردی بہت ہے ایسی سردی میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی۔“

مائرہ نے سینڈوچ کھاتے ہوئے کہا۔

”بارش بھی ہو رہی تھی اور میں..... میں ایک قتل بن گئی تھی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... یہ تو زبردست ہے..... تلی بننا تو بہت دلچسپ رہا ہوگا؟“

”ہاں..... مجھے بھی بہت مزہ آیا تھا۔“

”تمہیں پتہ ہے ہماری زندگی بھی ایک تلی کی طرح ہے جب ہم زندگی کی معراج اور خوبصورتی کو چھونے والے ہوتے ہیں تو تلیوں کی طرح کچھ تبدیلیوں اور مشکلات سے گزرتے ہیں۔“

اس کی والدہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں زندگی تلیوں کی طرح ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ آرام تو کرو لیکن اڑنا بھی نہ بھولو۔“ مائرہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور کالج جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”اپنا خیال رکھنا۔“ اس کی والدہ نے ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے کہا اور وہ الوداع کہہ کر گھر سے نکل گئی۔

کالج جاتے ہوئے اسے راستے میں کار کے اندر بیٹھے ہونے کے باوجود سردی کا احساس ہو رہا تھا آج اس کی کالج لائف کا پہلا دن تھا اس کے دل میں ایک بے چینی سی تھی کیسے نئے دوستوں سے واسطہ پڑے گا کالج کے پارکنگ ایریا میں کار موڑتے ہوئے وہ مخالف سمت سے آنے والی کار سے اپنی کار ٹکرائی تھی ایک دھماکا ہوا اور آس پاس موجود اسٹوڈنٹس اس کی طرف متوجہ ہو گئے جو جلد ہی دوبارہ اپنی اپنی سمت روانہ ہو گئے تھے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کے شیشے پر دستک ہوئی وہاں سے ایک لڑکے کا چہرہ جھانک رہا تھا جس پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے مائرہ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر باہر آ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں معافی چاہتا ہوں..... کہ اچانک آپ سے کار ٹکرایمیں۔“ لڑکے نے کہا۔

”اگر کوئی بھی نقصان ہوا ہے تو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں ب..... اس کی ضرورت نہیں۔“ مائرہ نے پہلی بار اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسے لگا کہ اس نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے اس کی آنکھیں..... اس کی رنگت.....

اس کے ماتھے پر پھیلے ہوئے سیاہ بال..... بہت زیادہ خوبصورت اور وجہ.....

”اوہ..... میں..... بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ اچانک بولا۔

”دراصل میں یہاں نیا ہوں..... اور میں نہیں جانتا کہ کہاں گھوم رہا ہوں..... اصل میں مجھے اپنے کلاس روم کی تلاش ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ اور مائرہ کی نظر اپنی کار کے اگلے حصے پر پڑی جہاں بڑا سا گڑھا پڑ چکا تھا اسی لمحے فرسٹ بیرید کی بیل کی آواز آئی اور وہ چونک

کر رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اگر یہ خواب ہے تو کبھی نہ ٹوٹے پورے پیرید مائرہ یا اس لڑکے درمیان کوئی بات نہیں ہو سکی تھی پیرید ختم ہونے کے بعد وہ تیزی سے کلاس سے نکل گئی۔

”مائرہ.....“ اسے اپنے پیچھے تانیہ کی آواز سنائی دی اور وہ رک گئی۔

”میرا خیال تھا کہ تم میرا انتظار کرو گی۔“ مائرہ نے تانیہ کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

”کیوں؟“ مائرہ نے پوچھا۔

”بھئی میں نے کلاس میں تمہیں اشارہ تو کیا تھا کہ میرا انتظار کرنا۔“ تانیہ نے کہا۔

”اچھا..... میں سمجھی نہیں تھی تانیہ.....“ مائرہ نے جواب دیا۔

”کیا تم نے اب تک اس سے بات کی؟“ تانیہ نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

”کس سے؟“ مائرہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”ہینڈسم سے..... وہی جو تمہارے ساتھ بیٹھا تھا۔“ تانیہ بے ساختہ ہنسی۔

”نہیں..... لیکن صبح اس نے میری کار کو ٹکڑا ماری ہے۔“

”تمہاری کار کو ٹکڑا ماری؟“ تانیہ بے یقینی سے ہنسی۔

”تمہارے حسن میں کھو گیا ہوگا۔“ اس نے پھر شرارتی انداز میں کہا۔

”تم فکر مت کرو..... ہم کالج کی چھٹی کے بعد ملنے والے تھے۔“ مائرہ نے کہا۔

”ملنے والے تھے؟ کیا مطلب؟ ملنا بھی ملے ہو گیا؟“

”ارے بھئی کار کے نقصان کے بارے میں بات کریں گے۔“ مائرہ نے وضاحت کی۔

”ابھی تو کلاس میں جانا ہے..... بعد میں ملنا ہیں۔“ کالج کے بعد اس مسئلے کو حل کریں گے۔“ لڑکے نے غلٹ سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

مائرہ حیرت سے اُسے جاتے دیکھ رہی تھی اس میں جاتے ہوئے مائرہ کو کوئی فکر نہیں تھی

وہ اس کے کہ وہ لڑکا کون تھا اور اسے جانا دینا یا یوں لگ رہا تھا وہ اس سے دوبارہ ملنا چاہتی

تھی اور بار بار یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے اسے کہاں دیکھا تھا لڑکے کی آنکھیں

اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں جنہیں وہ بھلا نہیں پارتی تھی۔

کلاس روم میں پروفیسر نے اسے ویل کم کیا تھا اور وہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھی تھی اسے بار بار اس لڑکے کا خیال آ رہا تھا جو اجنبی ہونے کے باوجود

اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا وہ ہر پیرید کے دوران اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی اسے امید تھی

کہ وہ شاید اس کی ہی کلاس میں ہوگا لیکن کلاس میں اسے ناپاکر مائرہ کو مایوسی ہوئی تھی۔

آخری پیرید میں وہ ہسٹری کی کلاس لینے کے بارے میں سوچتی رہی تھی تب ہی اس کی نظر اس

”لے پر پڑی تھی جہاں وہ بیٹھا تھا اس کے برابر والی لڑکی خالی تھی مائرہ وہاں بیٹھ گئی اسے لگ رہا

تھا کہ جیسے آج کی کار کی ٹکر والا واقعہ بھی کوئی خواب ہے اور جب کالج کے بعد وہ اپنی کار کے

بال جاتے تو وہ بالکل ٹھیک حالت میں ہو۔ مائرہ نے بیٹھے بیٹھے نظریں اٹھائیں تو تانیہ اس کے

انہ والی قطار میں بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی اور

مائرہ لڑکی تھی کہ پیرید کے بعد اس سے ملے

تھا کہ وہ دھیان اس کی طرف نہیں تھا وہ لڑکے

کا بیٹھی خود کو فضاؤں میں اڑتا محسوس



”اچھا ٹھیک ہے۔“ تانیہ جلدی سے بولی۔  
 ”تم چلو۔۔۔۔۔ میں اس سے مل کر آتی ہوں۔“  
 مائرہ نے کہا اور چلتی ہوئی کار پارکنگ کی طرف  
 بڑھ گئی پھر وہ وہاں کافی دیر اس کا انتظار کرتی رہی  
 تھی لیکن وہ نہیں آیا تھا مائرہ کا دل شدت سے اس  
 لڑکے سے ملنا چاہ رہا تھا لیکن اسے یقین ہو چلا تھا  
 کہ وہ نہیں آئے گا۔  
 ”ہائے۔۔۔۔۔“ اچانک اُسے اپنی پشت سے  
 آواز آئی اور وہ تیزی سے مڑی۔  
 ”اوہ۔۔۔۔۔ ہائے۔“ اس نے حیرت سے کہا وہ  
 اس کے سامنے کھڑا تھا وہی جانی پہچانی آنکھیں  
 وہی بال وہی مسکراہٹ۔۔۔۔۔  
 ”دیکھیں کیا نقصان ہوا ہے۔“ لڑکے نے  
 کار کے اگلے حصے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”اوہ۔۔۔۔۔ یہ تو خاصا بڑا گڑھا پڑ گیا ہے۔“  
 اس نے فکر مندی سے کہا۔  
 ”کوئی بات نہیں۔“  
 ”میں ٹھیک کروادوں گا۔“ اس نے اصرار  
 کیا۔  
 ”نہیں اس کی ضرورت نہیں میں خود ٹھیک  
 کروالوں گی ویسے بھی اس کی وجہ سے کار کی  
 کارکردگی پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔“ مائرہ نے  
 مسکراتے ہوئے کہا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ  
 سارا دن وہاں کھڑی اس سے باتیں کرتی رہے۔  
 ”اچھا۔۔۔۔۔ جیسی تمہاری مرضی۔“ اس نے کہا  
 اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔  
 ”میرا نام احسن ہے۔۔۔۔۔ احسن اقبال۔“  
 اس نے جاتے ہوئے کہا۔  
 ”میں مائرہ ہوں۔“ مائرہ نے دھڑکتے دل  
 سے کہا وہ چلا گیا تھا اور مائرہ وہاں کھڑی کافی دیر  
 تک اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

کھانے کی میز پر اسے اپنے والدین کی کار کو  
 بد احتیاطی سے استعمال کرنے کے بارے میں  
 نصیحتیں سننا پڑی تھیں اور وہ جلدی سونے کے لیے  
 اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور بیڈ پر لیٹی دیر تک  
 اس لڑکے کے بارے میں سوچتی رہی تھی پھر نیند  
 نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔  
 وہ خواب میں اڑتی جا رہی تھی جیسا کہ کئی  
 راتوں سے ہو رہا تھا۔ منظر بھی وہی تھا بارش بھی  
 ویسے ہی ہو رہی تھی وہ انہی راستوں، سڑکوں اور  
 عمارتوں کے قریب سے گزر رہی تھی وہی جانی  
 پہچانی خوشبوئیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں حد تو یہ  
 کہ اس کے قریب سے گزرنے والے لوگ بھی  
 وہی تھے پھر اسے موسیقی سنائی دینے لگی جو اسے  
 اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور کچھ دیر بعد وہ اسی  
 جانے پہچانے لان کے شید میں تھی۔ سب کچھ  
 اپنے آپ کو دہرا رہا تھا ہمیشہ کی طرح لیکن اب  
 صرف ایک چیز مختلف تھی مائرہ نے لڑکے کی طرف  
 دیکھا وہ کچھ بدلا بدلا سا تھا اس کے بازو پہلے سے  
 زیادہ مضبوط و توانا ہو گئے تھے آواز سمندر کی طرح  
 گہری جو مائرہ کے دل میں موجود پیار کی پُر سکون  
 لہروں کو بے چین کر رہی تھی۔ اس کی بے نام  
 چاہتوں کو ایک نام دے رہی تھی اور جب وہ  
 رینگ پر بیٹھنے کے لیے اس کے قریب گئی اور اسے  
 دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں کو جھپکایا تو وہ حیران  
 رہ گئی۔  
 وہ اُسے پہچان گئی تھی۔۔۔۔۔ وہ وہی تھا۔۔۔۔۔  
 احسن۔۔۔۔۔ احسن اقبال۔۔۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ مائرہ  
 کی طرف بڑھ رہا تھا اور رینگ کے قریب آ کھڑا  
 ہوا تھا وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا مائرہ بھی اسے  
 آنکھوں میں بسا لینا چاہتی تھی۔  
 ”خوبصورت۔۔۔۔۔“ مائرہ کو لگا جیسے احسن نے

منا، لب کیا ہو اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی لیکن  
 اس کی یادوں میں سب موجود تھا اسے لگ رہا تھا  
 جیسے اس کے ذہن میں دو یادیں ساتھ ساتھ زندہ  
 ہوں۔۔۔۔۔ فضاؤں میں اڑتا۔۔۔۔۔ کار کی ٹکر۔۔۔۔۔  
 نہادوں کی پلٹیں۔۔۔۔۔ موسیقی کی آوازیں۔۔۔۔۔ کار  
 کی لٹری سے جھانکتا ہوا احسن کا چہرہ۔۔۔۔۔ گٹھار کی  
 آہن بجاتا لڑکا۔۔۔۔۔ گہری آنکھیں۔۔۔۔۔ بکھرے  
 ہال۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہی تھا۔ مائرہ کو یقین ہو گیا وہ  
 اچانک نیند سے چونکی تھی اس کا جسم سردی سے  
 کانپ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے کیا دیکھا  
 ہے وہ جسے دیکھتی رہی تھی وہ لڑکا حقیقت تھا۔۔۔۔۔  
 احسن۔۔۔۔۔ احسن اقبال۔۔۔۔۔ اور اسے اس حقیقت کو  
 ماننا تھا۔۔۔۔۔ وہ اس کا اسمارتی تھا۔  
 دوسرے روز کالج میں موقع پاتے ہی تانیہ کو  
 اپنا راز بتانے کے لیے مائرہ نے اسے فری پیریڈ  
 میں ایک درخت کے نیچے روک لیا تھا اور جب  
 تانیہ کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا تو وہ اُلجھ گئی  
 تھی۔  
 ”تم جو بات کہہ رہی ہو وہ ناممکن ہے بھلا  
 ایسا لڑکی کیسے ہو سکتی ہے۔“ تانیہ نے کہا۔  
 ”یقین کرو۔۔۔۔۔ میں کافی عرصے سے یہی  
 خواب دیکھتی ہوں اصل میں ہم لڑکیوں میں اپنی  
 خواہشات کی تکمیل کے لیے اونچے سے اونچا  
 لڑکے کی خواہشیں تو ہوتی ہیں لیکن اتنی جرأت  
 تو ہوتی۔“ مائرہ نے کہا۔  
 ”لیکن خواب تو خواب ہوتے ہیں حقیقت  
 تانیہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔  
 ”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ لیکن اگر تمہیں اپنے  
 خواب کی تکمیل کے لیے ایسا ہی یقین ہو جیسے ہم جانتے ہیں کہ  
 خواب حقیقت ہیں تو ہمارے سامنے موجود ہے اور ہم  
 اسے اپنی زندگی میں لے سکتے ہیں تب؟ اگر ایسا یقین

ہو تو پھر خواب بھی سچے ہو جاتے ہیں تانیہ۔“ مائرہ  
 کے لہجے میں عجیب سرور سا تھا۔  
 ”تم اسے پسند کرتی ہو؟“ تانیہ نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے  
 میں اسے ایک طویل عرصے سے اپنے خوابوں میں  
 دیکھ رہی ہوں وہ میرے لیے ایک زندہ حقیقت  
 ہے اور اب۔۔۔۔۔ جبکہ وہ میرے سامنے۔۔۔۔۔  
 میرے ارد گرد موجود ہے میں اس سے کیسے دور رہ  
 سکتی ہوں۔“  
 ”کیا تم نے اُسے کچھ بتایا؟“  
 ”نہیں۔۔۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔۔۔ کل تک تو مجھے بس  
 اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ جانا پہچانا ہو۔۔۔۔۔  
 مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا  
 تھا لیکن کل رات۔۔۔۔۔“  
 ”کل رات تم نے اُسے پھر خواب میں  
 دیکھا؟“  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ اور کل سب کچھ بہت کلیئر تھا۔۔۔۔۔  
 کل جب اس نے میرے قریب آ کر خوبصورت  
 کہا تو اسی لمحے میں پہچان گئی تھی کہ وہ احسن  
 ہے۔۔۔۔۔ میرا اسمارتی۔“ مائرہ بولے جا رہی تھی۔  
 ”پھر اب۔۔۔۔۔ اب تم کیا چاہتی ہو؟“ تانیہ  
 نے پوچھا۔  
 ”میں اس کے بارے میں سب کچھ جانتا  
 چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ وہ کون ہے۔۔۔۔۔ کہاں رہتا  
 ہے۔۔۔۔۔ اس کی فیملی میں کون کون ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔  
 اور کہیں اس کی زندگی میں کوئی اور لڑکی تو نہیں۔“  
 ”ہوں۔۔۔۔۔ میں سمجھ گئی۔۔۔۔۔ میں اس سے یہ  
 سب پوچھوں گی۔“  
 ”نہیں یوں نہیں“ میں چاہتی ہوں اسے یہ  
 احساس نہ ہو کہ ہم اس میں دھچکی لے رہے ہیں  
 اور اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتا چاہتے

ہیں..... میں اسے موقع دینا چاہتی ہوں.....  
اسے وقت دینا چاہتی ہوں..... اگر میرے خواب  
سچے ہیں تو وہ خود میرے قریب آنے کی کوشش  
کرے گا۔“  
”اور اگر ایسا نہ ہوا؟“ تانیہ نے خدشہ ظاہر  
کیا۔

”ایسا ہوگا..... اگر خدا نے اسے میرے  
خوابوں میں بسایا ہے..... ملنے کا ذریعہ بنایا ہے تو  
مجھے بھی آہستہ رومی سے سکون سے پریشانی چھوڑ  
کر جلد بازی چھوڑ کر اس عمل کا حصہ بننا ہوگا جس  
میں ایک نئی کیئر ہلنے کے عمل سے گزرتی ہے  
اور خود کو خوبصورت رنگوں والے پر اور آزادی  
ملنے تک سکون سے انتظار کرتی ہے۔ مجھے بھی  
انتظار کرنا ہوگا۔“ مازہ بول رہی تھی اور تانیہ حیرت  
سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

پھر مازہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا احسن  
خود بخود اس کے قریب آتا چلا گیا تھا وہ کالج میں  
زیادہ وقت ایک ساتھ گزارنے لگے تھے اس  
عرصے میں احسن نے اُسے بتایا تھا کہ اس کے  
والد ایک بزنس مین ہیں اس کی والدہ ایک صحافی  
ہیں اس کی ایک چھوٹی بہن ہے جو اسکول میں  
ساتویں کلاس میں پڑھتی ہے اور مازہ اس کی  
زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہے یہ سب جان کر  
مازہ بہت خوش ہوئی تھی۔

”تمہیں کیسی لڑکیاں پسند ہیں؟“ مازہ نے  
اس سے دل کی بات پوچھی۔

”مجھے ایسی لڑکیاں پسند ہیں جو تیلیوں کی  
طرح خوبصورت اور انہیں پکڑنا..... انہیں حاصل  
کرنا اور انہیں قابو کرنا مشکل ہو۔“ احسن نے کہا  
اور وہ اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”بھلا تیلیوں جیسی لڑکی ہی کیوں؟“ مازہ نے

تجسس سے پوچھا۔

”بس تیلیاں مجھے پسند ہیں..... میں بچپن ہی  
سے تیلیاں پکڑنے کا شوقین ہوں لیکن وہ بھی  
میرے پاس نہیں آتیں..... شاید یہی وجہ ہے کہ  
اکثر خوابوں میں بھی میں تیلیاں ہی دیکھتا ہوں۔“  
”کیا مطلب؟“

”مجھے اکثر تیلیاں خوابوں میں بھی نظر آتی  
ہیں اور میں انہیں پکڑ نہیں پاتا۔“ احسن نے  
وضاحت کی اور مازہ دھیرے سے مسکرا دی۔

آہستہ آہستہ مازہ اور احسن ایک دوسرے  
سے بہت قریب آگئے تھے مازہ نے احسن کو نہیں  
بتایا تھا کہ اس کے خوابوں میں آنے والی نئی وہی  
ہے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ احسن اس پر یقین نہیں  
کرے گا لیکن اُسے خوش تھی کہ وہ احسن کا قرب  
حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

انز کرنے کے بعد احسن اپنی خواہش پر اپنے  
والدین کو مازہ کے گھر لایا تھا اور انہوں نے اپنے  
بیٹے کے لیے مازہ کا رشتہ مانگا تھا جو مازہ کی والدہ  
نے اس کی مرضی سے منظور کر لیا تھا مازہ بہت خوش  
تھی اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی منزل خود  
چل کر اس کے قریب آگئی تھی۔

شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا مازہ اپنے گھر  
کے لان میں احسن کے ساتھ اسی بیچ پر بیٹھی تھی  
جس پر وہ ایک رات بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اور اپنے  
خواب میں اڑتی احسن کے پاس پہنچ گئی تھی احسن  
کے ہاتھ میں گٹار تھا اور وہ اس پر وہی دھن بجا رہا  
تھا جو مازہ نے اس کے لان میں بیٹھ کر سنی تھی مازہ  
اس دھن میں منہمک تھی اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ  
کب اس نے دھن کے ساتھ ساتھ گنگنا شروع  
کر دیا تھا۔

خدا کو پہچاننے کے لیے دیکھو

وہ نئی جو مدتوں بعد

ہزاروں دوریاں طے کرتی  
پھر وہیں لوٹ آتی ہے

اسی درخت پر

اسی شاخ پر

خدا کو پہچاننے کے لیے دیکھو

احسن اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا گٹار  
جاتے جاتے اس کا ہاتھ رک گیا تھا اور موسیقی کی  
اداز بند ہونے پر مازہ چونک گئی۔

”کیا ہوا؟“ بجاؤ نا..... تم کتنی اچھی دھن  
بجا رہے تھے۔“ مازہ نے تعریف کی۔

”تم نے یہ گانا کہاں سنا؟“ احسن نے  
پوچھا۔

”کون سا گانا؟“

”وہی جو تم ابھی گار ہی تھیں؟“

”یہ..... تو میں نے خواب میں سنا تھا.....

ایک لڑکا اپنے گھر کے لان میں بیٹھا گٹار کے  
ساتھ یہ گانا گا رہا تھا..... مجھے بہت اچھا لگا اور  
میں نے دھن میں محفوظ ہو گیا ابھی تم نے دھن  
بائی تو اچانک میرے لبوں پر آگیا۔“

”لعل..... لیکن..... میں نے تو کسی کے

گانا یہ گانا نہیں گایا..... یہ تو میں نے ابھی بنایا  
ہے.....“ مازہ نے حیرت سے

”تم نہیں جانتے..... تم کسی کو سنا چکے ہو۔“

”میرے سے بولی اور احسن اسے بے یقینی  
.....“

”یہ ایک نئی کیئر کی طرح ہی تو ہوتا ہے جہاں

.....“ مازہ نے کہا۔

”ماری.....“ تیلیاں بھی تیلیاں ہی تو ہوتی ہیں

ہم جتنا ان کے پیچھے بھاگتے ہیں یہ اتنی ہی ہم سے  
دور ہو جاتی ہیں لیکن اگر ہم ان کی طرف سے اپنا  
دھیان ہٹائیں تو وہ کسی نئی کیئر کی طرح ہمارے لان  
کی رینگ پر آ بیٹھی ہیں۔“

”لان کی رینگ پر؟“ احسن نے حیرت سے  
دہرایا وہ بے یقینی سے مازہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں لان کی رینگ پر..... بارش کے  
دوران..... چاہے ان کے پروں پر سے سارے

سنہری اور نقرئی رنگ پانی میں مل کر بہہ  
جائیں..... وہ دیوانی ہوتی ہیں..... اپنے اسار کی  
نکودیکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔“ مازہ جیسے

خواب میں بول رہی تھی۔

”کیا خواب بھی سچے ہوتے ہیں؟“ احسن

نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... اگر تمہیں ان کی سچائی پر یقین ہو

اور تم ان کے نظر آنے کا بے چینی سے انتظار کرو  
جیسے میں کرتی تھی۔“

”اوہ..... مازہ..... میں نہیں جانتا تھا کہ

ہمارے خواب ہمیں یوں ملو ادیں گے..... لیکن تم  
تو خواب میں ایک نئی کیئر ہوتی تھیں۔“ احسن نے

پیارے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ہاں اور پیار بھی تو تیلیوں کی طرح ہوتا ہے  
جہاں خوش ہوتا ہے اڑ کر وہیں پہنچ جاتا ہے۔“

مازہ نے اپنی بات دہرائی۔

”جیسے میں تم تک.....“ احسن نے اس کے  
چہرے پر ہنستے ہوئے کہا۔

تیلیاں قید تھیں مقدر کی  
اُن کو آزاد کر دیا میں نے

مازہ نے دھیرے سے کہا اور احسن نے اس  
کے ہونٹوں پر پیار کی مہر ثبت کر دی۔

لاہور سے ارسال کردہ قربانی کے جذبے کی حقیقت بیان کرتی تحریر

## نصیب

جوانان کے نصیب میں ہوتا ہے وہ اُسے مل کر ہی رہتا

ہے..... چاہے دولت ہو عزت اور شہرت ہو یا پھر رشتے.....

ہاجرہ عمران خان

اشفاق صاحب کے گھر میں یہ سالوں سے ہوتا

آ رہا تھا، ہر سال چاند رات پر بقرہ عید پر ایک یا دو بکرے گھر کے پچھلے دالان میں باندھ دیے جاتے اور انہیں اگلے روز صبح سویرے سنت ابراہیمی کی بجا آوری کے طور پر قربان کر دیا جاتا۔

ارقم نے جب سے ہوش سنبھالا اس رسم کا نام قربانی سنا تھا البتہ اصل قربانی کس چیز یا کا نام ہے وہ نہیں جانتا تھا۔

اس سال وہ اپنے مہی بابا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گاؤں جا رہا تھا تاکہ وہاں سے قربانی کا جانور لاسکے۔

”یہ کیا بات ہوئی کہ جانور لانا ہے مگر قربانی کیلئے؟“

ابا کے دماغ میں یہ کوئی نئی بات ہی نہ تھی اس کا نوجوان دماغ ہمہ تن سوچ میں گم رہا۔

ارقم کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا۔ اس نے حیرت اور گومگو میں لاہور سے گجرات تک کا سفر کیا جس کے ایک چھوٹے سے علاقے

”اب جاتا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اندازے لگانا۔“

”بیچاری چھنو کے دن تھوڑے گتے ہیں، ہر وقت سنت ہی ایک جگہ بیٹھی رہتی ہے۔“ ماہ نور کی بے بسی دیکھی وہ بھی بکری کو چھنو کہنے لگا تھا۔

ایک روز آدھی رات کو ارقم کو عجیب بے چینی محسوس ہوئی تو وہ بستر سے نکل کر دالان میں آ گیا۔

گھر کے سارے مرد بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔

ماہ نور بے چینی سے دالان میں چکر کاٹ رہی تھی اور اندر طیلے سے چھنو کے تکلیف میں ڈکرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ارقم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے طیلے کی طرف بڑھنا چاہا مگر ماہ نور نے

اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دالان کے دوسری طرف لے جا کر چھوڑا۔

”ادھر مت جاؤ ارقم.....“ وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ تذبذب کا شکار ہے بنانا چاہتی ہے مگر بتا نہیں سکتی۔ ارقم اتنی ہی عمر میں بھجک اور حجاب نہیں سمجھتا تھا۔

اسے شہر کی عادت تھی، وہ تو دھڑلے سے ہر بات کہہ سن لینے کا عادی تھا۔ البتہ اپنے ہاتھ پر





جہاں ماہ نور کے ہاتھ کالس جاوداں تھا وہاں وہ اپنا ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔

”ماہ نور، ایک طرف تو تم چھنو سے اتنی محبت دکھاتی ہو اور دوسری طرف جب وہ اتنی تکلیف میں کر رہی ہے تو بے حس بن کر کھڑی ہو، تم کچھ کرنی کیوں نہیں ہو؟“ وہ سنا سوچ رہا تھا۔

”میں ادھر نہیں جاسکتی..... جھلا۔“

وہ جھنجھلائی، جیسے اپنی بات سمجھانہ کئے پر الجھ سی گئی ہو۔

”ویسے بھی ادھر چھنو کے پاس سب ہیں۔ ماں، مامی اور تائی..... اور انہوں نے بچوں کو ادھر آنے سے منع کیا ہے۔“ ماہ نور نے ایک بار پھر ارم کو سمجھانے کی اپنی سی سی کی۔

دالان کے کونے میں لگے بڑے سے بلب سے چمن کرائی زرد روشنی دونوں کے وجود روشن کر رہی تھی۔ ارم کے کانوں سے ابھی تک چھنو کی درد بھری کراہیں نکل رہی تھیں۔

”پھر تو ہمیں ابا کو جگانا چاہیے۔ میری تیری ماں اور مامی کون سی ڈاکٹر لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں چھنو کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانا پڑے گا یا ڈاکٹر ڈاکٹر گھر بلانا پڑے گا۔“ وہ مڑ مڑ کر دالان کی طرف دیکھتا۔

اس کی نظر میں ماہ نور اور گھر کی عورتوں کی عقل ماری گئی تھی۔ اس نے تیزی سے اندر کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ماہ نور ابھی تک اپنا مدعا سمجھانے میں ناکامی پر ہاتھ مسل رہی تھی۔ ایک دم سے ہی اسی لمحے طویل کے اندر سے خوشی کی چمکائیں بلند ہوئیں۔

”مبارک ہو، پورے چار بکروٹے تولد ہوئے ہیں، دو نیانیاں، دو نیانے (دو نر اور دو مادہ)۔“

ماہ نور اس کا راستہ چھوڑ کر طویل کے قریب جا کر کان لگا کر سننے لگی۔

ارم کے پاؤں جیسے تھم سے گئے اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں ماہ نور کو دیکھا اور پھر طویل سے اٹھتی چمکائوں کی سمت دیکھا۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح بے حد کھری اور تازی تھی۔ بقیہ رات وہ اپنی ناگہی پر شرمندہ ہوتا رہا تھا۔ چھنو کا بھری بھری دکھیاں اور مصحح وجود دیکھ کر ہی اسے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ چھنو ماں کے عہدے پر فائز ہونے والی ہے۔ سب سے زیادہ انیسیر سمٹ اسے اپنی اور ماہ نور کی رات ہونے والی گفتگو پر تھی۔

ماہ نور کی اسے سمجھانے کی کوشش اور اس کی نا سمجھی کی باتیں..... اسے یاد آتا تو وہ خود بخود مسکرانے لگتا۔ اس وقت وہ چھنو کی کھری کے پاس اسے پیار سے ساتھ لیٹا رہی تھی۔

چار پانی پر گیدہ بچھا کر چھنو کا سر گود میں لیے اس کا سر سہلا رہی تھی۔ وہ قریب آیا تو اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی آہستگی سے چھنو کو خود سے الگ کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی کہ کہیں چھنو کی نیند خراب نہ ہو۔

ارم کا ہاتھ پکڑے طویل میں لے آئی۔ وہاں چھنو کے چار تازہ نومولود، ننھی مٹی چوڑیاں بھرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ دو بالکل کالے جن پر اکا دکا سفید دھبے پڑے تھے۔ ایک بالکل سفید دھنگی ہوئی روئی کے گالوں جیسا جبکہ چوتھا آدھا کالا آدھا سفید۔

ماہ نور نے وہاں لا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ان سب کو ایک ساتھ اپنی گود میں بھرنے کی کوششوں میں مگن تھی مگر دو کے بعد ہی اس میں ناکام ہو جاتی پھر بھی کھٹکھٹاتی ہوئی ہنسی کے ساتھ وہ کتنی ہی دیر اس کوشش میں مصروف رہی۔

”تمہیں پتا ہے ان میں سے تین نیانے ہیں اور ایک نیانی..... یہ جو بالکل دودھ کی طرح سفید ہے نا یہ بکری ہے اور باقی تینوں بکرے۔“ وہ سبک خرام چھرنے کے بہاؤ جیسی ہنسی دیتی تھی۔

ارم دیکھی سے اس کا صحن چراد کھتا رہا پھر خود بھی اس کی طرح گھٹنوں کے بل اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا اور چھنو کے دو بچے اٹھا کر اپنی گود میں بھر لیے۔

”اب ٹھیک ہے؟ دو تمہارے دو میرے.....“

وہ شریر انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ماہ نور کے سرخ ہونٹ لرزے۔ چہرے پر سرخی سی چھا گئی۔

ارم کی آنکھیں اور لہجے کی تپش نے ماہ نور کے جسم و جاں کھلے کر رکھ دیا۔ شرم سے سر جھکا دیا۔ اس لمحے ارم کو لگا جیسے وہ کھیت میں اگی تازہ سلا د سبزی ہو..... کوری کوری اور کھری ہوئی لال مولی جیسی اور اس دن کے بعد ہر دن وہ اسے مختلف چیزوں میں دکھائی دیتی۔

جب چاچی بڑے سے مٹی کے مٹکے میں پڑی مدھانی کو دھاگے کی ڈوروں سے ہلا ہلا کر مٹھن در پافت کرتی تو وہ اسے مٹھن کے پیڑے میں نظر آئی۔ نرم اور گرم گرم سفید دودھیا۔ وہ تازہ ہوا کے لمس میں اسے محسوس کرتا اور بے ساختہ اس ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتا جس کو وہ اکثر بے ساختہ تھام لیتی تھی۔ وہ سر سبز کھری فصلوں میں اس کی اٹھان دیکھا کرتا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ محبت کی واردات دل پر محسوس کر رہا تھا۔

نیوب وبل کے پانی کی روانی دیکھ کر وہ اس کی پال پال کرنے لگتا۔ وہ اسے ”نیچرل“ لگتی تھی بالکل ندرتی سی۔

جیسی گاؤں کی فضا ہوتی ہے بالکل دیسی اور

نیچرل سی۔ جیسے وہ زمین میں اگی ہو یا فضا سے جنمی ہو۔ کچھ بھی تھا مگر وہ خالص تھی۔ مٹی کے ٹٹے جیسی جو ہنر دوشالہ میں لپٹا ہوتا ہے۔

وہ بھی اپنی شرم، حجاب اور جھجک کے دوشالہ میں لپٹی ہوئی سی رہتی۔

جس وقت وہ گاؤں سے بڑے جانور لیکر قربانی کے لیے شہر جا رہے تھے بابائے پچا سے کہا۔

”چھنو کے دو بلوگڑے میری امانت ہیں تیرے پاس اور ساتھ ہی دھی رانی ماہ نور بھی۔ دو سال بعد اپنی امانتیں لینے آؤں گا۔“ ارم اس خیال سے ہی شاد رہنے لگا کہ دو سال بعد ماہ نور کو بھی لے آئیں گے اور چھنو کے بکروٹوں کو بھی۔

وہ واقعی جھٹلا تھا۔ بقرہ عید آئی اور گزر گئی۔ گاؤں سے لایا جانور قربان کر دیا گیا۔ اس کے لیے یہ سب روٹین تھی۔ وہ کہاں جانتا تھا قربانی کا اصل مطلب۔۔۔۔۔؟ قربانی جب تک دل و جاں سے گزر کر ادا نہ کی جائے اپنا مفہوم واضح نہیں کرتی۔ وہ خوش تھا دو سال بعد ماہ نور شہر کی ہو جاتی۔

وہ ہمیشہ کیلئے شہر آنے والی تھی۔ وہ ہر روز اسے دیکھ سکیگا۔ محسوس کر سکے گا۔ وہ شہر آ جائے گی تو ایسا لگے گا جیسے پورا گاؤں ہجرت کر کے شہر آ بسا ہو۔ وہ لمحہ لمحہ گمن کر کا شہر ہا۔ دو سال بعد تو نہیں تین سال بعد جب وہ انیس اور اس کا بھائی..... نکیس سال کا ہوا اور ماہ نور سولہ سال کی ہوئی تو بقرہ عید سے کچھ روز قبل پچا اپنے خاندان سمیت ان کے ہاں آئے۔

ماہ نور ویسی ہی تھی ”نیچرل“ سی مگر اب وہ قدرت کا شاہکار ہو گئی تھی۔ دراز قد، مست خرام جال، لمبی جیسی دودھیا رنگت اس پر نین نقش جیسے میٹھی لمبی پر مٹھن کے تیرتے ٹکڑے۔ وہ اسے دیکھ کر مبہوت ہوا تھا۔ ہر وقت چھنو کے شانوں بانو کے جو

57

تین تین سال کے ہو چکے تھے اور قربانی کے لیے شہر لائے گئے تھے، پیچھے لگی رہتی اپنے آپ اور ارد گرد سے بے نیازی۔

ارتم کو اب وہ اپنی کتابوں کے صفحات پر متحرک سی نظر آتی اور کبھی چلتی موٹر سائیکل پر اس کے کاندھوں پر بیٹھانی ٹکائے بیٹھی محسوس ہوتی۔ وہ اسے اور خود کو ساگ، بکھن کی نظر سے دیکھتا آپس میں کھل کر سیکان ہو جائیں تو مکھن کا بس ذائقہ باقی رہ جاتا ہے۔

ارتم کی خوش گمانی تب ٹوٹی جب ماہ نور کو اس کے بڑے بھائی باقر کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ عید کے بعد دونوں کا نکاح ٹھہرا دیا گیا۔ چھن کر کے سارے خواب چکنا چور ہوئے تھے۔ اس کے آنکھوں میں خوابوں کا خون اٹھل پھل کرتا رہتا۔ اس نے ماہ نور کو اپنے علاوہ کسی کے ساتھ کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

مگر وہ سدا کی بے یو ٹھہری۔ عید آنے میں ابھی دس روز باقی تھے۔ ماہ نور شانوار اور بانو کے گلے میں بانہوں کا ہار ڈالے اداس سی بیٹھی رہتی۔ دونوں اب مکمل بکرے بن چکے تھے۔

اچھی دیکھ بھال سے دونوں کی صحت بھی قابل رشک ہو چکی تھی۔ ماہ نور اداس دل کے ساتھ دن رات شانوار اور بانو کی خدمت میں حاضر رہتی۔ وہ اس کی سیٹی کی آواز پہچانتے تھے۔ سیٹی کی آواز سن کر فوراً ہشاش بشاش ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے جیسے اس کے عوض انعام میں لڑکی ڈلی کے بجائے سونے کا نوالہ مل جائے گا۔ بلاشبہ ماہ نور کو وہ اسے جان سے پیارے تھے۔

مگر ارم کو وہ کچھ خاص اچھے نہیں لگتے تھے۔ ماہ نور عید قربان ہر ان دونوں کی قربانی کے خیال سے

کمزور اور چپ چاپ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی شرارتیں کہیں لمبی ہو چکی تھیں۔ جیسے مفت اقلیم کا خزانہ کھوجلی ہو۔ ارم سے ماہ نور کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ چاند پہلی تاریخوں سے بڑا اور روشن ہو رہا تھا ویسے ویسے ماہ نور کا دل جیسے کوئی مٹھی میں دبوج رہا تھا۔

چاند کو روز بروز روشن تر ہوتا دیکھ کر اس کی اپنی رنگت ماند پڑ رہی تھی۔ آٹھویں روز آنکھوں میں یاسیت سی بھر کر وہ شانوار بانو کو دیکھ رہی تھی جب ارم سے رہنا گیا وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

”اگر تم ان کی جدائی پر اتنی دھی ہو تو میں یہ قربانی روک دوں گا۔“

ارتم لہجے کی ترشی پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ماہ نور نے افسردہ سا سر اٹھا کر ارم کو دیکھا۔

”جب شانوار بانو پیدا ہوئے تھے اسی وقت تایا ابو نے ان کی قربانی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک بار جس چیز کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا سوچ لیا جائے پھر وہ چیز اس کی امانت ہوتی ہے اور امانت جتنی دیر مرضی اپنے پاس رکھ لیں اسے لوٹانا ہی پڑتا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہم ان کی جگہ بہتر اور بڑے جانور قربان کر دیں گے۔“

ارتم اپنی بات پڑنا رہا۔ وہ کسی صورت ماہ نور کو دیکھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”آپ کو پتا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیسے پتا چلایا کہ اللہ تعالیٰ نے خواب میں ان سے کس چیز کی قربانی مانگی ہے؟“ ماہ نور سر جھکائے پر غم لہجے میں بولی۔

”نہیں“ ارم نے اپنی اب تک کی زندگی میں کبھی اتنی باریکی سے مذہب اور اس سے متعلق چیزوں کو نہیں سوچا تھا اور نہ ہی ضرورت محسوس کی

اس کے بابا بچپن سے لیکر اب تک عید پر سادہ قربان کرتے آئے تھے۔ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

”یہ چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے بڑی شے اس کی قربانی مانگی گئی۔ تو انہوں نے اپنا پیارا بیٹا اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی ضمانتی اسی لیے ہمارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں رہا۔ اب تک ہم میں سے ہر ایک اپنی پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا حوصلہ پیدا نہ کر لے۔“

عید البقرہ تو ایک نشانی ہے جو ہمیں ہمیشہ اپنے رب کی طرف لوٹ جانے پر مائل کرنے آتی ہے۔ ہمیں اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کی سب سے عزیز شے اپنے مالک کی مرضی پر قربان کرنی پڑتی ہے۔ یہی عشق ہے۔ بازار سے جانور لا کر اللہ کی راہ میں قربان کر دینے سے قربانی کی رسم تو پوری ہو جاتی ہے مگر عشق کا امتحان ادھر رہا جاتا ہے میں بھی اس امتحان سے گزر رہی ہوں۔ اپنا حوصلہ آزمایا یہی اللہ سے اپنی محبت کی آزمائش کی پیمائش ہے۔ ان ہوں۔ اور آپ کو پتا ہے کہ اس قربانی کے بدلے اللہ ہمیں بہت بڑے انعام سے نوازتا ہے۔ اللہ ہماری قربانی کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔“

ارتم اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احکامات بلند کر دیے اور قیامت تک ہماری نمازوں کا پابندی علیہ السلام کا ذکر لازم و ملزوم کر دیا۔ اللہ اپنی راہ میں قربانی کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ وہ اپنے قربانی کو ہوتی تھی۔

”تو پھر تم اتنی معصوم کیوں ہو؟“ ارم نے ہاتھ باندھ کر پوچھا۔ وہ قربانی کے اس فلسفے سے متاثر ہوا تھا۔ ایک چیز آپ کو پسند ہے پھر اسے جدا کر دینے سے بڑی سزا کیا جاتی ہے۔ وہ سمجھ نہیں پاتا تھا۔

”اپنے افسردہ ہونے پر مجھے اختیار نہیں۔ مگر قربانی کی اس راہ پر آپ میرے قدم ڈگمگاتے نہیں دیکھیں گے۔ بابا نے پچھلے سال ہی شانوار اور بانو کو یہاں شہر بھیجے کا ارادہ کر لیا تھا مگر مجھے افسردہ دیکھ کر ایک سال مزید انتظار کا فیصلہ کر لیا۔ اس سال بھی شاید میں ہمت جتنا نہ سکتی مگر پھر حوصلہ کر ہی لیا۔ کہ اگر دیر کر دی تو کہیں میری نیت میں فتور نہ بھر جائے۔ کبھی کبھی خود کو بھی آزمائش کی کسوٹی پر رکھنا پڑتا ہے۔“

بقر عید پر قربانی سے پہلے اور بعد میں بھی وہ نہ روئی اور نہ ہی شور کیا۔ اس نے بڑے صبر سے شانوار اور بانو کو اپنے رب ذوالجلال کے حضور قربان کیا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا مگر اب شانوار بانو کی جگہ خالی تھی۔ وقت پر چارہ کھلانے کی فکر تھی اور نہ پانی پلانے کا خیال۔ جس تسلے میں وہ انہیں پانی پلاتی تھی وہ سوکھا پڑا تھا۔ ارم کو محسوس ہوتا تھا جیسے سب کچھ ادھورا سا رہ گیا ہے۔

”کبھی ایک لمحہ وہ اس کے لیے بھی اداس ہو؟“ ارم کا دل چاہتا مگر وہ جیسی بے نیاز آئی ویسی ہی واپس چلی گئی تھی۔ ارم کا دل بھی سخن میں لگے کھونٹے کی طرح خالی ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

دھان پان سی لڑکی کتنے آرام سے اسے قربانی کا فلسفہ سکھا رہی تھی۔ ذہنی طور پر وہ اس بات کو قبول نہیں کر سکا تھا مگر اس نے خود میں عجب تبدیلی دیکھی تھی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنے ارد گرد لوگوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنے لگا تھا۔ اس کا کلاس فیلو غریب تھا اسے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ تو ارم نے اسے اپنی سب سے قیمتی اور فیورٹ شرٹ گفٹ کر دی۔ کام والی ماسی کی بیٹی کی شادی میں اپنی پاکٹ منی سے مدد کی۔ وہ چپ چاپ خاموشی سے سرتاپا

# آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

ایسے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہو جائیے۔



یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے.....

نو دو کمونائیے، اپنے قلم سے.....

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہوں نے اور لڑاؤ نے

والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان

واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان

واقعات و حادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔

اگر آپ ایک سنوار کر اس کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔

تو پھر قلم اٹھائیے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز

نہ کہ کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمائیے۔

ماہنامہ سچی کہانیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تو یہ جینے کے لیے ہمارا چاہنا ہے

II C-88 - خیابان جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

بدل چکا تھا۔

اس کا بھائی اسے جان سے پیارا تھا۔ وہ اس کے لیے اتنی سی قربانی نہیں دے سکتا؟ اب وہ پورے دل سے چاہتا تھا کہ ماہ نور اس کے بھائی کی زندگی کا حصہ بن جائے۔ وہ پورے دل سے اس دن کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو اس کیفیت میں محسوس کیا جب ماہ نور شانوار یا نو کو عید قرباں پر قربان کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس وقت وہ خود کو مغموم ہونے سے نہیں بچا سکتی تھی اور آج اگر اپنے دل کو افسردہ ہونے سے روک نہیں پارہا تھا۔ وہ تیار تھا، اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اپنے بھائی کے نام کر دینے کو۔ برضا... بخوش... ہستے ہستے۔ اسے قربانی دینے کا ڈھنگ آچکا تھا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ باقر نے تعلیم مکمل کرنے کے لیے دو سال کا عرصہ مانگا تھا۔ جو کہ اب ختم ہو رہا تھا۔ چچا چچی زیادہ دیر تک بیٹی کو گھر نہیں بٹھا سکتے تھے۔ وہاں رواج تھا بیٹیوں کو جلد از جلد پیادیں سدھارنے کا۔ مگر جیسے جیسے شادی کا وقت قریب آ رہا تھا باقر کے ہوش اڑ رہے تھے۔ پھر ایک روز اچانک وہ اپنے ساتھ اپنی کلاس فیلو شہینا کو لیکر گھر آ گیا۔ وہ شہینا سے شادی کا وعدہ کر چکا تھا۔ وہ اس کی پسند تھی۔

ماں باپ پر قیامت ٹوٹی بہت سمجھایا، زور دیا مگر اولاد کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے۔ باقر سے ماپوس ہو کر باپ نے ارٹم کے سامنے دست سوال رکھ چھوڑا۔ وہ کب انکار کر سکتا تھا جب قدرت سب کچھ ٹھیک کر رہی تھی تو اسے کیا ضرورت تھی بگاڑ پیدا کرنے کی۔

رب اپنے بندوں سے اتنا پیار کرتا ہے کہ اپنے بندوں کے لیے دی گئی قربانی پر بھی خوش ہوتا ہے۔

اور اسے رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ سچ کہا ہے کہ رب کو راضی کرنا ہو تو اس کے بندوں کو راضی کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ رب بندے کا خود پر کیا مان کبھی نہیں توڑتا۔ ارٹم نے سجدہ و شکر بجالا کر اس میں سوچا۔

آج وہ اس کی زندگی میں شریک حیات حیثیت سے شامل ہو کر اس کے سامنے تھی۔ اتنی معصوم اور پور پور اس کی محبت میں بھیگی ہوئی سی۔ "پھنو کو اللہ نے پھر سے دو نیاں اور دو نیاں دی ہیں۔ میں نے ان کا نام شائو یاٹو۔ شادو اور باڈو رکھا ہے۔" ماہ نور خوشی سے بتا رہی تھی۔ ارٹم کا کھلتا ہوا چہرہ ادیکھ رہا تھا۔۔۔

"تم نے سچ کہا تھا... اللہ اپنی راہ میں قربان کی گئی نعمتوں کا بڑا اجر اور بدلہ دیتا ہے" سرشار اعتراف کیا۔

"ہے نا؟ جیسے مجھے نئے شائو، باڈو دیکر اللہ نے کرم کر دیا" لیکن بنی وہ وہو رشوق سے پوچھتی اور دل میں اتنی محسوس ہوئی

"اس کا جواب تو میرے سامنے بیٹھا ہے" ارٹم نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے سرشار لہجے میں کہا "کیا مطلب؟" اس نے آنکھیں پٹیٹائیں وہ بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ بیٹھا۔ "اپنی اداؤں سے کیا آج ہی مارڈالوگی؟ میں تو قطرہ قطرہ زندگی بس اپنے بدن میں اتارنا چاہتا ہوں تاکہ مکمل سکوں" وہ شوخ ہوا۔

"کیا؟" وہ تانجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ساری عمر بڑی ہے سمجھانے کے لیے" شوخ ہوا

زندگی ان کی ٹوک جھوک پر کھلکھلا کر مسکرائی گئی۔

☆☆.....☆☆



اسلام آباد سے ارسال کردہ انتہائی مزاحیہ تحریر

## بہو کی کتھا

ساس کے ظلم اور سسرال کے

کاموں نے بے چاری کو ادھ موا کر دیا تھا

عظمیٰ شکور

میں اُن دنوں ایف اے میں تھی جب گھر میں میری شادی کے متعلق خبریں اڑنی اڑنی مجھے ملیں! اک لمحے کو حیرت ہوئی، کیونکہ مجھے تو ابھی بہت آگے پڑھنا تھا بلکہ بہت بہت پڑھنا تھا۔ ”یہ شادی..... اُف“ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اگلے دن کالج میں بھی بوریت رہی سارا دن شادی کی بات ذہن میں گھومتی رہی۔ میری دوست ماہا بولی۔ ”یار شکر کر تیری شادی ہو رہی ہے جان چھوٹ جائے گی پڑھائی سے.....“ ”حد ہے ماہا ویسے تم ایسا سوچتی ہو ڈفر.....“ مجھے اُس کی اس بات پر غصہ آ گیا۔ اور پھر اگلے چند روز بعد ہی مجھے فراز کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔ کچھ عجیب سا احساس تھا یہ نہیں کچھ الگ سا لگ رہا تھا۔ میں نے تو انہیں دیکھا تک نہ تھا جس سے مجھے منسوب کر دیا گیا تھا اُن کی تصویر دکھائی تھی باجی نے.....

گزرتے دنوں میں وہ کچھ اپنے سے لگنے لگے تھے..... اور پھر چند مہینوں میں میں نے ایف اے کے پیپر ز دے دیے۔ ادھر فراز صاحب کی اماں میری یاد تازے لگی۔ ”اُف اس قدر محبت ساس صاحبہ کی..... وار جاواں.....“ ”بولتیں ہیں چاند کی چودہ تاریخ دے دو شاہ کی اور منہ تو میٹھا کر کے ہی جاؤں گی۔ اب اُن کون سمجھائے کہ اس موٹاپے میں مٹھائی کھا لے سے جسم پر کیا بیٹے گی۔“ خیر اب تو جیسے تیار بیٹھے تھے بولے۔ ”بہن جیسے آپ کہو۔“ سر صاحب تو جیسے وقت منہ میں الا بجی دپائے رہتے تھے..... کئی گمان گزرا گویا کہ قوت گویا کی ہے محروم ہیں..... نہیں..... ساس صاحبہ بولنے کا موقع ہی کب دیتے کہ معصوم سر کچھ بولتے۔ ایک دیور اور ایک معصوم سی تند بھی ہمراہ تھے شادی کی تاریخ لینے کو..... مطلب مجھے عمر قید سنا دی گئی تھی..... شادی

”اُف تھر ڈائیر میں جانے کا خواب‘ خواب ہی رہ گیا۔“

میرے ارمان دل کے دل میں ہی رہ گئے۔

آنسو بھائی چاند کی چودہ کو..... چودہویں کا چاند بن کر فراز کے آنگن میں اتر آئی۔

مختیوں کا ایک بستا سمندر تھا میرے گرد.....

ساس نظر اُتار رہی تھیں اور فراز نظروں ہی نظروں

میں دل میں اُتارے جا رہے تھے۔ دیور پھولوں

کے گل دستے لیے مسکرا رہا تھا۔ اور نیند اتر اتر کر اپنی

سہیلیوں سے میرا تعارف کروا رہی تھی۔

”دیکھو تو میری چاندی بھابی.....“

”مر نہ جاؤں کہیں.....“ دل نے سرگوشی کی۔

”ارے نہیں مجھے جینا ہے..... بہت جینا ہے.....“ خود کو سمجھایا میں نے..... دوسن کے لہنگے



سمیت مجھے سمیٹ ساٹ کر پھولوں سے لدے کمرے میں پہنچا دیا۔۔۔۔۔ دل اس پر دھڑکا کہ قیامت کردی۔۔۔۔۔ جیسے پسلیوں سے باہر نکلنے کو بے چین ہو۔

کچھ عجیب سے احساسات لیے میں محترم جناب فراز صاحب کا انتظار کرنے لگی۔ دھڑکنوں کو سکون کا مشورہ دے کر میں چپ چاپ بیٹھ گئی۔ دروازے کی آہٹ پر جو نظریں اٹھائیں تو محترم خراماں خراماں اندر آتے دکھائی دیے۔ کالی شیروانی میں بالکل قائد اعظم دکھتے تھے۔۔۔۔۔ بارعب سے مگر آنکھوں میں شرارت نے انہیں عمران ہاشمی بنادیا تھا۔

خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے نکل کر ماتھے پر پسینے سے چپکنے لگے۔ بیڈ پر براہمان ہوئے جیسے کوئی جلے سے خطاب کرنا ہو چکا ایسے ہی گلہ کنکار کر بولے۔

”آداب۔۔۔۔۔“

اور پھر جو امن نامہ انہوں نے پیش کیا مت پوچھیں۔

”میری اماں کی عزت کرنا آپ وہ بہت اچھی ہیں آپ کو بہت چاہتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔“

”اپنے بھائی بہنوں کی تعریفوں کے پل ہائے ربا کٹھے جاواں میں۔۔۔۔۔“

اچھا تو مجھے خادمہ بن کر یہاں رہنا ہوگا تو اسے کہتے ہیں شادی اوہو اب بھی میں۔۔۔۔۔ میں سوچ رہی تھی جس وقت رومانگ ماحول خواب محبتیں چاہتیں جیسے وقت نے سب بدل دیا تھا مگر۔۔۔۔۔

ہائے بس چند دن۔۔۔۔۔

ایک صبح ساس صاحبہ۔۔۔۔۔ کمرے میں تشریف لائیں۔

آنکھوں میں چپکنے والی محبت کی جگہ آج شعلہ

برساتی آنکھیں میرے وجود کے آبر پار ہو رہی تھیں۔

”بہو۔۔۔۔۔“ جیسے کوئی اپنی رعایا کو پکارے۔

”جی۔۔۔۔۔“ میں نے اپنا سر یوں جھکا یا جیسے کوئی کنیز حکم بجالانے کو تیار ہو۔

”بہت ہو گئے عیش و آرام گھر کی ذمہ داریاں سنبھالو اب۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔“ جی جی۔۔۔۔۔“

”کیا جی جی لگا رکھی ہے۔“ وہ گرجیں۔۔۔۔۔ جبکہ آسمان تو صبح صاف تھا اب جانے کیا ہوا۔

”جو حکم امی جی۔۔۔۔۔“ میں اس قدر ہی کہہ سکی کا پتے کا پتے۔۔۔۔۔

”نیچے آؤ اور ناشتہ بناؤ۔۔۔۔۔ سورج سر پر آ گیا اور مہارانی کی آنکھیں ہی نہیں کھلتیں۔“ وہ بولیں۔

ادھر میری جان کانپ کانپ کر پرواز ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے وہ کینیں تو سانس بحال ہوئے۔

”اُف اللہ۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔ یہ شادی۔۔۔۔۔ او اچھا۔۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ میں نے شیم آراء کی طرح کانٹوں پر ہاتھ رکھے اور چلانے لگی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“

سرتاج نے جو میری یہ حالت دیکھی تو لمحہ بھر پریشان ہوئے مگر اگلے ہی لمحے اماں کی آواز انہیں اپنی طرف متوجہ کر گئی۔

”فراز نیچے آؤ کب تک بیوی کے بغل میں گھسے رہو گے۔ حد ہو گئی بس کرو اب چھٹیاں کام جاؤ۔“ ساس بولیں۔

”جی اماں جان آیا۔“ فراز بولے۔

ایسے بھاگے ہیں جیسے کوئی نیا آئین پاس ہے اور سائن کرنے کو جانا ہے۔

ماتھے پر ہاتھ مار کر میں وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔

”مگر کہاں۔۔۔۔۔“ ڈیڑھ سا سماں پھر چلائیں۔

”بہو کیا تمہیں فوج لینے آئے گی جلدی آؤ۔“

”جو حکم۔۔۔۔۔ جی بہتر۔۔۔۔۔ بس آ گئی۔“

الٹا ہٹ میں جانے میں کیا کیا بول گئی۔

”فراز میں کہہ دیتی ہوں کل سے اپنی لاڈلی کو جھا دینا کہ صبح کا ناشتہ وہ بنائے۔۔۔۔۔ اور باقی گھر

کا کاموں میں بھی ہاتھ بٹائے۔ ارے ماہ نور

لے پہر زہونے کو ہیں بچی پڑھ نہیں پاتی۔ گھر کے

کاموں کی زیادتی کی وجہ سے۔۔۔۔۔“ اماں جی نے

”اگرچہ ہاڑی۔۔۔۔۔“

میں دم بخود سنتی چلی گئی۔ اور جب میں پڑھنا

پاؤں کی تھی جب ساسو ماں کو خیال نہ آیا۔۔۔۔۔ اب خود

لی بٹی کو پیر پڑھانے چلی ہیں اندر ہی اندر بیچ و

”اب کھا رہی تھی۔ اتنے میں فراز ناشتے کی ٹیبل سے

انہر اٹھڑے ہوئے۔ شاید ناشتے کا فرض ادا کر چکے

تھے اور میں اُس وقت سے ہولن بنی سب کے منہ

باز رہی تھی۔

میرے منہ پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر ساس گویا

”اب۔۔۔۔۔“

”سب برتن سمیٹ لو اور ماسی سے دھلو اور

”ابا اب کپ چائے میرے کمرے میں لے آنا۔“

”اٹھتے ہوئے بولیں۔

”جی جی۔۔۔۔۔“ میں سر ہلاتے ہوئے

”ان کتھے جاواں۔۔۔۔۔“ میں اُلجھی گئی۔ اتنے

”کام اور میں اکیلی جان ہائے اور با۔۔۔۔۔“

”ناؤڑکی۔۔۔۔۔“ اماں جان پیچھے کو مڑیں۔

”ابا کہہ دو دو پہر کے لیے کھانا بھی چڑھا دینا

”بہو اڑے رکھے ہیں۔ کھانا بنانے کے بعد وہ

”پودوں کو پانی دینا نہ بھولنا کیسے کلا گئے

”وہ کہے جاری تھیں اور میری کلمات کی

صورت انہیں نہ دکھی تھی۔

آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ہتھیلی سے رگڑ

رگڑ کر صاف کیا اور کچن کی طرف چل دی۔

اتنے کام کرتی تو میں فوت ہی ہو جاؤں گی۔۔۔۔۔

اور اچانک سے ہی خالہ اماں کا چہرہ میری نظروں

میں گھوم گیا ہائے کس قدر خوفناک لگ رہی تھیں وہ

مرنے کے بعد۔۔۔۔۔ نہیں نہیں مجھے نہیں مرنا۔۔۔۔۔

سوچتے سوچتے چکر لگی اور زمین پر آ رہی مگر جانے

فراز وہاں کیسے پہنچ گئے اور اگلے ہی لمحے میں اُن کی

ہاتھوں میں جھول گئی۔

”ہائے مجھے ہوش میں نہیں آنا۔۔۔۔۔“

فراز مجھ پر جھکے بولے جارہے تھے۔

”ٹوٹی۔۔۔۔۔ ٹوٹی ہوش میں آؤ ہوا کیا۔۔۔۔۔

ٹوٹی۔۔۔۔۔“

اور اُن کی ہتھیلی آواز کے سحر میں گم میں ہواؤں

میں اڑ رہی تھی دل ضد کیے جاتا تھا کہ یہ لمحے ختم

جائیں۔

اور جیسے ہی ساس کی غصیلی آواز کانوں میں

پڑی میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

”اے لڑکی اگر محبتوں کے سب سین کھلے عام

ہو چکے ہوں تو گھر کے کام کی طرف بھی توجہ دیں۔“

وہ بولیں۔

فراز نے مجھے خود سے یوں الگ کیا کہ جیسے

مجھے کہیں سے بھگا کر لائے ہوں۔۔۔۔۔ حد ہے

ویسے۔۔۔۔۔ اب ایسا بھی کیا ڈرنا ماں سے۔۔۔۔۔ کہ

بیوی کو نہ چپکائیں خود کے ساتھ۔۔۔۔۔ اب کیا وہ مجھے

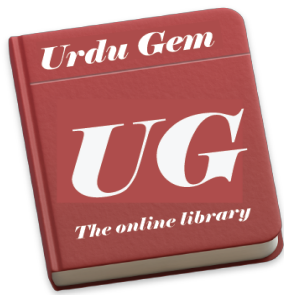
نسلی بھی نہ دیتے۔۔۔۔۔ بس مجھے نہیں پتہ۔۔۔۔۔ میں

سوچے جاتی اور ساتھ ساتھ کام بننا رہی تھی۔

اور پھر تو جیسے یہ روزمرہ کے کام عادت ہی بن گئے۔

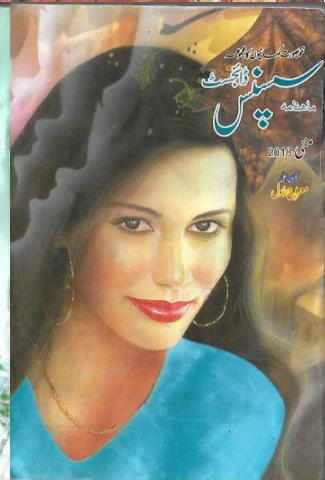
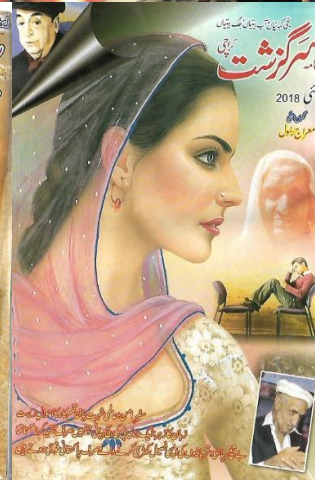
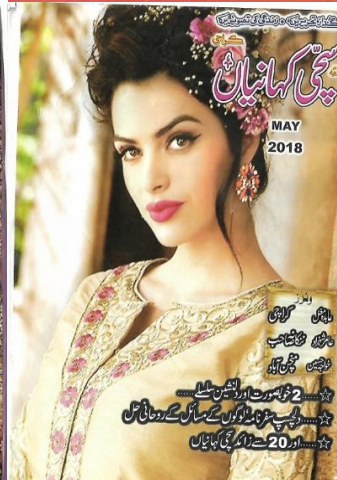
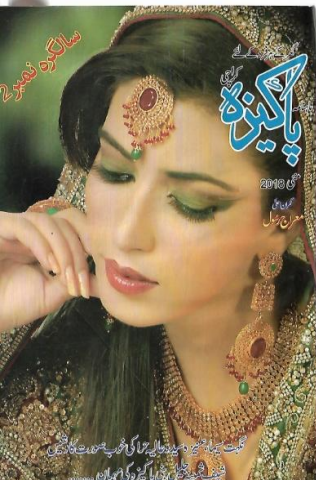
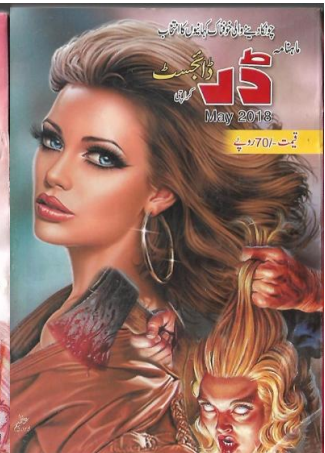
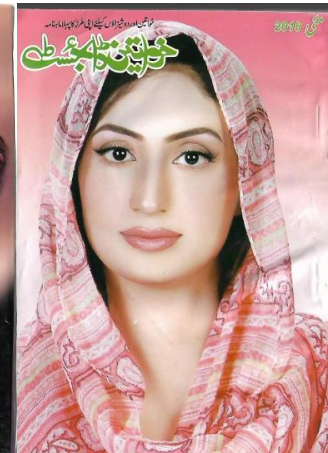
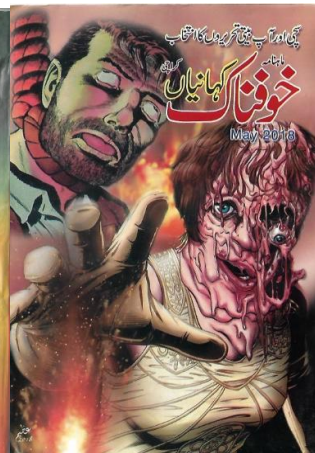
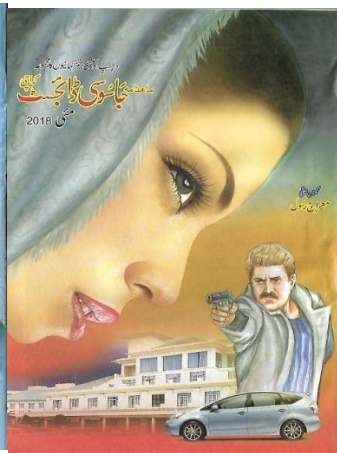
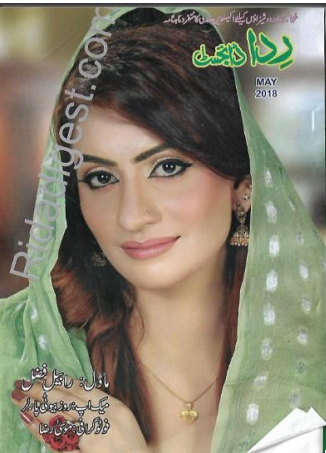
ہاں مگر کبھی کبھی فراز پریشان کرتے کہ میں





# UrduGem.com

## URDU KA KHAZAANA





انہیں ماتم نہیں دیتی مگر پھر میں انہیں ماں کی عظمت پر لمبی تقریر سناؤ تو مسکرا کر لگتے اور پیار سے کہتے۔

اوسمان خطا کر دیے۔

... میں مسکراہٹ دباتے ہوئے بولے۔

دن بھر کے کام تھا کا کے رکھ دیتے ہیں مگر پھر بھی سب کرنا پڑتا ہے ماسی ہوں میں ماسی..... میں غصے میں سوچتے ہوئے سو گئی۔

## تعارف

### فریدہ جاوید فری

پیاری منزہ سہام میں اپنا تعارف بھیج رہی ہوں بچپن ہی سے مجھے مطالعہ کا شوق تھا۔ بچوں کی کتابیں شوق سے پڑھتی تھی کچی کہانیاں کی دیوانی



ہوں بہت عرصے سے اس کو پڑھ رہی ہوں کہا صرف ایک خالہ خیرن ہی لکھی ہے مگر شاعری شائع ہوئی ہے شادی جلدی ہوگئی صرف اے کر سکی پہلے بچے چھوٹے جب ذرا بڑے ہوئے تو رساں لکھنا شروع کیا۔ کچی کہانیاں، دو شیرہ، پاکیزہ، آ اور ریشم میں بہت لکھا اور لکھ رہی ہوں شاعری خداداد صلاحیت ہے مگر میں نے نامور شعراء اصلاح لی ہے راشد ترین اور محمود ارشد صاحب نے میرے شاعری کی اصلاح کی ہے میرے مجموعے شاعری شائع ہوئے پانچواں موسم اور محبت یاد رکھوں دو دنوں مجموعوں کو بہت پذیرائی منزہ سہام اور پاکیزہ کی ایڈیٹر انصار آجیل کے فرحت آراء

طاہر بھائی صاحب، ریشم کی ایڈیٹر بشری سہیلہ ان سب کی بہت بڑی فین ہوں اللہ ان سب کو خوش رکھے آمین میرا ایک ناول بہار ہو جائے بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ ناول موسم کی پہلی بارش زیر طبع ہے۔ ان میں فیض احمد فیض، غالب، راشد ترین، ماجد آفتاب خاں اور ارشد محمود ارشد کی ان سے بے حد متاثر ہوں۔ رائٹرز میں عمیرہ، آصف، نرگس، جبین اور طیبہ غفر مغل، آصف، سنبل کمال اور عقیدہ حق اور سباس الی فری میں متاثر کرتی ہیں۔

پر پل، پنک ڈارک بیو پسند ہے۔ پرفیوم، الی ہوں خوشبوؤں میں بسا رہنا پسند ہے، انباریں، بارش، سردیاں اور کوہسار ملکہ مری لکھانے میں مثنیٰ پلاؤ اور نرگس کو فتنے لکھاتی ہوں پسندیدہ ہستی حضرت محمدؐ کی نماز کی پابند ہوں اللہ تعالیٰ منظور فرمائے سب ڈپریشن ہو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی اور انک ڈرائیو پر جاتی ہوں لکھنے میں میرا مال نہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔ مجھے دس ایوارڈ اور تین شوقیٹ ملے، ایوارڈ مجھے کھاریاں سے عبدالکلیم شرر ملا، اچی سے چار ریشم ڈائجسٹ سے اور آباد سے میرا پیغام سب کو یہی ہے کہ میں پیار محبت سے مل جل کر رہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی حفظ و امان میں رکھے میں سے تین بھائی ہیں ایک بھائی رائٹر، تین ہیں پرنس افضل شاہین جو کہ بہت ہیں اور بھائی پروین افضل جو کہ مجھے بہت

## پرتم مانویا نامانو

☆☆☆

گزرے دنوں کے ہر پہل میں

ہم نے تم کو پہلے سے زیادہ چاہا

ہم کو ہر وہ شے پیاری

جس سے تمہارا کچھ رشتہ تھا

ہم نے ان گزرے لمحوں میں

نہ صرف یہ..... کہ..... ان چیزوں سے

جن سے تم وابستہ رہی ہو

بلکہ ان چیزوں کی شہادت رکھنے والی

سب چیزوں سے

”خود سے بڑھ کر پیار کیا ہے“

اب خود سوچو

اب بھی کوئی ہم کو گر ”پاگل“ نہ کہے

تو اور کہے کیا؟

☆☆☆

وجہی ثانی

☆☆☆.....☆☆☆

## خناس

جب دماغوں میں خناس بھر جائے تو زمین تنگ ہو جاتی ہے اس کے دماغ میں بھی خناس تھا اسی لیے اس نے اپنی خوبصورتی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی.....

## حنائشری

جب عقل سوچ کی پاسبان نہ رہے تو انسانیت، درندگی اور حیوانیت کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے ہر باڑھلا نگ کر آ زاد ہو جاتی ہے اور ایسی منہ زور ہونے لگتی ہے کہ انسان کے دل سے مثبت پہلو چھین لیا جاتا ہے اور اُسے اُس کی منفی سوچ کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ.....

”جاؤ جو کرنا چاہتے ہو کرو تم آزاد ہو..... جہاں تک جاسکتے ہو جاؤ..... مگر ابی میں جتنا گر سکتے ہو گر جاؤ.....“ مگر پھر اُس کی حد شروع ہوتی ہے سزا دینے کی حد انصاف کرنے کی حد وہ اپنے معاملات میں مطلق العنانیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہر شے جتنی مرضی اکڑتی رہے مگر اُس مالک کے آگے جھک جاتی ہے۔ اور پھر اُس کی حد سے باہر نہیں نکل سکتی۔ وہ برداشت کرتا ہے اور کیا کمال برداشت کرتا ہے۔ اور پھر دیوچ لیتا ہے زندگی تماشہ بن جاتی ہے۔ نشانِ عبرت کے لیے تاکہ روحمیں کا نہیں دل لرزیں آنکھیں پھراں اور عقل سر تسلیم خم کرے۔ اُس قانون کے آگے

جس کا قانون آخر ہے۔ اُس کی حدود کو پار کر کے وہ انسانیت کی معراج سے گرے گا مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ انسانیت کی فہرست میں شامل کر دیا جائے گا۔ ہرگز نہیں..... قطعی نہیں..... بالکل نہیں..... وہ مردود قرار دیا جائے گا۔ انہیں ذلت و رسوائی کی علامت بنا دیا جائے گا کہ لوگ انہیں دیکھیں اُن کی نافرمانی سے نفرت کریں۔ اُن تھوکیں اور اُن پر لعن طعن کریں۔

میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ آپ سے کے لیے منفرد اور خاص الخاص موضوع ڈھونڈ کر لاؤں میں دعویٰ کرتی ہوں کہ اس بار کا موضوع آپ کو بالکل ایسے ہی چونکا کر رکھ دے گا جس طرح میں چونکی۔ حیرتوں کے سمندر میں ڈبو کر گا اور عقل کو ماؤف کر دے گا۔ حیرانی و پریشانی کسی آسیب کی طرح آپ کے پیچھے پڑ جائے گی جیسے میرے ساتھ ہوا.....

”عام رائے تو یہی ہے کہ اس دنیا میں انتہاؤں کو ہمیشہ مرد چھوٹا ہے حدود کو توڑتا ہے

اپنی ذاتی، بے حسی اور بے رحمی کی کھال پہن کر کسی دہندے کی طرح دندنا تا پھرتا ہے اور یہ باتیں غلط ہی نہیں..... جب خدائی کا دعویٰ ہوا تو مرد آگے ہٹا۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت نے دعویٰ کیا تو پہلی آواز مرد کی ہی تھی گو کہ تکلفی اور آخری حد تک پہنچا۔

بانا مرد کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی ذہن اُس کی انتہاؤں کے مادی ہو چکے ہیں۔ مگر یہی فتنہ گری اگر منصف نازک کی ذات پر پا کرے تو قلب خاموش نہیں رہتا۔ اعصاب سن ہو جاتے ہیں اور آنکھوں سے پریشانی و حیرانی عیاں ہونے لگتی ہے۔ ذہن چاہتے و نا چاہتے بھی ان حقائق پر تنظر کرنے لگتا ہے کہ آخر ایسی کیا افتاد ناگہانی ٹوٹ پڑی کہ بنت

حوا باغی و سرکش ہو گئی کہ مردوں کو بھی مات دے گئی۔

یونیورسٹی کی طرف سے سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ کے گروپ کو سروے سونا گیا۔ (Eye Witness) کے لیے کسی دارالامان یا نفسیاتی اسپتال کا وزٹ ضروری تھا۔ بہت سے اسٹوڈنٹس نے ٹائم کی بچت اور ان نفسیاتی مجرموں سے ملاقات سے بچنے کے لیے ٹیڑھا راستہ نکالا۔ ویسے بھی پاکستانی قوم کے لیے سینڈ وے نکالنا تو بانئیں ہاتھ کا کام ہے۔ انہوں نے فرضی سروے تیار کیے اور نہایت اطمینان سے حوالہ ڈیپارٹمنٹ کر کے بری الذمہ ہو گئے۔ مگر میری یہ پیچہ نہیں تھی۔ میں نے ارادہ کر رکھا تھا کہ صرف سچ کہانی





ہوگی۔ سواس عزم کے تحت شہر کے معروف نفسیاتی اسپتال جانا ہوا۔ میرا گروپ چونکہ چھ لڑکیوں پر مشتمل تھا اس لیے ہم نے زنانہ وارڈ کے لیے اجازت طلب کی۔ جو ہمیں مل گئی مگر احتیاطی تدابیر بھی بتائی گئیں کہ اگر کوئی مریض حملدار ہو تو فوراً گارڈ کی مدد طلب کی جائے۔ کیونکہ اس میں بہت سی خواتین سز یافتہ ہیں بس عدالت کی طرف سے علاج کے لیے داخل ہیں۔

میری ملاقات جس عورت سے کرائی گئی وہ تقریباً 35 سال کی تھی۔ بدحال میں بھی اُس کا حسن مخفی نہ تھا۔ گوری رنگت، کچھ بڑی بال، وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ کسی سنگ تراش کی تراشی ہوئی مورتی کا گمان ہونے لگتا تھا۔ خوبصورت آنکھوں کے نیچے حلقوں نے حسن چشم کو ماند تو کیا تھا مگر احساس ہوتا تھا کہ کبھی وہ آنکھیں جمیل جیسی گہری ہوں گی۔ میں اُس کے حسن سے اتنی متاثر تھی تو سوچے مردوں کے لیے اُس کا حسن کس قدر سحر انگیز ہوگا۔

”آپ کا نام؟“ متعدد بار سوال کرنے پر بھی جواب نہ دیا۔ وہ اپنی ہی دھن میں مگن تھی بھی اپنے گھونسلہ نما بالوں میں اپنی لمبی خردی انگلیاں گھسا کر شدت سے کھجانے لگتی۔ کبھی تالی بجا کر رونے لگتی تھی یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ مکمل مجنون نہیں تھی۔ مجھے اسپتال کے عملے سے یہ معلومات ملیں تھیں کہ وہ اس قابل تھی کہ اپنی کھانا سستی تھی مگر شاید وہ کسی اور ہی دنیا میں تھی۔ جو اس کا ہماری دنیا سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ میری آواز سن کر یوں خلاؤں میں گھور رہی تھی جیسے بہری ہو۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ مجھے اب اُس کی حالت پر رحم آ گیا تھا۔

بڑھایا تو اُس نے جلالی انداز میں جھٹک دیا۔ ”ہٹ..... دور ہٹ..... ورنہ مار ڈالوں گی تجھے بھی.....“ مجھے پہلے ہی مطلع کیا جا چکا تھا کہ وہ مریضہ قتل کے جرم میں سز یافتہ ہے اُس کی ذہنی حالت بہت ابتر تھی اس لیے اُسے علاج کے لیے یہاں لانا پڑا۔

”تجھے بھی مار ڈالوں گی۔“ وہ ابھی تک بڑبڑا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے درندگی و وحشت چمکنے لگی تو مجھے اُس سے خوف محسوس ہوا۔

”جس پتیں گی؟“ مجھے اُسے ٹریک پر لانا تھا۔ اور اس کے لیے سو تو کیا ہزار جتن بھی کرنا منظور تھے مجھے اُس کے کیس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

”ہاں..... ہاں.....!“ پٹری زدہ ہونٹ جو چند ثانیوں پہلے باہم ملے ہوئے تھے ان میں شکاف بڑا۔ وہ شدت سے چلائی اور ڈبہ میرے ہاتھ سے کھینچ کر اُس کو نوچنے کھسٹنے لگی۔ میں نے اسے الگا کر اُسے نہایت شائستگی سے دیا مگر میری شائستگی کو اُس کی جوانیت نے اٹھا کر دور مارا۔ وہ وحشیوں کی طرح ایک ہی سانس میں جوس پی گئی۔ اُس کی حرکات و سکنات میرے اوسان خطا کر گئی تھی۔ مجھے لگا میں نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ میں نے ایک نظر جوس کے ڈبے پر ڈالی۔ مجھے لگا کچھ دیر بعد میرا بھی یہی حال ہوگا کہ وہ مجھے بھی یوں بھنبھوڑ کر رکھ دے گی۔ اس تصور سے میرا وجود کپکپا گیا۔ میرے ارادے کمزور پڑنے لگے تو مجھے اپنا فیصلہ غلط لگا۔ وہ اسٹوڈنٹس شاید ٹھیک رہے تھے جنہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالا اور کام نپٹا کر یہ جاوہ جا.....

خوف بھرے خیالات نے دل پر قبضہ جمایا تو مارغ نے واپسی کے قصد کا عندیہ دے ڈالا۔ میں نے اپنا فولڈر بیک اور دیگر اشیاء سمیٹی اور جانے کی کئی کئی گھنٹوں اور فٹ پاتھ سے بھر پور آواز نے بے قدموں کو روک دیا۔

”اور جوس..... ہے تیرے پاس.....!“ اب اُس کے چہرے پر وحشت کی جگہ پھینکی سی طراہٹ تھی، کھٹکی ہوئی سی.....

”جی..... جی.....“ میں فوراً بولی۔ میں نے بیک میں ایک اضافی جوس رکھا ہوا تھا وہ نکال کر اُس کی جانب بڑھایا تو اُس نے ہاتھ سے میری طرف دھکیلا۔

”وہ لگانا..... وہ.....“ وہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

”کیا؟“ میں سنبھلی سے بولی۔

”وہ سفید پائپ..... لگا کر دے نا.....!“ وہ بولی۔

میں نے سرعت سے اسے الگا کر دیا تو وہ یوں پھینکی جیسے بہت دنوں بعد صحت بخش مشروب پیا۔ وہ میری طرف مسکرا کر دیکھنے لگی۔

”یوں جیسے وہ اپنے حواسوں میں لوٹ آئی.....“

مجھے لگا اب وہ بات کرنے کے قابل ہے۔

”آپ کا نام؟“

”نذر.....“

”آپ نے کس جرم میں سز پائی ہے۔“ میں نے موضوع کی طرف آئی۔

”قتل.....“ وہ کھوٹی کھوٹی نگاہوں سے چھت پینے لگی۔ اُس کے چہرے پر غضبناکی سی نظر آئی تو میرا دل اندیشوں میں گھرنے لگا۔

کر ادا ہوئے۔ اُس کی لہو رنگ آنکھیں اب میرے چہرے پر جمی تھیں۔

”اپنے ایک شوہر کے قتل.....“ وہ تنفر سے بولی۔

اُس نے ایک کہا تو میرا قلم رک سا گیا۔ اور حیرت دو چند ہو گئی۔

”ایک..... کک..... کیا مطلب؟“ میں خوف کے باوجود تجسس سے بولی۔

”بس ایک ہی مار سکی..... باقی تین حرام خور بیچ گئے۔“ وہ کسی بھیڑیے کی طرح دانت کچکا پکانے لگی جیسے کسی کو کچا چبائے گی۔

”کمینہ..... مارتا تھا مجھے..... گالیاں دیتا تھا..... بدکردار کہتا تھا..... جیسے میں زر خرید لونڈی ہوں مرد سب کچھ کرے تو ناجائز..... عورت کرے تو ناجائز.....“ اُس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں جاننے کے لیے بے تابی سے بولی۔

”پھر مار دیا کمینہ کو.....“ اُس نے نفرت سے کہتے ہوئے یوں ہاتھ جھاڑے جیسے بہت بڑا فریضہ انجام دیا ہو۔ گردن کو دائیں بائیں حرکت دے کر تھکاوٹ اتارنے لگی تو کبھی بالوں میں انگلیاں گھسا کر سر کھجانے لگتی۔ اُس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا یوں جیسے اُسے قتل پر کوئی ملال نہ ہو۔ شاید اُس کا شوہر بہت ظالم تھا جس کے ظلم سے تھک آ کر اُس نے اُسے مار ڈالا۔ میں نے سوچا مگر کہانی ابھی بھی میری نگاہوں سے مخفی تھی۔

اس منبوطہ الحواس عورت کے دو لفظوں نے میرا دماغ الجھا کر رکھ دیا تھا۔

لفظ ”ایک“ اور ”باقی تین حرام خور.....“

”تجھے پتہ ہے میں نے اُس موئے کو کیسے مارا

73

72

تھا؟“ یکا یک وہ راز دانہ انداز میں ہونٹوں کے ایک طرف اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی جیسے کوئی بڑی بریلنگ نیوز ہواس کے پاس.....  
”کیسے مارا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کمینہ رات کو سویا تو میں نے اُس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگادی۔ خبیث کو بچ نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا وہیں کتے کی موت مر گیا۔“ اتنا بہیمانہ طریقہ کسی کی جان لینے کا کہ میرے رونے سے کھڑے ہو گئے۔ ضرور وہ شخص کسی سنگین معاملے کی وجہ سے مارا گیا اور نہ عورت جو پیر کی دیوی ہے وہ کہاں اپنے مجازی خدا کو یوں قتل کرتی ہے۔ مجھے اُس عورت سے ہمدردی ہونے لگی۔ ویسے بھی معاشرے کا ٹریڈ بن گیا ہے کہ حقیقت جانے بغیر مرد کو ظالم قصائی اور عورت کو مظلوم بنت مظلوم قرار دے دیا جاتا ہے۔

”ایسی کیا بات ہوگئی تھی کہ حالات یوں سنگین رخ اختیار کر گئے۔“ وہ کلڑوں میں قصہ سنا کر پیری کو فٹ بڑھا رہی تھی مگر جبوری تھی وہ مریضہ تھی اُس پر سختی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”کمینہ میرا راز جان گیا تھا اور دھمکی دینے لگا تھا کہ باقی تینوں کو بھی میری اصلیت بتائے گا۔“ مختصر سا جواب دے کر حسب عادت اُس نے پھر سے بریک لگائی تو میں جھنجھلا سی گئی۔

”دیکھیں..... مجھے کھل کر ساری بات بتائیں مجھے آپ کی باتوں کی بالکل سمجھ نہیں آ رہی۔“ ضبط کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے میں نے محبت بھری درخواست کی تو اُس کے چہرے کا تناؤ نرم پڑ گیا اور رفتہ رفتہ وہ مکمل داستان سنانے کی طرف آ ہی گئی۔

”میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی مجھ سے بڑے تین بھائی تھے میرا باپ بہت حسن پرست تھا

مگر اُس نے غلط راستوں کا سہارا لینے کے بجائے چار شادیاں کر لیں..... اگر ایک بیوی مر جاتی یا طلاق لے لیتی تو وہ صبر سے نہ بیٹھتا بلکہ اُس کی جگہ ایک اور شادی رچا لیتا..... میں نے ساری زندگی اپنی ماں کو روئے پینتے دیکھا۔ وہ اباکو جھولیاں بھر بھر کر بددعا کیں دیتی مگر اباکوئی اثر نہ ہوتا۔ ابانخر سے کہتا۔

”میں کون سا گناہ کر رہا ہوں۔ مذہب نے مجھے اجازت دے رکھی ہے۔“ اباکو دیکھا دیکھی تینوں بھائی بھی اسی راستے پر چل پڑے۔

جب گھر کا سربراہ اتنی دیدہ دلیری سے یہ سب کرے تو اولاد کہاں پیچھے رہتی ہے وہ تو ہونی ہی سوا سیر ہے۔ تینوں بھائیوں نے بھی چار شادیوں کا مشغلہ اپنا لیا۔ دولت کی ریل پیل تھی سو چار بیویاں کسی پر بھی بوجھ نہ ہوتی۔ مگر گھر میں ہر پل کی بک بک جھک جھک رہنے لگی۔ جب عورت کی زبان کھلے تو مرد کا ہاتھ اٹھتا ہے وہ مار پیٹ کر کے اپنا غصہ نکالتا ہے عورت کا مزید خون جلانے کے لیے مشہور زمانہ جملہ ہر وقت ٹوک زبان پر رہتا ہے۔

”مرد کو چار شادیوں کا حق مذہب نے دیا ہے کون ہے جو انہیں اُن کے حق سے دستبردار کر سکے۔“ میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ شروع شروع میں تو ان معاملات کو سمجھ نہ پاتی مگر پھر آہستہ آہستہ ان روتی چلتی عورتوں سے ہمدردی ہونے لگی۔ جوں جوں دل میں ہمدردی بڑھنے لگی مردوں کے لیے نفرت میرے دل میں بیٹھ گئی۔

ابایا بھائی ببا تک دہل یہ بات کہتے۔  
”چار شادیاں کرنا ہمارا حق ہے۔“ تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ دل چاہتا پوری دنیا

کو آگ لگا دوں اور سارے مردوں کو جلا کر راکھ کر دوں اور اُن کی راکھ کو پاؤں کی ٹھوکر مار کر اڑا دوں۔

یہ سب صرف سوچا جاسکتا تھا عمل کرنا تو ناممکن تھا۔ مجھے بعض اوقات اپنی بے بسی پر بہت رونا آتا..... راتوں کو اذیت سے جاگتی رہتی، گھر کے مردوں سمیت دنیا کے تمام مردوں کو جی بھر کر گالیاں دیتی مگر نفرت کسی طرح بھی کم نہ ہوتی..... انسان کی فطرت ہوتی ہے کہ اصل سے پیارا جس طرح سود ہوتا ہے بالکل ایسے ہی انسان کو وہ چیز زیادہ بری لگتی ہے جس سے کسی برائی یا تکلیف کا آغاز ہوتا ہے۔ میرا دماغ بھی آغاز کے بارے میں سوچ کر تنگ ہونے لگتا۔

”آخر مذہب نے مرد کو چار شادیوں کا حق دیا ہی کیوں؟“

اگر انہیں یہ حق نہ ملتا تو یہ ظلم نہ ہوتا..... مذہب نے سخت زیادتی کی اس معاملے میں عورتوں کے ساتھ مجھے مردوں سے نفرت تھی اب مذہب پر بھی غصہ آنے لگا۔ میرے دل میں غصے کا الاؤ دینے لگا۔

”اگر مرد چار شادیاں کر سکتے ہیں تو پھر عورت کیوں نہیں؟“

اس تمام بغاوت اور نفرت نے میرے دل میں سوچ کا نیا بیج بویا اور مردوں کی بے حسی اور ابرو دانی اس پر مٹی بن کر گری اور اُسے زمین کی لہٹیوں میں لے گئی۔ عورت کی آنکھوں سے بہتا آب اُس کی سیرابی کے لیے کافی تھا۔ پہلے تھسا سا پودا نکلا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن گیا۔ زہر میں بھرا جس پر زہریلے کانٹے تھے۔ اس طرح مسیح کے دانوں پر انسانی زبان کوئی ورد لڑت سے کرتی ہے ویسے ہی میں یہ ورد کثرت

سے کرنے لگی۔  
”مرد چار شادیاں کر سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں؟“

”اسی دوران میرا رشتہ میرے چچا زاد سے طے ہو گیا اور میں رخصت ہو کر اُس کے گھر آ گئی۔ وہ مہینہ مہینہ کام کے سلسلے میں شہر سے باہر رہتا تھا۔ خالی دماغ شیطان کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ میرے پاس فراغت ہی فراغت تھی۔ فس بک پر فرینڈ شپ میرا مشغلہ بنا تو کافی لڑکوں کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا لیا۔ انشا گرام پر تصویر لگاتی تو لڑکے دیوانے ہو جاتے۔ بات دوستی سے آگے بڑھی اور شادی پر اصرار ہونے لگا۔ یہاں سے ہی میرے انتقام کا آغاز ہوا۔ وہ حسن بے مثال سے گھائل ہوئے تو میرا کام آسان ہوتا گیا۔ اُن میں تین لڑکے تو میرے شہر کے ہی تھے سو میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دنیا میں تنہا ہوں اور اپنی شادی کا فیصلہ خود کر سکتی ہوں اور پھر میں نے چار کو چار سے شکست دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اُن تینوں سے بھی نکاح کر لیا حالانکہ میں پہلے ہی سے اپنے چچا زاد کے نکاح میں تھی۔

ایک زوردار قہقہہ اور تالی کی گونج مجھے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔ میرا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ وہ عورت تالیاں بجاتے ہوئے دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔

”میں نے بھی چار شادیاں کر لیں..... چار کے بدلے چار.....!“ وہ چار انگلیاں دکھاتے ہوئے تقریباً چیخنے لگی تھی۔

میں اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی جا رہی تھی۔ یوں لگا

زمین ڈول رہی ہو۔ ابھی شکاف بڑے والا ہو۔ بس تھوڑی دیر تک میں اس میں دھنس جاؤں گی یا پھر..... یا پھر..... کمرے کی چھت مجھ پر آن گرے گی۔ میرا داغ چکرانے لگا۔ دل متلانے لگا۔ میں کیا سمجھ رہی تھی اور قصہ کیا نکلا تھا۔

”آپ مذاق تو نہیں کر رہیں؟“ میں بے یقینی سے بولی۔

مجھے اس عورت سے ہرگز اتنی جرأت و ہمت کی امید نہ تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حقیقت جاننے کی کوشش میں خود ڈوبنے کے قریب ہو جاؤں گی۔

”مذاق..... چلی ہو گئی ہے میں تجھ سے کیوں مذاق کرنے لگی کیا تیرا میرا مذاق بنتا ہے۔“ وہ میرے قریب آ کر کینچی پر نفرت سے ایک چپت لگاتے ہوئے بولی۔

جیسے میرا دماغ ٹھکانے لگانے کی سعی کی ہو..... میں اُسے حیرت سے دیکھ جا رہی تھی۔ سرتاپا بار بار..... متعدد بار نبھانے کتنی بار پھر بھی حیرت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”اوہ..... مائی گاڈ!“ میں نے سر ہٹا لیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

”مگر آپ تو عورت ہیں عورت ایک وقت میں چار شادیاں کیسے کر سکتی ہے اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے۔“ مجھے اب اُس پر شدید غصہ آ رہا تھا کتنا سنگین قدم اٹھایا تھا دنیا و آخرت کا عذاب مول لے لیا تھا اور اُسے فکر تک نہ تھی۔

یوں مذہب سے متصادم ہو کر وہ نادم ہونے کی بجائے وہ فخریہ انداز میں خوش ہو رہی تھی جیسے زندگی میں بہترین کارنامہ انجام دیا ہو۔ انسان چھوٹے موٹے گناہ کر کے بھی رب کی پکڑ سے ڈرتا ہے اور وہ شدید نا فرمانی پر اکڑ رہی تھی کہ اُس

نے جو کیا ٹھیک کیا۔

”کیا آپ کے پہلے شوہر کو کچھ خبر نہ ہوئی؟“ میرے دل میں سوال آیا۔

”شروع شروع میں تو سب ٹھیک چلتا رہا میرا پہلا شوہر تو شہر سے زیادہ باہری ہوتا تھا صرف چند دنوں کے لیے آتا تھا۔ بس جانے کے بعد میں بالکل آزاد ہوتی تھی۔ سیکے کا بہانہ بنا کر تینوں شوہروں کو خوب اُلوہاتی اور دل ہی دل میں خوب مزہ لیتی..... کبھی ایک کے پاس تو کبھی دوسرے اور پھر تیسرے کے پاس..... کسی کو رتی برابر بھی شک نہ ہوتا تھا۔ میں پہلے شوہر کے پاس آنے تک لوٹ آتی۔ یوں مردوں سے میرا انتقام پورا ہو رہا تھا۔ وہ جو انتہائی متکبر بنے چار شادیوں کے حق پر اکڑتے تھے اب وہ حق میرے پاس بھی تھا..... میری کبھی کسی شوہر سے اُن بن ہوتی تو وہ مجھے دھمکی دیتا۔

”میں دوسری شادی کر لوں گا۔“ تو میں اُس کی دھمکی پر ذرا بھڑک بھی نہ ڈرتی تھی اور نہ ہی روتی نہ ہی بین ڈالتی تھی۔ بلکہ دل ہی دل میں قہقہہ لگاتی تھی۔

”جاؤ کرلو..... جتنی مرضی شادیاں..... میری بلا سے“ میری جوتی کو بھی اس کی فکر نہیں۔ وہ میری حالت پر ششدر رہ جاتے کیونکہ مردوں نے تو یہی دیکھا ہوتا ہے کہ بیوی کے سامنے دوسری شادی کی بات کر دو تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

پھر مجھے ملکا سا بخار رہنے لگا..... میں اس کو معمولی جھٹی اور کوئی توجہ نہ دیتی۔ پھر آہستہ آہستہ بخار بڑھنے لگا۔ بہر حال میں اپنے پروگرام پر سختی سے عمل پیرا تھی۔ آخر مرد بھی تو ایسے ہی کرتا ہے

جا ہے جیسی مرضی حالت ہو ہر بیوی کے حضور حاضر ضرور ہوتا ہے۔ میرا جب بخار زور پکڑنے لگا تو میرا پہلا شوہر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا ادویات دی گئیں مگر افادہ نہ ہوا.....

ایک شام جب میں بخار میں جلتی ہوش سے بیگانہ بستر پر پڑی تھی کہ میرا پہلا شوہر گھر آیا اُس کے تکیے پر کسی طوفان کی خبر دے رہے تھے۔ اُس نے آؤ دیکھا نا تاؤ..... اسی حالت میں مجھے بے دردی سے مارنے لگا۔ اُس نے مجھے مار پیٹ کر لہو لہان کر دیا۔ میں وجہ پوچھتی رہ گئی مگر وہ ہنسنے کی بجائے پیٹتا رہا۔ بہت منت سماجت کے بعد اُس نے ڈاکٹری رپورٹس میرے منہ پر دے ماریں جن میں انکشاف ہوا تھا کہ میرے جسم میں ایڈز کے جراثیم کی موجودگی کا اشارہ ملا ہے۔ میں نے بہت قسمیں کھائیں۔ پیر پکڑے مگر اُس کا اعتبار مجھ پر سے ختم ہو چکا تھا۔ اسی دوران میرے نیلے سے خون نے میرے راز کی مکمل قلعی کھول کر دکھ دی۔ اُن کے مطابق میں پورے ایک سال سے اُن سے ملنے نہیں آئی تھی۔ جبکہ میرا پہلا شوہر تو یہ ہی جانتا تھا کہ میں سیکے جاتی ہوں باقی تینوں لوگوں نے یہ بتا رکھا تھا کہ میں دور بار کے رشتے داروں سے ملنے جاتی ہوں سو وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

میرا شوہر صرف مجھے بدکار سمجھ رہا تھا۔ اصل بات وہ نہیں جان سکا تھا کہ میں نے تین اور شادیاں کر رکھی ہیں اُس نے مجھے گھر میں قید کر دیا۔ وقت زیادہ گزرا تو میرے تینوں شوہروں کی بے قراریان عروج پر پہنچ گئیں۔ فون پر فون مارنے لگے۔ میں ٹال مٹول کرتی مگر وہ طیش میں آنے لگتے۔ کوئی اصرار کرتا ابھی فوراً آؤ۔ کوئی

اصرار کرتا پتہ بتاؤ اپنے رشتے داروں کا میں تمہیں لینے آتا ہوں۔ مگر میں کسی نہ کسی طرح بات گول مول کر دیتی۔

میرا شوہر مجھ پر سخت پہرہ رکھنے لگا تھا۔ وہ گھر سے بالکل نہ نکلنے دیتا..... وہ کام کے سلسلے میں شہر سے باہر بھی نہیں جا رہا تھا۔ پھر ایک روز میں پکڑی گئی۔ میرا راز کھل گیا میرا پہلا شوہر کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا۔ تو میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے چوکس ہو گئی۔ مگر پہلا شوہر کہیں نہیں گیا تھا وہ اسی شہر میں تھا بس مجھے رکٹے ہاتھوں پکڑنے کے لیے موقع فراہم کیا تھا۔ میرا راز کھلا تو وہ میری جان لینے کے در پر ہو گیا۔ میں خوفزدہ ہوئی اور اُسے سب کچھ سچ بتا دیا۔ وہ خود کو پاگلوں کی طرح نوچنے لگا تو میرے دل کو بہت سکون ملا۔ عورتیں بھی تو سوتن کا سن کر اسی طرح روتی پینتی ہیں مگر مرد کب احساس کرتا ہے۔ بے لگام گھوڑے کی طرح بھاگتا ہے۔ کبھی کسی کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتا۔

وہ بالکل غم صم سا ہو گیا۔ یوں جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو کہ میں اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہوں وہ بالکل کسی بے بس عورت کی طرح لگ رہا تھا میرا دل خوشی سے جھوم رہا تھا اُس کی بے بسی پر..... مگر میں اُس کے قابو آنے والی نہیں تھی۔ وہ سویا اور میں نے کام دکھایا اُس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ ہا ہا ہا..... وہ پاگلوں کی طرح قہقہہ لگانے لگی۔ میں اُس کی سفاکی پر حیرت سے لگ رہ گئی تھی۔

”کیوں ٹھیک کیا نا میں نے ان خبیثوں کے ساتھ..... کیسا آئینہ دکھایا۔ بڑے حاکم بنے پھرتے ہیں“ بڑا اکڑتے ہیں اپنی حاکمیت پر..... مذہب کے نام پر بڑی بڑی باتیں مارتے ہیں..... چار



1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید داغ قابل علاج مرض ہے

پہلے بری

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی ایوارڈ ہولڈر اجمل زیدی کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام



ASIAN EXCELLENCE  
PERFORMANCE AWARD



AWARD  
BEST ACHIEVEMENT

مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20  
G-8/1  
سربراہ (تعلیمی چوک) اسلام آباد  
فون: 051-2331725  
موبائل: 0300-8566188

سینٹر

9- اپریل تا 30 مئی  
9- اگست تا 30 ستمبر  
9- دسمبر تا 30 جنوری



AWARD  
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

14- فروری تا 27 فروری  
14- جون تا 27 جون  
14- اکتوبر تا 27 اکتوبر  
آفس نمبر 16- فیروز پور روڈ  
چوک چوکی نزد مالا پوریک لاهور  
موبائل: 0300-8566188

یکم فروری تا 11 فروری  
یکم جون تا 11 جون  
یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر  
جی ٹی روڈ نزد ہسٹری چوک پشاور شہر  
موبائل: 0300-8566188

ملتان

کراچی

28- مارچ تا 6 اپریل  
28- جولائی تا 6 اگست  
28- نومبر تا 7 دسمبر  
پوسٹل سروس سینٹر  
ریلوے روڈ نزد چوک مریز ملتان  
فون: (061) 4518061-62  
موبائل: 0300-8566188

13- مارچ تا 27 مارچ  
13- جولائی تا 27 جولائی  
13- نومبر تا 27 نومبر  
پوسٹل سروس سینٹر  
آفس نمبر 7، 706 فورڈ مارشل فیلڈ  
نہری اسلام آباد پلاٹ K.F.G. کراچی  
فون: 021-34328080  
موبائل: 0300-8566188

E-Mail: syedajmalzaidi@hotmail.com • syedajmalzaidi@yahoo.com.uk

کا بدلہ..... چار.....“ وہ اپنے فعل پر مطمئن تھی۔  
عقب سے آتی اُس کی آوازیں کورڈور تک  
میرا پیچھا کرتی رہیں مگر میں نے پلٹ کر نہ دیکھا۔  
”چار کا بدلہ..... چار..... میرے حواس بے  
قابو ہونے لگے۔

اپنی ہی ہم جنس کی سوچ خود سری اور سرکشی پر  
میری روح ماتم کرنے لگی۔ میرے قدم  
لڑکھڑا رہے تھے اور آنسو چل رہے تھے باہر نکلنے  
کے لیے میری فرینڈز مجھ سے میری گھبراہٹ کی  
وجہ پوچھتی رہیں مگر میں انہیں کیا بتاتی۔

”چار کے بدلے چار.....!“ ان الفاظ کی  
بازگشت میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔

سرکشی کیلئے سڑک پر بس بھاگتی جا رہی تھی۔ ابر  
آلود موسم نے بارش برساکر ہر سوجھ بھل کر دی۔  
مجھے ٹھنک کا احساس ہونے لگا تو میں نے بس کی  
کھڑکی کھول دی۔

نرم ہوا کے لطیف جھونکوں نے زندگی کا  
احساس دیا ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ میں کسی  
اندھیری کوٹھری میں بند ہوگئی ہوں۔

”بڑے مذہب کی شہ پر اچھلتے ہیں یہ  
پذات..... دیکھا کیسا دماغ ٹھکانے لگا یا۔“  
تہقہبوں کی آواز سامعوں میں سیہ بن کر اترنے لگی  
تو میں نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں  
اس کیفیت سے چھٹکارہ چاہتی تھی۔

”خناس..... خناس..... خناس..... کوئی  
دردناک آواز میں چیخا۔

”اور جب دلوں میں خناس بھر جائے.....  
اور جب ذہن بھی خناس سے خالی نہ رہیں تو پھر  
اچھے برے کی تمیز انسان سے چھین لی جاتی ہے۔  
نیکی پر قائم رہنے اور بدی سے دور رہنے کی طاقت  
ختم کر دی جاتی ہے اُسے ریوڑ سے نکال کر اُس

☆☆☆☆

## قسمت کے کھیل

ضروری نہیں کہ صرف سوتیلی ماں ہی خراب ہو

بعض اوقات اولاد بھی اپنا دل بہت تنگ کر لیتی ہے.....

شخص معظم الہی

لوگ عموماً یہی کہتے ہیں کہ اللہ پاک سوتیلی

ماں کسی کو نہ دے اس لیے کہ وہ اپنے خاوند کی پہلی اولاد کی قدر نہیں کرتی اور اس کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوتیلی ماں یہ بھی نہیں چاہتی کہ اس کے خاوند کی پہلی اولاد پڑھ لکھ جائے اور اسے کوئی اونچا مقام ملے۔

مگر سب سوتیلی ماںیں ایک جیسی نہیں ہوتیں بلکہ ان میں سے کچھ مائیں ایسی بھی ہوتیں ہیں جو سوتیلی اولاد کو ہمیشہ اپنے بچوں کی طرح چاہتی ہیں انہیں پڑھاتی لکھاتی ہیں اور دنیا میں ایک اونچا مقام دلانے کی کوشش کرتی ہیں اولاد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنا سکھ اور آرام بھی بھول جاتی ہیں۔ ایک ایسی ہی ماں کی کہانی میں تحریر کرنے جا رہا ہوں جس نے اپنے خاوند کی پہلی اولاد کو پالا پوسا اور خون جگر دے کر اس اولاد کی تربیت کی۔

خورشید آ پا کا خاندان تقسیم ہند سے پہلے امرتسر میں رہا کرتا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں

ہائش ایک مسئلہ ہی بن گئی وہ کبھی کسی بھائی کے پاس رہتی تھیں کبھی اپنی بڑی بہن کے پاس جب خورشید آ پا کی عمر اٹھارہ سال کی ہوئی تو ان کی بڑی بہن نے اس مسئلے کے حل کے طور پر خورشید آ پا کی شادی انبالہ (انڈیا) میں اپنے ہی خاندان کے ایک شخص میاں نصیر احمد سے کر دی۔ نصیر احمد ایک امیر ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ پانچ بچوں کے باپ تھے۔

ان کے چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑا بیٹا ایف اے کا طالب علم تھا۔ باقی بچے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ یعنی حامد سے چھوٹا لڑکا سعود آٹھویں جماعت میں اس سے چھوٹا محبوب چھٹی جماعت میں اور سب سے چھوٹا لڑکا رفاقت پہلی

جماعت میں پڑھتا تھا۔ جبکہ لڑکی آمنہ نے پانچ جماعتیں پڑھ کر اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ نصیر احمد کا خاندان انبالہ کا امیر کبیر خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔

خورشید آ پا نے سرال میں آ کر سب بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھال لی اور ان کی بہت اچھے طریقے سے پرورش کرنا شروع کر دی۔ ان کے دل میں بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ سوتیلی اولاد کی پرورش اور دیکھ بھال کر رہی ہیں بلکہ وہ انہیں اپنے بچے سمجھ کر یہ سب کچھ کر رہی تھیں وہ ان کو یہ احساس نہیں ہونے دیتی تھیں کہ وہ ان کی سگی ماں نہیں ہیں۔ مگر سب سے بڑے لڑکے حامد اور اس سے چھوٹے لڑکے سعود نے خورشید آ پا کو کبھی بھی اپنی ماں تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ



خورشید آپا سے دور دور رہتے اور اُن دونوں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ خورشید آپا سے کم بات کریں وہ دونوں صرف اپنے کام سے غرض رکھتے تھے دوسری جانب نصیر احمد اپنی بیوی سے بہت مطمئن تھے کہ وہ اُن کی اولاد کی پرورش اور دیکھ بھال بہت اچھے طریقے سے کر رہی ہیں۔

جب نسیم ہند کا اعلان ہوا تو میاں نصیر احمد کا خاندان بھی بے سروسامانی کی حالت میں پاکستان پہنچا۔ انہیں لاہور میں ریلوے روڈ کے قریب ایک علاقے میں مکان الاٹ ہوا۔ جس میں وہ رہائش پذیر ہوئے جہاں انہوں نے دوبارہ اپنے کاروبار کی طرف توجہ دی جو وہ انبالہ میں کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کلیم کے ذریعے اپنی ساری جائیداد پاکستان میں ٹرانسفر کی۔ پھر سب بچوں کو ایک اچھے اسکول میں داخل کر دیا۔ حامد اس وقت بی اے کر چکا تھا۔ چنانچہ اسے ایل ایل بی کرنے کے لیے کالج میں داخل کروادیا گیا۔ اسی دوران نصیر احمد کی بیٹی آمنہ کا ایک مختصر سی بیماری کے بعد رضائے الہی سے انتقال ہو گیا تھا۔

حامد نے جب ایل ایل بی کر لیا تو نصیر احمد نے اُس کی شادی اپنے ہی خاندان میں کرادی۔ لڑکی نے بی اے کیا ہوا تھا۔ خورشید آپا کو اُس کی آنکھیں بہت پیاری لگی تھیں اُس لیے اس لڑکی کو اپنی بہو بنا کر لے آئیں بہو نے کچھ دن خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا پھر اپنی مرضی کرنی شروع کردی۔ وہ آرام زیادہ کرتی تھی اور کام کم خورشید آپا ہی گھر کے سارے کام کرتی تھیں۔ انہوں نے بھی بھی اپنی بہو کو کام کرنے کی تکلیف نہیں دی۔ اُن کی اس نرمی کی وجہ سے بہو میں غرور پیدا ہو گیا وہ اپنے آپ کو گھر کی مالکن اور ساس کو گھر کی نوکر سمجھنے لگی۔ وہ گھر کا ہر کام خورشید

آپا سے کرواتی تھی مگر خورشید آپا نے کبھی اُف تک نہیں کی۔ وہ صرف اور صرف اپنے خاوند کی رضا کے لیے یہ سب کچھ کرتی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنی بہو کی شکایت نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ یہ سب کچھ چپ چاپ برداشت کرتی تھیں۔

اتنے عرصے میں خورشید آپا کے ہاں پانچ بچے پیدا ہوئے تھے۔ جن میں ایک لڑکا اور چار لڑکیاں تھیں۔ خیر اس دوران نصیر احمد کے دوسرے بیٹے مسعود کی بھی شادی ہو گئی۔ دوسری بہو بھی اپنے ہی خاندان کی تھی اور وہ بھی لاہور کی رہنے والی تھی۔ وہ اُٹھ بھانجریں پاس تھی۔

دوسری بہو کے آنے سے گھر میں فسادات کا ایک نیا سلسلہ چل پڑا تھا۔ وہ اس طرح کہ شادی کے چھ ماہ بعد دوسری بہو کو ہر چوتھے پانچویں دن اپنے میکے جانے کی لت پڑ گئی۔ خورشید آپا نے شروع شروع میں اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنی بات براڑی رہی بلکہ اس نے کہا۔

”میں اپنے گھر جانا نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ مجھے جانے سے منع نہ کیا کریں۔ میرے خاوند نے اجازت دے رکھی ہے۔“ آخر کار خورشید آپا نے اسے سمجھانا چھوڑ دیا تھا۔

ایک دن نصیر احمد نے جب محسوس کیا کہ ان کی چھوٹی بہو اکثر گھر میں نظر نہیں آتی تو انہوں نے خورشید آپا سے پوچھا کہ چھوٹی بہو کہاں ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ چھوٹی بہو تو ہر چوتھے پانچویں دن اپنے میکے چلی جاتی ہے اور یہ سلسلہ کافی دنوں سے جاری ہے۔ یہ سن کر نصیر احمد نے اپنی بہو کو بلا بھیجا جب وہ آتی تو انہوں نے بہو سے بار بار میکے جانے کی وجہ پوچھی اور یہ بھی پوچھا کہ تمہیں اس گھر میں کوئی تکلیف یا کوئی شکایت ہے۔ چھوٹی بہو نے جواب دیا۔

”ابا جان! یہاں میں نوکرانی بن کر نہیں رہ سکتی اور نہ ہی میں اپنے میکے جانا چھوڑ سکتی ہوں کیونکہ میں اپنے خاوند کی مرضی سے یہ سب کچھ کر رہی ہوں۔“

نصیر احمد نے اپنے بیٹے مسعود سے کہا۔

”تم اپنی بیوی کو منع کر دو کہ وہ زیادہ اپنے میکے نہ جایا کرے۔“ مسعود نے اُلٹا جواب دیا۔

”ابا جان وہ اپنے گھر ہی تو جاتی ہے اسے جانے دیں آپ کا کیا بڑھتا ہے۔“

نصیر احمد نے اُسے بری طرح جھڑا۔

”تم کیسے شوہر ہو کہ اپنی بیوی کو میکے بار بار جانے سے منع کیوں نہیں کرتے؟“ یہ جھگڑا زیادہ بڑھ جاتا مگر خورشید آپا نے اپنی حاضر دماغی سے اس جھگڑے کو دبا دیا تاکہ گھر نہ ٹوٹے۔

تھوڑے دنوں کے بعد بڑی بہو اور چھوٹی بہو نے آپس میں مل کر اپنی ساس کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے خورشید آپا اور اُن کے بچے پریشانی میں مبتلا رہنے لگے۔ بڑی بہو کے تین بیٹے اور چھوٹی بہو کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اب بچوں کی چھوٹی چھوٹی لڑائی اور جھگڑے ہونا شروع ہو گئے۔ نصیر احمد یہ سب کچھ

دیکھ کر بہت کڑھتے رہتے تھے۔ کیونکہ اُن کے حالات بگڑنا اور خراب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کی وجہ سے اُن کی صحت گرنا شروع ہو گئی تھی۔ لہذا ایک ہی اُن کا ایک بیٹا محبوب انک میں ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا جس کے صدمے نے انہیں فالج کا بہت سخت ایک ہوا اور وہ چار پائی سے لگ گئے۔ خورشید آپا نے اُن کی بہت خدمت اور تیمارداری کی مگر کچھ عرصے کے بعد ایک دن وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

نصیر احمد کی وفات کے بعد خورشید آپا اور اُن کے بچوں پر بہت اثر پڑا۔ شوہر کی وفات کے بعد تو دونوں بہوؤں نے اپنی ساس کو اور بھی زیادہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ نصیر احمد کے دونوں بڑے بیٹوں حامد اور مسعود نے جب سادھ لے وہ اپنی بیویوں کی کسی بات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ دونوں بہوئیں اپنے بچوں کو احساس دلاتی تھیں کہ تمہاری دادی سوتیلی ہے اس کے بچوں کو منہ نہ لگایا کرو۔ وہ تمہارے باپ کے سوتیلے بہن بھائی ہیں۔ ان سے دور رہ کر دو۔

نصیر احمد کے سب سے چھوٹے بیٹے رفاقت نے اپنے دونوں بھائیوں کو سمجھایا کہ ایسا نہ کریں کیونکہ وہ ہماری ماں اور چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا اب ہم سب کا فرض ہے۔ مگر ان سب نے رفاقت کی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔ البتہ اُن کے بچوں نے بہت اثر لیا اور وہ اُن کے والد کے بچوں سے دور رہنے لگے۔

یہ دیکھ کر خورشید آپا دل ہی دل میں ایک روگ پالنے لگیں۔ انہوں نے سوچا تھا کہ سوتیلی اولاد کو پال پوس کر اچھی تربیت کر کے نیک انسان بنائیں گی مگر یہ سب کچھ اُن کی سوچ کے الٹ ہو گیا اور پھر آخر ایک دن خورشید آپا سب کی خدمت کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

انہوں نے جو سوتیلی اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی تھی اس کا صلہ انہیں کیا ملا؟ انہوں نے اپنی اولاد اور سوتیلی اولاد میں کوئی فرق نہیں سمجھا تھا۔ مگر اُن کی سوتیلی اولاد نے بھی بھی ماں کا درجہ نہیں دیا۔ اُن کی اچھی تعلیم و تربیت اور محبت کا جواب نفرت سے دیا۔ اب اسے قسمت کے کھیل نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔



## گناہ گار

وہ مظلوم تھی..... معصوم تھی..... مگر پھر بھی گناہ گار قرار

دے دی گئی..... ایک حرماں نصیب کی داستان الم.....

مریم شاہ بخاری

ڈرائنگ روم کے فرش پر دو لاشیں خون میں

نہائی ہوئی پڑی تھیں۔ پاس ہی وہ بکھرے بالوں کے ساتھ کھڑی تھی ہاتھ میں اس کے پستول تھا گھر کے تمام افراد اس سے کچھ فاصلے پر دائرے کی صورت میں کھڑے تھے بھی غم و غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ جب ڈی ایس بی حیدر اندر داخل ہوا تو اس نے خود ہی آگے بڑھ کر آتش فاش اس کے حوالے کیا اور اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا تھا۔ وہ اس کی دیدہ دلیری دیکھ کر تعجب کا شکار تھا۔ بہر حال جو بھی تھا اُسے اپنی ڈیوٹی تو نبھانی تھی اس نے ساتھی اہلکاروں کو اشارہ کیا تو انہوں نے آگے بڑھ کر اسے ہتھکڑی پہنا دی۔ ڈی ایس بی حیدر نے گھروالوں کو مخاطب کیا۔

”آپ میں سے کون میرے ساتھ چلے گا“

”تھانے ضروری کارروائی کرنی ہے؟“

”میں چلتا ہوں جی.....“ ایک باوقار ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھا تھا۔

”آپ کا مقتولین سے کیا رشتہ ہے؟“ حیدر

اپنے اسپتال بھجوانے کا بندوبست کرو۔“ حیدر نے ان دونوں سے بات کر کے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا تھا۔

”جی سر.....“ فتح محمد نے فوراً کہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد حیدر وہاں سے تھانے کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ جیل کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گہری وج میں گم تھی جب ڈی ایس بی حیدر کے قدم وہاں رُکے تھے۔ 29، 30 کے لگ بھگ اس 11 شیڑہ کی عمر تھی اس کے چہرے پر چھائی صدمیت اور خوبصورتی کا استعراج اسے کہیں سے بھی مجرم ثابت نہ کر رہا تھا مگر دو گواہوں اور خود اس کے اعتراف جرم نے اُسے اس کال ٹوٹھڑی میں لالچنا تھا۔





کردار کی مضبوطی بہت متاثر کرتی تھی۔ حیدر اور اس کے درمیان احترام کا رشتہ تھا۔ رتبہ فخر اور حیدر کی دوستی صرف کالج تک محدود تھی وہ بہت پازیسو تھی اس حوالے سے وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کے کردار اور دوستی پر حرف آئے۔ حیدر اس کی خوشی میں خوش تھا امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد وہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے آج اتنے برسوں بعد وہ اس کے سامنے آئی بھی تو قاتلہ کے روپ میں..... ایک مجرم بن کر..... جو حیدر کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

☆.....☆.....☆

آج اُسے فراغت ملی تو وہ اس سے ملنے چلا آیا۔ رتبہ اُس سے بہت کم بولتی تھی پر شکر تھا کہ وہ بولتی تو تھی ناں۔

”رتبہ ایک بات کہوں؟“ حیدر نے اُسے کہا تو اُس نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔

”تم سپریم کورٹ میں جرم کی اپیل کیوں نہیں دائر کرتی..... تمہارے اچھے رویے کی وجہ سے ہو سکتا ہے سزا میں کمی ہو جائے؟“

”حیدر..... بچوں سی باتیں کیوں کرتے ہو؟ قتل کیے ہیں میں نے..... میری سزا کیسے کم ہو سکتی ہے؟“ رتبہ نے چپکلی سی ہنسی نہس کر کہا تھا۔

”پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“ حیدر نے اُسے قائل کرنا چاہا۔

”نہیں..... جو سزا تجویز ہو چکی ہے ٹھیک ہے..... دو سال گزر گئے ہیں باقی بھی گزر جائیں گے..... ایک دن تختہ دار بھی استقبال کر ہی لے گا..... اچھا ہے اس فانی دنیا سے رخصتی اختیار کروں۔“ وہ افسردگی سے بولی تھی۔

”ایسی باتیں مت کرو پلیز.....“ حیدر نے دھکے سے کہا۔

”یہی حقیقت ہے حیدر..... حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا مجھے پتہ ہے تمہیں میرے پاس کیا چیز کھینچ لاتی ہے؟“ رتبہ کی آنکھیں شرارت سے چمکی تھیں۔

”کیا چیز کھینچ لاتی ہے؟“ حیدر نے اُسے گھورا تھا۔

”یہی کہ تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں نے اپنے شوہر اور اس کے دوست کو کیوں قتل کیا تھا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ بات بھی ہے..... میں جاننا چاہتا ہوں لیکن مجھے تمہارے پاس میری اور تمہاری دوستی کھینچ لاتی ہے محترمہ.....“ حیدر نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”اوہ اچھا جی..... گڈ.....“ رتبہ فخر نے ہنس کر اُسے سراہا تھا۔

”حیدر..... فیشن مت لو میں تمہیں بتاؤں گی..... ضرور بتاؤں گی..... مگر وقت آنے پر۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

”ٹھیک ہے لیکن اب یہ بھی بتا دو وہ وقت کب آئے گا؟“ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

”پتہ نہیں.....“ وہ کندھے اُچکاتے ہوئے بولی تو حیدر اُسے گھور کر رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وقت کا پیہر بڑی تیزی سے گھوما تھا۔ پندرہ برس بیت گئے۔ حیدر کی شادی ہو گئی وہ دو جڑواں بچوں کا باپ بن گیا، ڈی ایس بی سے وہ ڈی آئی جی کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ لیکن رتبہ فخر کے بتانے کا وقت ابھی تک نہیں آیا تھا وہ شدت سے منتظر تھا کہ کب وہ اس راز سے پردہ اٹھائے۔ آخر خدا خدا کر کے حیدر کا انتظار ختم ہوا اور اُسے رتبہ فخر کا پیغام ملا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔

پیغام ملا بھی تو کب؟ جب اسے تختہ دار پر اُٹائے جانے میں صرف تین دن باقی تھے۔ حیدر اپنا کر رہ گیا تھا لیکن وہ بے بس تھا کہ وہ اس کے پاس پہنچ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس جانے پہلے وہ اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔

اُسے لگ رہا تھا موت کا خوف اس کے ہمارے پر زردی بکھیرے ہوئے ہوگا۔ وہ اس کے سامنے روئے گی۔ لیکن اب جب وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا تو رتبہ فخر کے حوصلے اور ضبط کی دل میں داد دیے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ وہ اول و زکی طرح ہی مطمئن اور ہشاش بشاش تھی اس نے وجود میں ذرا برابر بھی لرزش نہ تھی اس کے ہمارے پر موت کی زردی نہیں عجیب سا سکون پھیلا ہوا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ غلابی آنکھوں میں کسی ہنسنے کا عکس تک نہ تھا وہ ابھی ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی۔

”تم جاننا چاہتے تھے ناں اصل کہانی.....“ اس کا صبح وقت آ گیا ہے..... میں تمہیں اس بار بتاؤں گی کہ تم مجھ سے اظہار ہمدردی کرو یا نہ۔ فخر جنم نہ لے کوئی اور دانیال جیسا وحشی درندہ بنے..... فیضان احمد جیسے شیطان کا شکار کوئی اور نہ ہو۔ اور کوئی مجھ جیسی گناہگار اس مقام پر نہ پہنچے۔“ اس کی آنکھوں میں می اتر آئی تھی وہ بڑی خوبصورتی سے حیدر سے چھپا گئی تھی۔ وہ ہندوؤں کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر اُس نے اپنی اپنی ہوئی گفتگو کا سلسلہ جوڑا تھا۔ حیدر ہمہ تن گوش تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اُسے لگ رہا تھا کہ وہ بہت بڑے راز سے واقف ہونے جا رہا ہے۔

☆.....☆.....☆

رتبہ فخر بھی ایک عام سی لڑکی تھی جس کی آنکھوں میں بھی خواب اترتے تھے ایک اچھی اور خوبصورت زندگی کے..... ایم اے اکنائکس کے بعد فیشن ڈیزائننگ اس کا جنون تھا وہ فیشن کی دنیا میں اپنا نام پیدا کرنا چاہتی تھی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ایم اے اکنائکس کے امتحانات کے فوراً بعد ہی اس کا ایسے گھرانے سے رشتہ آیا کہ اس کے والدین دنگ رہ گئے۔ امیر ترین لوگ..... کروڑوں کا بزنس کرنے والے اور پھر حیات آباد کے علاقے میں اپنی زمینیں جن کی سالانہ آمدنی اتنی تھی کہ وہ لوگ بغیر کوئی کام کے سات پشتوں تک آرام سے کھا سکتے تھے۔ اُن لوگوں کو ان کی سفید پوشی سے کوئی سروکار نہ تھا انہیں مطلب تھا تو بس اُن کی بیٹی رتبہ فخر سے جو اُن کے پیٹے چوہدری دانیال سرفراز کے دل میں اتر چکی تھی۔ رتبہ فخر کو اُس نے پرنسپل کے آفس میں دیکھا تھا وہ وہاں کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اُس کالج کا وائس پرنسپل دانیال کا دوست تھا۔ ایک دو بار اُس نے رتبہ کو وہاں دیکھا تھا۔ اُس کی سادگی اور حسن نے دانیال کو اپنا اسیر کر لیا تھا۔ اُسی دوست کے توسط سے یہ پر پوزل رتبہ کے والدین کے سامنے آیا تھا۔ دانیال کے گھر والوں سے چند دنوں کا ٹائم لے لیا گیا سوچتے سمجھتے کے لیے اس کے بھائی نوید نے خاموشی سے بالابالا ضروری چھان چھک بھی کر لی۔ ہر ماں باپ کی طرح اس کے والدین کی بھی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی بھی اپنے سسرال میں سکھی رہے۔

اُسے ہر سہولت میسر ہو۔ اب انہیں یہ خواب دانیال کی صورت میں پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ نوید کی طرف سے سب اچھا ہے کا گنگن ملا تو یہ رشتہ



قبول کر لیا گیا۔ یوں رتبہ فجر ٹھیک ایک ماہ بعد چوہدری دانیال سرفراز کے نام کی مہندی ہاتھوں پر لگائے دلہن بن کر جوہلی آگئی تھی۔ بیچ پریشانی رتبہ فجر اپنے دلہا کا انتظار کر کر کے آگئی تو اس نے بیڈ کی کراؤن سے ٹیک لگالی۔ نیند پروتی اُس کی آنکھوں میں اتر رہی تھی جسے وہ پلکیں جھپک جھپک بھگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر ناں ناں کرتے بھی اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اُسے خبر ہی نہ ہوئی کب دانیال کمرے میں آ کر خود بھی سو گیا تھا۔ اگلی صبح اس کی آنکھ ملازمہ کی تیز دستک کی وجہ سے کھلی تھی۔ وہ بڑبڑا کر اٹھی۔ ناظم دیکھا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ وہ رات سے دلہن کے لباس میں تھی۔ جلدی جلدی اٹھ کر دروازہ کھولا تو ملازمہ اسے ناشتہ لگنے کی اطلاع دے کر چلی گئی اس نے بے خبر سوتے اپنے شوہر پر نظر ڈالی تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا اب انہیں کیسے اٹھاؤں؟ وہ شرم اور جھجک سے اس کے سر ہانے کھڑی ہوئی تھی ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ دانیال کے فون بجنے کی تیز آواز نے اسے سائیڈ ٹیبل کی طرف متوجہ کر دیا۔ موبائل کی رنگ ٹون نے دانیال کو بیدار کر کے رتبہ فجر کی مشکل آسان کر دی تھی۔

دانیال کی نظر رتبہ پر پڑی۔

”ارے تم نے ابھی تک چہنچ نہیں کیا؟ اوہ..... سو..... سوری یار..... رات تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا..... دراصل دوست یا ر سب اکٹھے تھے انہوں نے گھیرے رکھا..... آئی ایم سوری.....“ وہ مسکراتا ہوا اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو رتبہ فجر شرم سے سر جھکا گئی۔ موبائل بج کر خود ہی خاموش ہو گیا تھا۔

”ویسے ایک بات ہے یو آر سویٹی فل.....“ آئی ایم ویری ٹکی کہ تم میری لائف پارٹنر ہو.....“ وہ اس کے چہرے پر جھکا تو وہ حیا سے سمٹ گئی۔ دانیال ہنس کر سیدھا ہو گیا۔

”جاؤ جلدی سے پہنچ کر لو..... پھر ناشتہ کرتے ہیں۔“

”جی اچھا.....“ وہ فرمانبرداری سے کہہ کر الماری کی طرف بڑھ گئی جبکہ دانیال اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

رتبہ فجر کے لیے یہ بات کسی دھچکے سے کم نہ تھی کہ دانیال نے ابھی تک ’حق زوجیت‘ ادا نہ کیا تھا۔ اب جبکہ وہ پیرس جیسے خوبصورت ملک میں بنی مون کے لیے روانہ ہونے والے تھے تو اس کو کچھ تسلی ہوئی ہو سکتا ہے کہ وہ وہاں جا کر ان لحوں کو یادگار بنانا چاہتا ہو۔

☆.....☆.....☆

وہ شاندار سا ڈنر کر کے واپس اپنے ہوٹل پہنچے تھے رتبہ فجر شاور لے کر باہر نکلی تو دانیال کافی کے دھگ اٹھائے روم میں داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اسے مسکراتا ہوا دیکھ کر دانیال بھی مسکرا دیا۔ بلیک کلر کی ٹائلی میں اس کا حسن لشکارے مار رہا تھا۔

دانیال غماز آلود نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ لو جانم بلیک کافی..... تمہاری فیورٹ.....“ وہ ایک گلاس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تھا۔

”جلدی سے اسے ختم کرو..... اور..... بیڈ پر آ جاؤ..... آج بہت غضب ڈھا رہی ہوں تم سے اس رات کو حسین تر بنانا ہے۔“ وہ معنی خیزی سے

لہذا اس کی طرف جھکا تو رتبہ فجر کے گالوں پر لپٹا ہوا گئی۔ دل کی دھڑکن دھک دھک کرنے لگی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر الماری کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں المان پن کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیا تھا۔ رات کی رات واقعی حسین تر تھی۔ وہ خود کو یکدم ہی لپٹ لگنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

بنی مون ٹرپ سے واپسی کے دوسرے ہفتے ہی اسے لیڈی ڈائٹر ماں بننے کی خوشخبری سنار ہی ملی۔ یہ بہت بڑی خبر تھی سبھی نے اُسے مبارکباد دی تھی بذات خود دانیال بہت خوش تھا۔ اسے ام وں شاپنگ کروائی تھی اور نیو ماڈل کی برانڈ ڈھیر خرید کر گفت کی تھی۔ وقت دھیرے دھیرے اتر رہا تھا۔ آخر وہ گھڑی بھی آگئی جب اُس نے کول منول خوبصورت سے بچے کو جنم دیا تھا۔ دانیال سرفراز کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے بچے کے سامنے دنیا جہان کی نعمتیں لا کر ڈھیر کرے۔ رتبہ فجر اتنا مان اور پیار پا کر بے حد رنجش اس کے والدین اور بھائی بھی بیٹی کی بات پر نازاں تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے نہ سکتے تھے۔

☆.....☆.....☆

نصفے راحم دانیال کی پیدائش کے ڈیڑھ ماہ بعد فجر کے بھائی نوید کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ والدین کے ساتھ مل کر بری تیار ہوئی تھی۔ دانیال نے رتبہ کو اچھی خاصی رقم دی تھی۔ وہ بھائی کی شاپنگ دل کھول کر کرے۔ ہر اٹلی سے اٹلی خریدی جا رہی تھی۔ آج بھی دلہن کا ڈریس اپنی والدہ کے ہمراہ اوکے

کرنے جانا تھا۔ نصفے راحم کو تیار کر کے خود بھی بالکل ریڈی تھی لیکن اب گاڑی کی چابی مل کے نہ دے رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی ہر چیز الٹ پلٹ کے دیکھ رہی تھی پر گاڑی کی چابی نہیں مل رہی تھی۔ ”ارے سیف میں دیکھتی ہوں وہیں ہوگی۔“ وہ خود سے باتیں کرتی الماری کی طرف بڑھی تھی۔ سامنے کیبن میں نیلی فائل پر رکھی چابیاں اُسے نظر آ گئیں۔

”اوہ ٹھیکس گاڈ.....“ اس نے ٹھنڈی آدھ بھر کر چابی اٹھائی تو نیلی فائل بے دھیانی میں اس سے نیچے آن گری۔

”ارے..... دانیال بھی پتہ نہیں کدھر کدھر فائلیں رکھ دیتے ہیں۔“ وہ نیچے جھک کر کاغذ سمیٹ کر اس نے فائل میں رکھے تو وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔

اس نے جلدی سے فائل دوبارہ کھولی جس کے اوپر دانیال سرفراز میڈیکل رپورٹ لکھا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔

دانیال کی میڈیکل رپورٹ..... وہ جوں جوں رپورٹس دیکھتی جا رہی تھی اس کے پیروں تلے سے زمین نکلتی جا رہی تھی۔ اسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اس نے بمشکل فائل بند کر کے الماری میں واپس رکھی۔

”ایسے کیسے ہو سکتا ہے..... دانیال سرفراز..... نہیں نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی بیڈ پر بیٹھی وہ اپنی ہی سوچوں میں گم ہو گئی۔ تب ہی موبائل کی تیز بیل اور راحم کے رونے کی آواز نے اُسے حال میں پہنچایا تھا۔

اس نے جلدی سے بچے کو گود میں لیا اور موبائل چیک کیا۔ نوید کی کال تھی۔

”ہیلو.....“ اس نے لیس کاٹن پریس کر کے

موبائل کان سے لگایا۔

”کہاں رہ گئی یار..... جلدی آؤ..... اماں..... انتظار کر رہی ہیں تمہارا.....“ نوید نے چھوٹے ہی کہا۔

”ہاں ہاں..... بس آ رہی ہوں دس منٹ تک.....“

”اچھا..... ہائے.....“ لائن ڈسکنکٹ ہوئی تو وہ کچھ سوچ کر راحم کو لے کر اماں کی طرف آ گئی۔

☆.....☆.....☆

یہ کیسا انکشاف ہوا تھا اس پر جو اس کی ذات کے پر نچے اڑا لے گیا تھا۔ اس کی ذات جو بہت بلند یوں پر تھی یکدم ہی نیچے آن گری تھی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ اس کا اعتبار خاک میں مل چکا تھا۔ جسے اپنی پاکدامنی اور پاکیزگی پر مان تھا اب وہ پتیلیوں میں گر چکی تھی جسے اپنا ہار کردار ہونے پر فخر تھا وہ فخر ٹوٹ چکا تھا اُسے اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی۔ وہ پلید ہو گئی تھی اس کا جسم اس کی روح ناپاک ہو چکی تھی۔ اُسے شرم آ رہی تھی خود سے اپنے خدا سے..... وہ گناہگار تھی۔ اس کی دماغ کی نہیں سمجھنے کو تھیں۔ اس کا شوہر اس کا محاذ اس کے کانوں میں گرم سیسہ انڈیل کر باہر جا چکا تھا اس کا تن من جھکس رہا تھا۔ وہ اندرونی کرب اور جنگ سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے گھر والے اسے اسپتال لے کر دوڑے تھے۔ جہاں ڈاکٹر نے اسے فوراً ایمرجنسی میں شفٹ کر دیا۔

اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ اسے ہوش نہ آیا تو مرلیضہ کومہ میں جاسکتی ہے اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے آپ لوگ دعا کریں بس..... ڈاکٹر نے نوید اور دانیال کو تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ نوید شدید پریشانی

اور اضطراب میں تھا خود دانیال بھی اپنی جگہ چور کھڑا تھا۔ وہ کیا بتاتا کہ اس کی بیوی کس ذہنیت سے گزر رہی ہے۔

☆.....☆.....☆

آخر خدا خدا کر کے پورے دو دن بعد رتبہ کو ہوش آیا تھا ان دو دنوں میں وہ بالکل نچڑ کر رہ گئی تھی۔ بے جان جسم اور زرد رنگ گویا کسی ہلکی گرا دی ہو..... اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے راحم کو گود میں لینے اور دودھ پلانے سے انکار کر دیا جب اس کے سامنے راحم لایا گیا تو وہ ہڈیاں انداز میں چیخنے لگی تھی۔

”اسے لے جا دیہاں سے یہ گندا ہے۔“ یاروں کی اس کو..... اُس کی آنکھوں سے شے لپکنے لگے تھے۔

دانیال کی والدہ نے بڑے پیار سے رتبہ کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”بیٹی..... تمہارا بیٹا ہے تمہارا راحم.....“

”نہیں ہے میرا بیٹا..... کون ہے یہ؟“

کس کا ہے؟ میں..... میں..... پلید ہوں مجھے نہیں ہے۔ مجھے پاک کرو.....“ وہ زور زور سے چیخ

رونے لگی۔ دانیال کی والدہ گھبرا گئی۔ خود رتبہ کے والدین بیٹی کی حالت پر سسک رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دانیال کی والدہ کو کہا کہ بچے کو اس سے دالے جائیں یہ نا ہو کہ اسے نقصان پہنچا دے۔

کی ذہنی حالت سے کچھ بعید نہیں..... یوں راحم دانیال کے کزن کی بیوی کی گود میں ڈال دیا

جب تک رتبہ ٹھیک نہیں ہو جاتی وہ اس کی دیکھ بھال کرے۔ اس نے یہ ذمہ داری خوشی

قبول کر لی۔ وہ خود صاحب اولاد نہیں تھی سو راحم

پاکر خوش ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

دانیال سرفراز نے کھانپوں میں پھینک دیا تھا اپنے اور سکنے کے لیے رتبہ فجر سے شادی محض ایک دن دکھاوا تھی۔ اس نے اس کا انتخاب کیا ہی اس

نعمد کے لیے تھا وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی باپ نہیں

ان ملنا اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے وہ خود کو تباہ

ایک بڑا تھا۔ گھر والوں کی طرف سے شادی

لینے پر زور دیا جا رہا تھا آخر تک وہ انہیں

نالا رہتا۔ اس نے اپنی رضا مندی تو ظاہر کر دی

مگر ساتھ ہی رتبہ فجر کا نام بھی رکھ دیا کہ وہ اس

شادی کرے گا۔ گھر والوں نے اعتراض کیا تو

اس نے دھمکی دی کہ وہ پھر ساری عمر شادی نہیں

کرے گا۔ رتبہ فجر سے شادی کرنے کی دوسری

دہائی اس کا دوست فیضان احمد بھی تھا جسے رتبہ فجر کا

طمانہ بھول نہیں پایا تھا۔ وہ دانیال سرفراز کا

تین دوست تھا۔ وہ اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا

تھا۔ رتبہ سے شادی کی ساری پلاننگ اُسی کی تھی۔

اس لوگوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔

دانیال کا بھرم بھی رہ گیا اور فیضان احمد کا انتقام بھی

☆.....☆.....☆

رتبہ فجر کی ذہنی حالت بہت خراب تھی۔

دانیال سرفراز نے اس کے علاج میں کوئی کسر نہ

کر دی تھی۔ مسلسل علاج سے رتبہ فجر میں سوچنے

کی صلاحیت واپس آئی تھی۔ اس پر پہلے کی

ذہنی شریانی کے دورے نہیں پڑے تھے لیکن

اپنی ذات سے گھر کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں

اسے اذیت کاٹتے ہوئے..... اس کے جسم و جاں

میں بدلے کی آگ سگ رہی تھی۔ وہ پیرس میں

گزرے وقت کو یاد کرتی تو اس کی روح کانپ

جاتی۔ فیضان احمد اور دانیال سرفراز اسے مسلسل

ایک ماہ بے ہوش کی دوا دے کر لوٹے رہے تھے۔

فیضان احمد کا خیال آتے ہی اُس کا خون کھول جاتا

اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اُس کی جان لے لے

اور دانیال سرفراز کو عبرت کا نشان بنادے۔

☆.....☆.....☆

دانیال سرفراز کے موبائل کی رنگ ٹون بجی تو

اس نے موبائل کی اسکرین پر جھلکاتے فیضان

کا لنگ حروف کو ناگواری سے دیکھا تھا اس وقت

وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھا۔ آفس کی کوئی ضروری

فائل دیکھ رہا تھا۔ اُسے یہ ڈسٹربنس پسند نہیں آئی

تھی۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی ایس کا مٹن پر ایس

کر کے موبائل کان سے لگا لیا تھا۔

”ہاں یار کیا حال ہے تیرا.....“ اُس نے

اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔

دوسری جانب سے جانے کیا کہا گیا تھا کہ وہ بقیہ

لگا کر ہنس پڑا۔

”ادھر بھی سب اوکے ہیں یار..... تو فکر نہ کر

بس پاکستان آنے کی تیاری کر تیری بلبل کا دماغ

اب ٹھیک ہے.....“ دانیال کا لہجہ ذومعنی تھا۔

دروازے کی اوٹ میں کھڑی رتبہ فجر نے بمشکل

اپنے آپ پر قابو پا رکھا تھا۔

”چل تیرا بدلہ تو پورا ہوا اور مجھے وارث مل

گیا۔“ وہ بے شرمی سے پھر بقیہ لگا کر ہنسا تھا۔

”کب آ رہا ہے تو.....“ دانیال نے سوال کیا

تھا۔

”اچھا اسی دن پھر تو شاندار سی پارٹی ہنی ہے

یار.....“

”چل میں بندوبست کرتا ہوں تو بھی کمال کرتا ہے تیرا دل نہیں بھرا ابھی اُس سے.....“

”ٹھیک ٹھیک یار..... بس تو اپنے باپ سے اس شاپنگ پلازے کے لیے زمین اوکے کروا..... میں تیرا کام کر دوں گا۔ اوکے اللہ حافظ۔“ دانیال سرفراز نے ابطہ منقطع کیا تو اس کے لبوں پر پُر اسرار سی مسکراہٹ ٹھیل رہی تھی۔

رتبہ فخر نے بڑی نفرت سے اپنے دلال شوہر کو دیکھا اور خاموشی سے واپس پلٹ گئی اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس رات دانیال سرفراز اس کے پاس آیا تھا اور بڑے واضح لفظوں میں فیضان احمد کا مطالبہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ اگر وہ خود سے راضی نہ ہوئی تو نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

”اگر میں نہ کروں تو؟“ وہ جانتا چاہ رہی تھی کہ یہ شخص کس حد تک گرسکتا ہے۔

”تو پھر پیرس کے خوبصورت ہوٹل میں فیضان احمد کے ساتھ گزاری گئی راتوں کی ویڈیو میٹ پر ڈاؤن لوڈ کر دی جائیں گی۔“ وہ سرد لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ رتبہ فخر کے پاس سوچنے کے لیے کل منج تک کا وقت تھا اور پھر شام کو اُسے فیضان احمد کے روبرو پیش ہونا تھا چاہے رضامندی سے یا پھر زبردستی.....

☆.....☆.....☆

اگلی صبح اچانک ہی دانیال سرفراز کی فیل کی دوسرے شہر رشتے داروں کے ایک فنکشن میں جانا پڑ گیا۔ گھر پر صرف رتبہ فخر دو ملازم اور دانیال سرفراز رہ گئے تھے۔ موقع دیکھ کر دانیال نے دوسری جگہ جانے کی بجائے فیضان احمد کو اپنے گھر

فون کر کے بلوایا تھا۔ رتبہ فخر نے اپنی رضامندی دے دی تھی۔

☆.....☆.....☆

فیضان احمد آچکا تھا اور ڈرائنگ روم میں تواضع کے لیے پیش کیے گئے لوازمات سے بھرپور انصاف کر رہا تھا۔ دانیال اور اس کے قہقہے رتبہ فخر کو خنجر کی مانند جسم میں اترتے محسوس ہو رہے تھے وہ بیڈ روم میں تھی۔

”یار کدھر ہے تمہاری وائف اور میری.....“ فیضان احمد نے بیہودگی سے دانیال کو آنکھ مارنے ہوئے کہا تھا۔

”اوپر بیڈ روم میں ہے تیار ہو رہی تھی۔ آجاتی ہے تم چائے پیو۔“ دانیال نے مسکراتے ہوئے کہہ کر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

”یار بلاؤ اسے..... اکیلے چائے پینے کا کیا مزہ.....“ فیضان صوفی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا تھا۔

”رشید..... رشید.....“ دانیال نے ملازم کو آواز دی۔

”جی صاحب.....“ ملازم جلدی سے حاضر ہوا تھا۔

”جاؤ بیگم صاحبہ کو نیچے بلاؤ..... کہو صاحبہ لوگ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔“ دانیال نے آرڈر دیا تو وہ جی صاحبہ کہہ کر اوپر کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

دروازے پر ہونے والی دستک رتبہ فخر کی جان نکال گئی۔ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے چھپا لیا تھا۔

”کون ہے آجاؤ.....“ اس نے خود کو نارمل کیا۔

”بیگم صاحبہ آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔“

”تم چلو میں آ رہی ہوں۔“ وہ چلا گیا۔ تو برآمدہ بھی سیدھیاں اتر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں پستول تھا۔

☆.....☆.....☆

ایمان احمد کی نظر رتبہ پر پڑی تو گھبرا کر اٹھ اٹھا۔ دانیال نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی دنگ آ گیا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے کان اڑ گئے تھے۔

”یہ کیا ہے رتبہ.....“ دانیال نے خود کو یاد کرتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔

”یہ تم دونوں کی موت..... دانیال از.....“ اس کی آنکھوں سے شرارے لپک رہے تھے وہ ان پر پستول تانے لکھی تھی۔

”دیکھو اسے پھینک دو۔“ فیضان نے کہا تو رتبہ نے لگا کر ہنس پڑی۔

”کیوں..... موت کو سامنے دیکھ کر رنگ اٹھ اٹھ گیا تمہارا فیضان احمد۔“ وہ طنز سے اس نفرت زدہ چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ دانیال اس کی طرف بڑھا تو وہ الٹ ہو گئی۔

”خبردار..... جو میری طرف ایک قدم بھی.....“ میں گولی چلا دوں گی۔“ وہ انہیں دھمکی دے ہوئے بولی تھی۔ پستول کی نال سے دونوں نے ہٹانے پر لیے ہوئے تھی۔ اس کے قدم خود بخود اٹھ گئے۔

”آج یوم حساب ہے تم لوگوں کا..... میں تم لوگوں کو نہیں چھوڑ دوں گی۔“ وہ جنوبی انداز میں بولی تو وہ ڈر گئے۔ اس سے معافیاں مانگنے لگے۔ لیکن وہ بالکل سرد اور

سپاٹ چہرہ لیے کھڑی رہی۔

پھر اچانک ہی اس نے فیضان احمد پر گولیاں چلا دیں ایک گولی اس کے سینے پر اور دوسری پیٹ پر ماری تھی۔ وہ منہ کے بل گر پڑا تھا فرش پر..... دانیال بچتی بچتی آنکھوں سے اُس کے جسم سے اچلتے ہوئے خون کو دیکھ رہا تھا کچھ دیر بعد وہ ساکت ہو گیا۔ اب دانیال سرفراز کی باری تھی اس کے چہرے پر موت کی زردی تھی۔

رتبہ فخر نے باہر سے اندر بھاگتے قدموں کی آواز سنی تو جلدی سے دانیال پر فائر کھول دیے۔ تمام گولیاں اس کے سینے میں اُتار دی گئیں۔

رتبہ فخر کی آنکھوں میں نفرت کی آگ تھی۔ رشید اور چوکیدار اندر داخل ہوئے تو ٹھٹک کر رُک گئے۔

ان دونوں کو دیکھ کر رتبہ نے پستول نیچے کر لیا۔

خود ہی رشید کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ دانیال کے گھر والوں کو فون کرے پھر پولیس کو اطلاع کر دے۔

رشید نے ایسا ہی کیا تھا کچھ ہی دیر میں حیدر پولیس نفری کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

☆.....☆.....☆

حیدر رتبہ کی داستان سن کر بھیگی پلکوں اور جھکے سر کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔ اس کا دل درد کی کڑواہٹ سے بے حال تھا وہ ساری رات سو نہ سکا تھا۔ اگلی صبح اس کے لیے ایک دل دوزخبر لے کر آئی تھی دوہرے قتل میں ملوث سزا یافتہ رتبہ فخر سحری کے وقت سجدے کی حالت میں مردہ پائی گئی تھی۔ موت کی وجہ حرکت قلب بند ہو جانا بتائی جا رہی تھی۔

☆☆.....☆☆



کراچی سے ارسال کردہ جرم و سزائے موضوع پر جان دار تحریر



## حصار

~~~~~

وہ شہر کے امیر ترین صنعت کار کا اکلوتا وارث تھا مگر دولاکھ میں اُس

کی گزر بسر مشکل تھی تو اُس نے ایک پلان بنا ڈالا اپنے باپ کو چوت کرنے کا.....

~~~~~

## سید علی ارسلان

~~~~~

آخری بازی بھی جیتنے کی امید پر ہارنے کے بعد

ارشاد پتے میز پر رخ کراٹھا تو اسے اپنے باپ پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ حالانکہ اس شکست میں باپ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ارشاد نے کوٹ کی جیب ٹٹولی اور اندر ہی اندر نوٹ گنے پھر دانت پیتا ہوا اپنی کار میں آ بیٹھا۔

جیب میں کل اتنی رقم باقی تھی کہ اپنی شکست کا غم دس کے دو یا زیادہ سے تین گلاسوں میں گھول کر پیا جاسکتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اب دو تین پیگ ارشاد پر خاطر خواہ اثر ڈالنے میں ناکام رہتے تھے۔ اس نے کچھ اس انداز میں انکیشن کی چابی گھمائی جیسے اپنے باپ کی گردن مروڑ رہا ہو۔ پھر اتنی قوت سے ایکسلیٹر پر دباؤ ڈالا گویا ایکسلیٹر نہ ہو باپ کا زرخرہ ہو۔

سے نوشی کے دوران بھی اُس کا ذہن جھنجھلاہٹ کا شکار رہا۔

”ایسے باپ کے ہونے سے تو میں یتیم ہی بہتر تھا۔“ اس نے تنقید کر سوجا اور پیگ حلق سے نیچے

اتارنے لگے۔

تیسرا بیگ چڑھانے سے قبل اس نے رسواچ پر نظر ڈالی اور بھنا کر میز پر گھونہ دے مارا۔ اشارہ تارخ تھی۔ مہینے کے تیرہ دن اور باقی تھے جیب خالی ہو چکی تھی۔

”یہ کلینڈر کا موجد بھی کوئی بہت بڑا حرازادہ کتے کا پلٹا پندرہ دن کا مہینہ بنا دیتا تو کیا میا مرچا اُس کی۔“ وہ با آواز بلند بڑبڑایا۔ لیکن آس پاس میز پر بیٹھے لوگوں نے ذرا براہ توجہ نہ دی۔

یہ جگہ ہی ایسی تھی کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا کہ اپنے دکھ گلاسوں میں حل کر کے خون میں جذب کر تھا اور کوئی اپنی خوشیوں سے بے حال ہو کر مرست تھا۔ ارشاد خامسی دیر میز پر بیٹھا رہا مگر آج کی شکست کا داغ ذہن سے نہ ہٹا۔

”قسمت تو سالی پہلے ہی فرجی تھی اب شراب بھی دعا باز ہو چلی ہے۔“ پھر ارشاد نے پہلے قسمت اُس کے بعد شراب کو مغفلات سنائیں اور جب کہ زبان کی کوئی گالی اسے یاد نہ رہی تو اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆

پہننے کا وقت تھا جب ارشاد گھر میں داخل ہوا۔ نہاد اور دھامڑا حسب معمول اپنے وسیع و عریض والی سرسبز و شبنمی گھاس پر ننگے پاؤں چہل قدمی نہ تھے۔ انہوں نے ناگواری اور تاسف کے ساتھ اپنے تاثرات کے ساتھ ارشاد کو کار سے اترتے دیکھا اور منہ پھیر کر دوبارہ ٹہلنے میں مشغول ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر ان کے نزدیک آ گیا۔

”ایڈی مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ دھامڑا صاحب نے رخ پھیرا وہنی بھوں اٹھا ارشاد پر نظر ڈالی اور کچھ کہے بغیر اپنا مشغل جاری رکھا۔

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے ڈیڈی۔“ ارشاد اپنی سے اپنا سوال دہرایا۔
”تو کہو.....“

”ایسا آخر تک ہوتا رہے گا؟“
”کیسا؟“

”ایسا ہی جیسا میرے ساتھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔“ ارشاد باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا تھا۔ ”میرے خیال میں تمہارے ساتھ کچھ برا تو نہیں ہوا نہ ہو رہا ہے۔“ دھامڑا صاحب محل سے بولے۔

”مجھے تو شبہ ہے کہ میں آپ کی سگی اولاد ہوں اور بھی اکلوتی۔“
”اب تو مجھے بھی تمہاری اصلیت پر شبہ ہونے لگا ہے۔“

محض تمہاری حرکتیں دیکھ دیکھ کر مگر اس شبہ کو یقین میں ڈھالنے کا مطلب تمہاری مرحومہ ماں پر بے اعتمادی کا ثبوت ہوگا اور یہ گناہ کبیرہ میں کبھی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسی پاکباز عورت کا



ایسا بیٹا اچھا ہوا وہ بے چاری پون دیکھنے سے پہلے
مرگئی زندہ رہتی تو درگور ہو جاتی صرف تمہاری وجہ
سے۔

”آج میں آپ سے صاف صاف بات
کرنے آیا ہوں۔“ ارشاد دھامڑا صاحب کی تقریر
سن کر اکتا چکا تھا۔
”میں نے تمہیں نہیں روکا۔“

ارشاد دو قدم بڑھا کر باپ کے بالکل نزدیک
ہو گیا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔
”دولاکھ روپے ماہوار کے جیب خرچ میں
میرا گزارہ نہیں ہوتا۔“ ارشاد کی سانسوں سے اٹھتی
ہوئی شراب کی بو نے دھامڑا صاحب کی طبیعت
مکدر کر دی۔

”تم نے پھر شراب پی ہے؟“
”ہاں.....“ ارشاد نے فخر سے جواب دیا۔
”کیوں؟“

”غم غلط کرنے کے لیے۔“
”تمہیں ایسا کون سا غم ہے سب سے بڑے
روگ تو تم خود ہو جو مجھے لگا ہوا ہے۔“ دھامڑا
صاحب نے طنز کیا لیکن ارشاد نے سنی اُن سنی
کر دی۔

”غم یہ تھا کہ میں اپنی کل پونجی فلیش میں ہار
چکا تھا۔ آخری پونجی ہارنے کا غم کم تو نہیں ہوتا
ڈیڑی۔“

بیٹے کی گستاخی پر دھامڑا صاحب کڑھ کر رہ
گئے۔ خون کا تلخ اور آنسوؤں کا نمکین گھونٹ پیتے
ہوئے انہوں نے کہا۔

”تمہارا جیب خرچ اس سے زیادہ نہیں بڑھایا
جاسکتا۔ دولاکھ روپے مہینہ میں تمہارا گزارہ نہیں ہوا
اشی رقم میں تو خاندان کے خاندان بیل جاتے ہیں۔
عادتیں تمہاری وہ ہیں کہ تمہیں ایک پیسہ دیتے

ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔“

”درست کہہ رہے ہیں ڈیڑی آپ
ایک پیسہ دیتے ہوئے بھی آپ کو دکھ ہوتا
ارشاد زہر خند سے مسکرایا۔

”تمہاری تمام ضروریات میری ذمہ
ہیں۔ اس کے باوجود دولاکھ روپے تمہیں کم
ہیں۔“

”جی ہاں کم پڑتے ہیں۔“ ارشاد تن کر بولا
”اس لیے کہ میں کسی کلرک کا بیٹا نہیں
آپ کا بیٹا ہوں سیٹھ امداد دھامڑا کا اکلوتا
لاکھوں کروڑوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث۔“
”کسی طبقے کا مستخرج اڑانے سے پیشتر یہ
بھولو کہ سیٹھ امداد دھامڑا ابھی کسی زمانے میں
کلرک رہ چکا ہے۔“

”یہی تو رونما ہے ڈیڑی کہ ایک کلرک سے
امداد دھامڑا بننے کے بعد بھی آپ میں وہی
عادتیں برقرار ہیں۔“

”اپنی حدود سے باہر مت نکلو۔“
صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔
”میں اپنی حدود کے اندر ہوں مگر آپ
سے زیادہ محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔“ ارشاد پر
اثر نہ ہوا۔

”مطلب کیا ہے تیرا ذلیل۔“ سیٹھ صاحب
دھاڑے۔

”مطلب صاف ظاہر ہے اور میں پہلے ہی
مرتبہ بیان کر چکا ہوں۔“
ارشاد زکا۔

”اپنی اس بے حساب دولت کا آپ کیا کر
گے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں مگر پیسہ داغ
سے پکڑا ہوا ہے حیرت ہے برسوں سے اسی حال
میں رہتے رہتے آپ کے دانت بھی کمزور ہو

۱۰۔ ہمارا بھڑ بھی چکے ہیں مگر پیسے کے بارے میں
۱۱۔ اہی امور ہی ہنسی کا شکار دیا گیا ہے۔“

”افغان ہو جا یہاں سے میں تیری صورت
۱۲۔ لینا نہیں چاہتا۔“ سیٹھ صاحب کا چہرہ سرخ
ہوا۔

”آج میں صاف صاف بات کر کے ہی
صلح ہوں گا۔ میں نے بھی بہت برداشت کیا
ہے۔“

ارشاد نے بھرپور اطمینان سے جواب دیا۔
”کیا بات کرے گا تو مجھ سے میں تیری کوئی
بات نہ مانگیں چاہتا۔“ سیٹھ صاحب کی آنکھیں
ململہ پر ساری تھیں۔

”اگر برداشت کا مادہ اتنا ہی کم تھا تو مجھے پیدا
نہ کی حماقت ہی کیوں کی تھی۔“ ارشاد تندگی
بولا۔

”اپنے جامے میں رہ کیئے۔“
”جامے کے متعلق ہی تو معلوم کرنا چاہتا
تھی۔ مجھے اپنی حیثیت سے آگہی ہونی چاہیے۔“
”اٹوٹ لکچر میں رواں تھا۔“

”آج فیصلہ ہو کر رہے گا آپ کو مجھے بتانا ہوگا
میں اسے ساتھ روارکھی گئی اس قدر کجی کا مقصد
آپ۔ آخر آپ کی اتنی دولت کس مد میں صرف
نہ کے واسطے سڑ رہی ہے۔ اگر آپ مجھے عاق
دیں تو بہتر ہے۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔
بڑے باپ کا نام ساتھ لگا ہے اور جیب میں
ہوائی لوزی بھی نہیں۔“

”سیٹھ صاحب گھاس پر پڑی کرسی پر بیٹھ گئے
”میں سے کہنا شروع کیا۔
”یقین کرو میں نے کئی بار تمہیں عاق کرنے
کا ارادہ کیا ہے لیکن اپنی ماں کو دعائیں دو جو
میں جنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس

بد نصیب کو تم سے بے انتہا محبت تھی اور مجھ بد بخت کو
تمہاری ماں سے بے انتہا پیار تھا۔ وہی ایک
بار ایک سادھا کہ ہے جس نے مجھے اور تمہیں باندھ
رکھا ہے کاش مجھے تمہاری ماں سے اس درجہ محبت نہ
ہوئی تو میں کبھی کا تمہارے عذاب سے چھٹکارا پا چکا
ہوتا۔“

”گویا آپ مجھے اس طرح ترسا ترسا کر سزا
دے رہے ہیں اور اپنا دل ٹھنڈا کر رہے ہیں۔“
ارشاد نے ہونٹ بھیج کر سوال کیا۔

”نہیں تمہیں ترسانا ہی مقصود ہوتا تو اس کے
اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ میری پوری کوشش
یہی تھی کہ تم کسی طرح راہ راست پر آ جاؤ اور کل
جائیداد کی باگ دوڑ سنبھال لو لیکن تمہارے چھن
وہ نظر نہیں آتے۔“

”یعنی میں اتنے دولت مند باپ کا اکلوتا بیٹا ہو کر
بھی تاحیات محرومیوں کا شکار رہوں گا۔“

ارشاد کے سینے میں طوفان اٹھ رہے تھے اور
اس نے بمشکل تمام ان طوفانوں پر بند باندھا ہوا
تھا۔

”تاحیات نہیں۔“ سیٹھ صاحب نے طویل
سانس لی۔

”میں خدا سے اور تم سے مایوس نہیں ہوا
ہوں۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ مجھے ہر باپ کی طرح
اب بھی یہی توقع ہے کہ تم بھی نہ کبھی راہ راست پر
آ جاؤ گے۔ پھر یہ سب کچھ تمہارا ہوگا۔“

ارشاد نے مسخکھ اڑانے والے انداز میں
قہقہہ لگایا۔

”بہت خوب تو اب قبلہ والد صاحب اپنے
ناخلف و نالائق بیٹے سے نہ صرف یہ کہ مذاق فرما
رہے ہیں بلکہ بھلا بھی رہے ہیں یوں کہنا اور
مناسب ہوگا کہ بہکار ہے ہیں۔“

سیٹھ صاحب نے بیٹے کی بے ہودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا وہ عادی ہو چکے تھے۔ نہایت محل سے انہوں نے سمجھا یا۔
 ”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ نہ میں تمہیں بہلا رہا ہوں اور نہ ہی بہکا رہا ہوں۔ ایک آس ہے جو تمہارے سامنے بیان کر دی ہے۔ تم سداھر گئے تو یہ سب تمہارا ہے۔ میں نے وکیل صاحب کو وصیت بھی کر دی ہے۔“
 وصیت کا نام سن کر ارشاد کے کان کھڑے ہوئے۔

”کیسی وصیت؟“
 ”تمہارے بارے میں ساری ہدایات اس وصیت میں موجود ہیں۔“
 سیٹھ صاحب نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

ارشاد کے سارے بدن میں چیونٹیاں ریگلتے لگیں۔
 ”ڈیڑی پلیر، مجھے میرے مستقبل کے بارے میں کچھ تو بتادیجیے۔“ اس نے سانپ کی مانند پھلی بدل لی اور اس کا لہجہ بھی ملتجیانہ ہو گیا۔ کوئی اسے دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ارشاد ہے جو چند لمحے قبل اپنے باپ کو کاٹ کھانے کے لیے دوڑ رہا تھا۔

”تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا مستقبل محفوظ ہے۔“
 سیٹھ صاحب کی آنکھیں بدستور مندی ہوئی تھیں۔

”آپ صاف کیوں نہیں کہتے؟“ ارشاد بے چینی سے تھیلیاں مسل رہا تھا۔

”یہ سب کچھ تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔“
 ارشاد کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر

باپ سے چٹ گیا۔

سیٹھ صاحب دھیمے سے مسکرائے اور انہوں نے اپنا فقرہ مکمل کیا۔

”لیکن اس وصیت پر عمل درآمد ہونے کے لیے ایک مدت معیاد بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“ ارشاد کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

”اس وقت تمہاری عمر کتنی ہے؟“
 صاحب زیر لب مسکرا کر سوال کیا۔

”اکیس سال.....“ ارشاد امید و بہم درمیان آہستہ سے بولا۔

”پینتیس برس کی عمر میں سب کچھ تمہارے ہو جائے گا۔ ابھی تمہیں چودہ برس انتظار کرنا ہے۔ اس دوران اگر میں دنیا میں نہ رہا تو تم

وصیت کے مطابق تمہیں وہی دولاکھ روپے ماہانہ جیب خرچ ملتا رہے گا جو اب مل رہا ہے۔ یہ مدت پوری ہونے کے بعد اگر میں زندہ بھی رہا تو سب کچھ تمہیں سوئپ دوں گا۔“

”یہ وصیت ہے یا پہلی؟“
 ارشاد جھلا گیا۔

”یہ وصیت ہے اور وکیل صاحب کے پاس محفوظ ہے۔“

سیٹھ صاحب گرتے کی جیب سے کان کر پڑا۔

نکال کر اپنے کان کریدنے لگے۔

”پتہ نہیں آپ کے ذہن میں کیسے کا خیالات آتے رہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی وصیت ہے اگر مجھے کچھ دینا ہی ہے تو یوں ہی دے دو۔“

اس شرطم شرطا کی کیا تنگ ہے۔ دوسرے یہ کہ چار سال تک مجھے کالے پانی کی سزا میں جتلا رکھنے سے بھاپ نکل رہی تھی۔ باپ کے لیے وہ سارا پیار و فخر ہو چکا تھا جو رادیر پہلے اس پر طاری

”یہ کالے پانی کی سزا نہیں ہے ایک طرح کی لہجہ ہے، تربیتی دورانیہ ہے۔“ سیٹھ صاحب پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ کچھ نہیں ہے۔“ ارشاد دفعتاً کھڑے ہو کر

”یہ محض آپ کے بوڑھے اور کنجوس ذہن کی اڑان ہے مجھے اذیت میں مبتلا رکھنے کا بہانہ

بہانت ہے ایسی وصیت پر۔“

وہ زور زور سے پاؤں پچھتا ہوا اور وصیت کو ادا تائیں سنا تا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سیٹھ صاحب کے لبوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ پھیلتی رہی۔

☆.....☆.....☆

ارشاد طوفان باد و باران بکھر دفتر میں داخل ہوا۔ اشتیاق رضوی اپنے موکل کے ساتھ بحث میں مصروف تھے۔

انہوں نے بلائے ناگہانی کے اچانک نزول سے سراسیمہ کر دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہنا شروع کرتے تھے۔

”وکیل صاحب مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

”آپ تھوڑی دیر باہر انتظار کر لیجیے میں ابھی آپ کو بلواتا ہوں۔“

”نہیں وکیل صاحب، میں اس وقت صلیب پر جا رہا ہوں آپ کو میرے لیے چند لمحات نکالنا

پڑے گا۔“

”آپ بھی چند لمحات توقف کر لیجیے۔“ وکیل نے نرم لہجے میں کہا۔

”آپ کو میرے حالات کا اندازہ نہیں ہے۔“ اسی انتظار کا نہ کہتے۔ اگر آپ نے میری سلی نہ

لیا، تو ادل پھٹ جائے گا۔“ ارشاد نے جھٹ

کی۔ نجات کی کوئی صورت نہ پاتے ہوئے اشتیاق رضوی نے اپنے موکل کو بے بسی سے دیکھا۔

”معین صاحب برامت منائے گا۔ آپ ہی تھوڑی دیر کی مجھے مہلت دے دیں۔ صاحبزادے

مجھے کافی پریشان دکھائی دے رہے ہیں میں ان سے کچھ گفتگو کر لوں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ موکل نے ارشاد کو بغور دیکھا۔

”واقعی انہیں کوئی شدید پریشانی لاحق ہے خاصے حواس باختہ لگ رہے ہیں۔ میں انتظار کیے

لیتا ہوں۔“

معین صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔

”اب فرمائیے مسئلہ کیا ہے؟“ اشتیاق رضوی نے ارشاد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”مسئلہ بہت بڑا ہے میرے مستقبل کا سوال ہے۔“ ارشاد کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آپ جیسے جیسے دولت مند بھی اپنے مستقبل کے آگے سوالیہ نشان لگا رہے ہیں، کمال ہے۔“

”یہی تو رونا ہے۔“ ارشاد مایوس و دل گرفتہ ہو گیا۔

”چلیں پھر تفصیل بیان کرنا شروع کر دیں۔“

ارشاد کی حالت دیکھ کر اشتیاق رضوی بھی حیران تھے۔

”کیسی تفصیل کہاں کی تفصیل آپ مجھے میرا نوشتہ تقدیر پڑھ کر سنائیں جو تباہی و بربادی کی تاریکی میں لپٹا ہوا ہے۔“ ارشاد کی آواز بوجھل تھی۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”آسان لفظوں میں پوچھ رہا ہوں۔ ڈیڑی نے آپ کو کیا وصیت لکھوائی ہے؟“ وکیل صاحب چونکے۔

”میاں خیریت تو ہے سیٹھ صاحب کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں وصیت کا خیال کیسے آ گیا؟“

”سب کچھ ٹھیک ہے سوائے میرے..... میں جو کچھ دریافت کر رہا ہوں آپ اس کا جواب دیں۔“

ارشاد اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔
”سیٹھ صاحب کی وصیت اول تو بینک کے لا کر میں محفوظ ہے دوسرے یہ کہ وصیت کا انکشاف وقت پر ہوتا ہے اس سے پہلے نہیں۔“

”برائے مہربانی زیادہ سسپنس پیدا نہ کریں۔ کل ڈیڑی اس وصیت کے متعلق مجھے تھوڑا بہت بتا چکے ہیں۔ میں آپ کی زبان سے بھی اس کا متن سننا چاہوں گا۔ اس وصیت میں میری کیا حیثیت ہے؟“

”وہی جو کسی بھی اکلوتے بیٹے کی کسی بھی دولت مند باپ کی وصیت میں ہو سکتی ہے۔“ وکیل صاحب نے گول مول جواب دیا۔

”میں ذاتی طور پر آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔“

ارشاد نرم پڑ گیا۔

”بجائے فرمایا آپ کی درخواست سر آنکھوں پر“

پھر بھی میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”اس سلسلے میں کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ڈیڑی نے میری جاہی و بربادی کا جو پروانہ آپ کو لکھوا دیا ہے میں وہی منحوس وصیت سننا چاہوں گا۔“

ارشاد کی آواز میں کڑواہٹ تھی۔

”معاف کیجیے سیٹھ امداد صاحب نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے وصیت دی ہے۔ کوئی بھی وکیل اپنے موکل سے اس قسم کی خیانت نہیں

کر سکتا۔ وقت آنے پر آپ کو سب علم ہو جائے گا۔“

وکیل صاحب نے اٹل لہجے میں کہا۔

”آپ نا حق ڈرامہ بازی کر رہے ہیں۔ ڈیڑی نے سرسری طور پر وصیت کی بابت ہے۔“

”تو پھر آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

اشتیاق رضوی نے ناگواری سے کہا۔

”یہ چودہ سال کا کیا چکر ہے؟“

ارشاد نے ٹوہ لینے کی غرض سے ادھر سوال جڑ دیا۔

”ادوہ تو آپ کو یہاں تک خبر ہے۔“

اشتیاق رضوی کے ہونٹ تھیرے شکوہ گئے۔

”جی ہاں اور اب بھی آپ مجھے نہ بتائیں گے تو اپنے اس اعتماد کو مجروح کریں گے جو میرے دل میں آپ کے لیے ہے۔“

ارشاد نے متنبیہ کیا۔

”تو سن دیجیے۔“ وکیل صاحب نے ہتھیار ڈال دیے۔

”پینتیس سال کی عمر کو پہنچ کر آپ سیٹھ امداد دھامڑا کے کل اثاثوں کے مالک بن جائیں گے۔“

بس یہ ہے لب لباس اس وصیت کا۔“

وکیل صاحب اپنے پائپ میں تمباکو بھر لے گئے۔

”اور پینتیس سال کی عمر تک میں کیا کروں گا؟“

”جو آپ کا دل چاہے۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

”بات ہو یا نہ ہو۔ وصیت کی رو سے یہی ہوگا۔“

”اب کچھ مجھے ملنا ہے تو پھر یہ چودہ برس کی قید میں اٹائی گئی ہے۔“

ارشاد کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”یہ آپ جا کر اپنے ڈیڑی سے پوچھیں۔“

”سیٹھ صاحب گھرے گھرے کش لگانے لگے۔“

”انہوں نے آپ سے بھی تو اس شق کے

میں اظہار خیال کیا ہوگا۔“

”ہاں..... ایسے ہی سرسری انداز میں۔“

”تو آپ بتاتے کیوں نہیں؟“

ارشاد کی بے بسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”سیٹھ امداد دھامڑا کے خیال میں ابھی آپ

الانگہ نا سمجھ اور نادان ہیں۔ سیٹھ صاحب نے یہ

سات عمر بھر کی انتھک محنت اور عرق ریزی کے صلے

میں حاصل کی ہے۔ معاف کیجیے گا آپ فی الحال

اس کی توقعات پر پورے نہیں اتر رہے ہیں وہ سمجھتے

ہیں کہ ابھی آپ کا ذہن کچا ہے۔ چودہ سال کی

عمر گزرنے تک نہ صرف آپ ذہنی طور پر بالغ

ہو جائیں گے بلکہ کافی حد تک تجربہ کار بھی یہ

اس میں بھی ہو جائے گا کہ پیسہ کس طرح حاصل کیا

جانا ہے کیسے خرچ کیا جاتا ہے اور اس کی حفاظت

ان طریقوں سے ہو سکتی ہے۔“

”اور چودہ سال تک میں ان دو لاکھ روپے

میں گزارہ کروں جو بطور جیب خرچ مجھے عطا کیے

جاتے ہیں۔“

ارشاد نے طنز کیا۔

”یقیناً.....“

”اس رقم میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے جتنا آپ

چاہیں۔“

”وہ کیسے؟“

ارشاد نے بلبلہ کر پوچھا۔

”وہ ایسے کہ آپ کوئی کام دھندا شروع

کر دیں سیٹھ صاحب بھی خوش ہوں گے اور ممکن ہے وصیت میں تبدیلی کر ڈالیں۔ آپ کا وقت بھی

کلے گا اور نت نئے تجربے بھی ہو جائیں گے۔“

”لاحول ولا قوۃ.....“

وکیل صاحب کی تجویز سن کر ارشاد طیش میں

آ گیا۔

”ڈیڑی کی دولت سات پشتوں کو کافی ہے اور

میں کام دھندا شروع کر دوں۔ بہت خوب آپ

کے مشورہ کا بہت بہت شکریہ وکیل صاحب رہا

وقت تو وہ دیگر دلچسپیوں میں بھی کٹ جاتا ہے اور

نت نئے تجربے بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ رہے

آپ کے سیٹھ صاحب تو انہیں خوش کرنے کا مجھے

کوئی شوق نہیں وہ مجھے تکلیف و کسمپرسی کے عالم میں

دیکھ کر ہی خوش رہتے ہیں جیسی انہوں نے یہ انوکھی

وصیت ایجاد کی ہے، ٹھنک ہے ایسے باپ پر اور ایسی

وصیت پر۔“

ارشاد غصے میں بھرا ہوا کرسی سے اٹھا اور تپائی

کو زور دار ٹھوکر رسید کرتا ہوا دفتر سے رخصت

ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

سمندر کا کنارہ ہو خٹک ہو اچل رہی ہو سورج

ڈوبنے کو ہو اور سونے پر ہوا کہ یہ کہ ساتھ میں کوئی

نسوانی وجود اور بھی پسندیدہ موجود ہو تو دل خود بخود

بلیوں اچھلنے لگتا ہے، نظریں رقص کرنے لگتی ہیں اور

سمندر کی لہروں کے تھپڑے منتشر سے منتشر ذہن کو

بھی تھکنے لگتے ہیں۔

لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ ارشاد کو

خٹک ہوا تو بن کر چھید رہی تھی سورج کے سنگ

سنگ دل بھی ڈوب رہا تھا آنکھیں بھیجی ہوئی تھیں

اور لہروں کے تھپڑے دماغ کو طمانچہ مار رہے

تھے غشی نے اسے اتنا افردہ بھی نہیں دیکھا تھا۔

آنے کا فائدہ۔“

”میں آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔“
”مشورہ فیصلہ کرنے سے پیشتر کیا جاتا ہے۔
کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد مشورہ فصول ہوتا ہے۔“
ارشاد نے ان کے جملے کی گہرائی پر توجہ نہ دی۔

”میں شادی کر رہا ہوں۔“

”اچھا فیصلہ ہے خوشی بھی ہے کہ تم نے پہلے ہی
مجھے اطلاع دے دی میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کسی روز
اپنی شادی کا دعوت نامہ مجھے پہنچاؤ گے۔ کون ہے
وہ لڑکی؟“

”عشی۔“

”کیا تمہارا ارادہ اٹل ہے؟“

”جی ہاں۔“

”پھر مشورہ کس لیے؟ اگر عشی کے بارے میں
پوچھنے آئے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی وہ اچھی لڑکی
نہیں ہے۔“

”میری اس سے پرانی ملاقات ہے ڈیڑی۔
میں آپ سے بہتر اسے جانتا ہوں۔“ ارشاد نے
ہٹ دھری کا مظاہرہ کیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ جب میری رائے کی
کوئی اہمیت نہیں تو تمہیں میرے پاس آنے کی
ضرورت کیا تھی؟“

”یہ دریافت کرنے کی شادی کے بعد ہم
دونوں کا کیا بنے گا۔ دو لاکھیں دو افراد گزر بسر
نہیں کر سکتے۔“

”کر سکتے ہیں۔“ سیٹھ صاحب نے اطمینان
سے کہا۔

”جب میری شادی ہوئی تھی تو میری تنخواہ چند
ہزار تھی۔“

”اُس زمانے کا تذکرہ چھوڑیں۔ اس وقت
آپ صرف امداد دھامڑا تھے سیٹھ امداد دھامڑہ

نہیں اور آپ کے والد بھی معمولی حیثیت کے
مالک تھے۔ میری پوزیشن دوسری ہے میں سیٹھ
امداد دھامڑا کی اکلونی اولاد ہوں وہ سیٹھ امداد دھامڑہ
کا شمار ملک کے گنے چنے سرمایہ داروں میں
ہے۔“

”جو بھی ہے۔۔۔۔۔ میں تمہارے فیصلے میں غلط
نہیں ہو رہا تو تمہیں بھی مجھے نصیحت کرنے کا حق
نہیں پہنچتا۔“

”یہ نصیحت نہیں ہے مسئلہ ہے۔“

”تو اس مسئلے کو حل کرنا بھی تمہارا کام ہے اگر
دو لاکھ روپے کم پڑتے ہیں تو تمہیں اس میں
اضافے کے لیے ہاتھ پاؤں بلانا چاہیں۔“

”مجھے یہ زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔
آخر آپ کی بے حساب دولت جسے بڑے بڑے
دیک لگ رہی ہے کس کے کام آئے گی؟“ ارشاد
کی آواز سے شعلے پھنکائیں مار رہے تھے۔

”یہ دیک زدہ دولت تمہارے ہی کام آئے
گی لیکن چودہ سال کے بعد اس وقت تک تمہیں اپنا
بندوبست خود کرنا ہوگا۔“ سیٹھ صاحب نے فیصلہ
کن لہجے میں کہا اور سر جھکا کر فائلوں میں غرق
ہو گئے۔

ارشاد کے رگ و پے میں آگ دوڑ رہی تھی
اُس کا جی جا رہا کہ سیٹھ صاحب کو کچا چبا جائے مگر
مسئلے کا حل نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

”تو تمہارے ڈیڑی ٹس سے مس نہیں
ہو رہے۔“ عشی نے ارشاد کی داستانِ غم سن کر
حسرت سے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“

”مجھے تو تمہاری ولدیت پر شک ہونے لگا
ہے۔ کہیں تم سیٹھ صاحب کے لے پالک تو نہیں

لائی باپ اس قدر عالم نہیں ہو سکتا۔“ عشی کے
انداز میں استہزاء کا عنصر نمایاں تھا۔

”مجھے بھی شبہ ہے اپنی ولدیت پر نہیں بلکہ
ایلی کی دماغی حالت پر۔۔۔۔۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔ اب کیا ارادہ ہے؟“

”میں تو خود تم سے یہی معلوم کرنے آیا
اں۔“ ارشاد نے امید و ہم کے درمیان کہا۔
”میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔“ عشی کسی قدر نخوت

سے بولی۔

”فیصلہ۔۔۔۔۔“

”کیسا فیصلہ؟“

”شادی کا فیصلہ ان حالات سے دوچار رہتے
اے بھی تم مجھ سے شادی کر لو گی؟“ عشی تذبذب
میں مبتلا ہو گئی پھر سمجھاتے ہوئے بولی۔

”یہ تو تمہیں سوچنا چاہیے اتنی معمولی رقم تمہیں
نہ پوری نہیں پڑتی۔ اوپر سے میرا بوجھ۔“ عشی نے
جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ لیکن یہ ادھورا
بہلہ اپنی جگہ مکمل تھا۔

”یعنی تمہارے وہ سارے وعدے وعید
بھولے تھے۔“ ارشاد نے اُسے قہر آلود نگاہوں
سے گھورا۔

”وعدے وعید حالات کے پابند ہوتے ہیں
ارشاد۔“

”اور وہ محبت کے دعوے۔“

”دعوؤں سے نہ تو تن ڈھانپا جا سکتا ہے نہ
بہت بھر سکتا ہے تم غور کرو تو مجھے غلط نہیں پاؤ گے
اُسی حسرت زدہ زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ ہم

”تباہی رہیں۔“

ارشاد کے دل میں ایک کرن سی پھوٹی اس
نے جھٹ کہا۔

”تو تم میرا چودہ سال انتظار کرو گی۔“ عشی

سوچ بچار میں پڑ گئی۔ ارشاد اسے ایسے ہی دیکھ رہا
تھا جیسے مقدمہ کے اختتام پر ملزم جج کو دیکھتا ہے۔

”بولو نا جواب دو۔“

”اگر تم بھی یہی وعدہ کرو تو میں تیار ہوں۔“
عشی کے طرزِ مخاطب میں اعتماد کا فقدان تھا لیکن
ارشاد محسوس نہ کر سکا۔ اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا
کہ عشی چودہ برس اس کا انتظار کرنے کو تیار ہے۔ وہ
مسرت سے دیوانہ ہو گیا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں عشی۔۔۔۔۔ چودہ سال تک
میری زندگی کا یہ فریم خالی رہے گا اور اس میں فقط
تمہاری ہی تصویر لگے گی اب تو خوش۔“

”بہت خوش۔“ عشی کے الفاظ اس کے انداز
سے میل نہیں کھا رہے تھے۔ مگر ارشاد کو اتنا ہوش ہی
کہاں تھا کہ اس کے الفاظ و انداز پر توجہ دیتا۔

☆.....☆.....☆

وقت کو گزرنے سے کوئی نہیں روک سکتا نہ ہی
اُس کی رفتار بڑھائی جا سکتی ہے۔ خوشیوں کے
زمرے میں گھرے ہوئے دلوں سے یہی دعا نکلتی
ہے کہ وقت قلم جائے ایسا نہیں ہوتا۔ وقت کو قید سمجھ
کر کانٹے والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وقت میں
جہاز کا انجن لگ جائے اور وہ برق رفتاری سے اڑتا
چلا جائے۔ ایسا بھی کبھی نہیں ہوتا۔

ارشاد جس طرح ایک ایک دن کاٹ رہا تھا یہ
اُس کا دل ہی جانتا تھا۔ روزِ صبح اٹھ کر وہ کلینڈر
دیکھتا اور گزری ہوئی تاریخ پر قلم سے کراس کا نشان
لگا دیتا۔

عشی سے ملے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور
ان سات دنوں میں ارشاد شدید اعصابی تناؤ کا
شکار رہا تھا۔ وقت کی سست رفتاری اس کے لیے
دباں جان بنی ہوئی تھی۔

اس ایک ہفتے میں سیٹھ امداد دھامڑا کے ساتھ

بارہا اس کے معرکے ہوئے تھے۔ جھنجھلاہٹ کے باعث اس نے اپنی زبان درازیوں کے جوہر خوب دکھائے تھے، بعض اوقات تو سینٹھ صاحب بھی اُس کے ہگزے ہوئے تیر دیکھ کر سہم جاتے اور درگزر سے کام لیتے لیکن ارشاد کا پارہ اپنے عروج پر تھا۔ کئی بار تو ہاتھ پائی تک نوبت پہنچ گئی اور یہاں سینٹھ صاحب کی فہم و فراست نے ٹال مٹول کی مگر نہ خدا معلوم کیا ہو جاتا۔

ڈپٹی تانڈا اور اعصابی تھکن کو دور کرنے کا واحد علاج ارشاد کے نزدیک عشی تھی۔ وہ اٹھا تیار ہوا کپڑے بدلے اور عشی کے فلیٹ کو روانہ ہو گیا۔ فلیٹ کے دروازے پر دستک دی تو کافی دیر کوئی جواب نہیں آیا۔ ارشاد نے دوبارہ دروازہ دھڑ دھڑایا۔

”کون ہے بھی کیا مصیبت ہے۔“ اندر سے عشی کی بیزاراری میں ڈوبی ہوئی آواز طلوع ہوئی۔

”میں ہوں ارشاد۔۔۔۔۔“

توقع تھی کہ نام بتاتے ہی دروازہ کھل جائے گا مگر پھر بھی دس منٹ کے لگ بھگ لگا۔ عشی نے دروازہ کھولا وہ اس کے سامنے تھی۔

”ارشاد تم اس وقت کیسے؟“ عشی کی گھبراہٹ نے ارشاد کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس کا ہاتھ پہلے ہی ٹھکا تھا جب نام بتانے کے باوجود دروازہ کھلنے میں تاخیر ہوئی تھی۔ اس نے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہیں کیا۔

”ایسے ہی آ گیا۔ طبیعت بوجھل تھی۔ سوچا تم سے مل آؤں۔“ ارشاد نے اندر داخل ہونے کے لیے قدم بڑھائے۔ عشی بوکھلا گئی۔

”اندر کہاں جا رہے ہو کمرے کی حالت بہت خراب ہے۔ تم ٹھہرو میں تیار ہو کر آتی ہوں کہیں باہر چلیں گے۔“

”باہر جانے کی کیا ضرورت ہے میں تم سے باتیں کرنے آیا ہوں کمرے میں ہی مناسب رہے گا۔“ ارشاد ڈٹا ہوا تھا۔

”اندر بہت ٹھن ہے۔“ عشی برابر مدافعت کر رہی تھی۔

”تمہاری طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔“

”باہر بھی بہت ٹھن اور جس ہے عشی، تم میری طبیعت کی فکر نہ کرو یہ تو پہلے ہی خراب ہے اور بگڑ گئی تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔“ ارشاد نے عشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ذوق منی فقرہ کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں پھیلی ہوئی تمباکو کی مہک سونگھ کر ارشاد نے نتھنے پھلائے۔

”عشی یہ تمباکو کی بو کیسے۔۔۔۔۔ تم تو سگریٹ نہیں پیتیں؟“ ارشاد نے عشی کی سمت رخ کیا۔ عشی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”عادی نہیں ہوں، تنہائی میں دل گھبراتا ہے تو کبھی کبھی پی لیتی ہوں۔“

”بس تنہائی میں پیتی ہو؟“ ارشاد کی آواز میں بلا کی کاٹ تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ عشی نے اقرار میں گردن ہلائی۔

”کون سا سگریٹ پیتی ہو؟“

”گولڈ لیف۔۔۔۔۔ عشی کو سگریٹوں کے براڈ میں بھی نامی الوقت یاد رہ گیا تھا۔ ارشاد نے پھر سے فضا کو سونگھا۔

”لیکن عشی ڈیر یہ خوشبو گولڈ لیف کے تمباکو کی تو نہیں ہے۔“

”پھر غالباً کیپٹن ہوگی۔“ عشی کا رنگ فق ہوتا جا رہا تھا۔ دوسرا نام اُسے کیپٹن کا یاد آیا۔

”نہیں جان یہ تو ایرن مور کے تمباکو کی مخصوص خوشبو ہے اور یہ تمباکو سگریٹ کا نہیں۔۔۔۔۔ پائپ میں بھر کر پیا جاتا ہے۔“ ارشاد نے آگے بڑھ کر

ایک قدم مسہری کے کنارے پر رکھا اور ہاتھ بڑھا کر نیلے کے نیچے سے جھانکتی ہوئی ایرن مور کی ڈبیہ اٹھائی۔

”چندا۔۔۔۔۔ یہ تمباکو تو شوکت مرزا پیتا ہے۔ کیا نہیں دینے کو اس کے پاس یہی تحفہ رہ گیا تھا؟“

ارشاد مسلسل تیر برسا رہا تھا اور تمام راستے مسدود پارٹیشی ٹڈال ہو چکی تھی تاہم اس نے ہمت نہیں ہاری۔

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ یہاں آیا تھا۔۔۔۔۔ کبھی کبھی آ جاتا ہے میرے منع کرنے کے باوجود۔“

”تو ڈارلنگ اسے سختی سے روکنا۔“ ارشاد کا اتنا اہل رہا تھا لیکن آواز میں غضب کا ٹھہراؤ اور اونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”ہاں اب میں اسے ہمیشہ کے لیے منع کر دوں گی۔“ رفتہ رفتہ عشی کی جان میں جان آرہی تھی۔

”وہ کب آیا تھا؟“

”بہت دیر ہوئی۔“

”کب واپس گیا؟“

”تقریباً دو گھنٹے پہلے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ ارشاد نے پُرسکون ہو کر اپنا بدن صوفے پر گرادیا۔

”کافی بناؤں تمہارے لیے۔“ عشی کی طبیعت بحال ہو چکی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ رہنے دو اتنا ہی کافی ہے۔“ ارشاد کا عین جملہ عشی کو چوکنا کر گیا۔

”کتنا کافی ہے۔“

”یہی کہ دو گھنٹی تمہارے ساتھ گزاروں۔“ ارشاد نے مہارت سے موضوع تبدیل کر دیا۔

اس امر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اٹھتے ہوئے ارشاد اپنائیت سے بولا۔

”عشی ڈیر اب میں پرسوں آؤں گا۔ شام کے ٹھیک سات بجے سینڈس پٹ چلیں گے۔“

”بہت نیک خیال ہے۔“ عشی اب مسکرانے بھی لگی تھی۔

”میں سینڈو چڑاؤں اور کافی تیار کرلوں گی۔“

”ہاں سینڈو چڑ۔۔۔۔۔ واقعی سینڈو چ بھی حیرت انگیز ہے۔“ ارشاد نے گھمبیر آواز میں کہا۔

”اور تمہارا تو کوئی جواب ہی نہیں۔۔۔۔۔“

سینڈو چ بنانے میں۔۔۔۔۔ مکالمے کا آخری حصہ اس نے توقف سے ادا کیا۔

”اچھا خدا حافظ پرسوں شام ٹھیک سات بجے۔“ ارشاد نے یاد دہانی کرائی۔

”مجھے یاد ہے خدا حافظ۔“ عشی نے الوداع کہا اور واپس اپنے فلیٹ میں چلی گئی۔ ارشاد اپنی کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ مگر اس نے کار اسٹارٹ نہیں کی۔

چندہ میں منٹ اس نے انتظار کیا اور پھر سے عشی کے فلیٹ کی جانب قدم بڑھا دیے۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک نہیں دی۔

چابی کے سوراخ سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ رات کا وقت تھا پارٹمنٹ کی راہداری سنسان بڑی تھی پھر بھی اس نے احتیاطاً چاروں طرف نظر ڈال لی تھی۔

عشی کے فلیٹ سے آوازیں آرہی تھیں۔

شوکت مرزا شناخت کرنے میں ارشاد کو ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ اندر سے جس قسم کی سرگوشیاں جانی کے سوراخ کے راستے ارشاد کے کانوں میں منتقل ہو رہی تھیں وہ کسی کو بھی پاگل بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتی تھیں۔ ارشاد کا خون کھول کر رہ گیا۔

”یہ ارشاد اس وقت کیسے لپک پڑا۔“ شوکت مرزا نے عشی کی کسی بات پر ہتھ بندھ لگانے کے بعد

پوچھا۔

”پتہ نہیں بے وقت کیسے آگیا۔ دراصل اس کے باپ کی وصیت نے اس کے پیچ ڈھیلے کر دیے ہیں۔“ عشی کا طنز آلود فقرہ ارشاد کے سینے میں برما بن کر اتر گیا۔

”بے چارہ اپنے حواسوں میں ہی نہیں رہا ہے۔ نہ جانے چودہ سال زندہ بھی رہے گا یا اسی غم میں کھل کھل کر بہہ جائے گا۔“

”اب کیا کہہ رہا تھا؟“ شوکت مرزا احد سے بولا۔

”پرسوں آئے گا اور مجھے ساتھ لے کر سینڈس پٹ جائے گا۔“ عشی نے ارشاد کا مضحکہ اڑایا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اسے اتنا سر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ چودہ سال تک تو اس میں اور کسی فقیر میں کوئی فرق نہیں۔“

”ڈرائنگ..... وضعداری بھی کسی چڑیا کا نام ہے ایک دم پتہ کاٹنا مناسب نہیں مجھے تو بے چارے پر ترس بھی آتا ہے میں نے یکا یک ہری جھنڈی دکھادی تو کہیں خود کی نہ کر لے۔“

”تمہاری بلا سے خس کم جہاں پاک۔“

”اتنے ظالم نہ بنو۔ وہ بھی میرا دوست رہ چکا ہے۔ تمہیں تو دوسری کرنا چاہیے مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔“

”یہی وعدہ تم نے ارشاد سے بھی کیا تھا۔“ شوکت مرزا نے شکوہ کیا۔

”وہ وعدہ جھوٹا تھا بھی تو تمہیں بھی اس کے متعلق بتایا۔“ عشی زور سے ہنسی ارشاد کی آنکھوں کی جگہ انگارے دہک رہے تھے دماغ کی جگہ لاوا ابل رہا تھا۔

”اچھا..... اب میں چلتا ہوں۔“

”پھر کب آؤ گے؟“

”کل اسی وقت.....“

”میں انتظار کروں گی۔“ عشی نے بڑے چاؤ سے کہا۔

”میں زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا کیونکہ میں خود بھی زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“ شوکت مرزا کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پٹاخہ چلنے کی صدا بھی ارشاد کے کانوں نے سنی۔ وہ تیزی سے ہٹ گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس مرتبہ اس نے کار اشارت کرنے میں پھرنی کا مظاہرہ کیا اور ایک سیلیٹر پر پورا دباؤ ڈال دیا۔ اس کا چہرہ شعلہ رنگ ہو چکا تھا۔ عضلات تپتے ہوئے تھے اور سارے بدن میں شکست و ریخت کا عمل جاری تھا۔

پھر دفعتاً اس کی آنکھوں کے انگارے بھگ گئے اور ان انگاروں کی جگہ کامیابی کی چمک نے لے لی۔ چہرے کے نقوش بھی ڈھیلے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ ایسا نتیجہ جو ہر پہلو سے اس کے مفید تھا۔ بغیر لاٹھی کے سانپ مر رہا تھا اور سانپ کا منکا بھی ہاتھ آ رہا تھا۔ اس نے خوشی سے بے قابو ہو کر گاڑی کو دیوانہ وار لہرانا شروع کر دیا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سڑکوں پر ناچنا شروع کر دے۔ چلا چلا کر لوگوں کو بتائے کہ اس کے سارے دلدھر ہو چکے ہیں ساری مشکلات پر اس نے قابو پا لیا ہے اور اب..... اسے جینے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بازی اس کے ہاتھ لگ رہی تھی لیکن ابھی..... انتظار کرنا تھا۔

☆.....☆.....☆

کہتے ہیں کہ بڑا وقت کہہ کر نہیں آتا لیکن یہاں بات دوسری تھی۔ ارشاد کو ابہام ہو چکا تھا کہ بڑا وقت آگیا ہے کس کا؟ اس کا فیصلہ وقت کو کرنا تھا لیکن پھر بھی یہ طے تھا کہ بڑا وقت آگیا ہے اور

اوقت شوکت مرزا اور عشی کا تھا اتنا اندازہ ارشاد لہ تھا اور یہ یقین بھی کہ خود اس کا اچھا وقت آن ہا تھا۔ حالانکہ اچھا وقت بھی ڈنکے بجاتا ہوا نہیں آتا۔ ارشاد جن خطوط پر سوچ رہا تھا ان پر عام انسانی ذہن نہیں سوچ سکتا۔ یہ ارشاد کا ہی دماغ تھا اس کا منصوبہ اس کی نظر میں مکمل تھا ہر پہلو اس کے لیے سودمند تھا۔ ہاں ذرا سی قربانی دینا بھی پھر..... اس کی اجازت بغیر زندگی پھولوں سے عبارت ہو جاتی۔ دل ہی دل میں پلان ترتیب دیتے دے اس نے خود کو گلاب کی پتیوں سے بڑھ کر ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اپنی حکمت عملی پر آخری بار ناقدانہ نگاہ ڈالنے اور اسے ہر لحاظ سے مستحکم پانے کے بعد جب وہ بستر پر لیٹا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پر یاں اپنی ہانہوں میں جھلائے ہوئے لوریاں سنا رہی ہیں۔ عالم خواب میں انسان کی حیات بھی نوابیدہ ہو جاتی ہیں مگر ارشاد بھانت بھانت کی اہل باخوشبوئیں اپنی روح میں اترتی محسوس کر رہا تھا۔ دوسرے دن کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے وہ گہری نیند سو گیا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن کو آنا تھا سو آگیا۔ دنوں کا تو کام ہی آنا اور جانا ہوتا ہے۔ ارشاد سو کر اٹھا تو بے حد ہشاش بشاش اور تروتازہ تھا۔

اب اسے شام کا انتظار تھا۔ شام بھی آگئی کیونکہ شام کا کام بھی آنا اور رات میں ڈھل جانا ہوتا ہے۔ یہ ارشاد ہی جانتا تھا کہ یہ شام کس کی زندگی کی غروب ہوتی ہوئی شام ہے۔

وہ اٹھا کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا آٹھ بجے تھے۔ بے ساختہ اس کے حلق سے ایک قہقہہ برآمد ہو گیا۔ وارڈ روب سے ریو لور نکال کر اس

نے جیبر کا معائنہ کیا۔ جیبر خالی تھا۔ گولیوں کا پیکٹ تھوڑی سی تلاش پر مل گیا۔ اس نے ریو لور کا جیبر بد کیا اور چرخی گھما کر دیکھی۔ اس نے بھرا ہوا ریو لور پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور باہر جانے کے لیے مڑا۔ دروازے تک بھی نہ آیا تھا کہ کسی یکا یک آنے والے خیال کے تحت رک گیا۔ واپس وارڈ روب کے نزدیک آیا۔ ریو لور نکال کر اس کا جیبر خالی کیا اور گولیاں دوبارہ پیکٹ میں ٹھونس دیں ریو لور بھی وارڈ روب میں اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ وہ بے بات مسکرا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

عشی کے فلیٹ تک پہنچتے پہنچتے ساڑھے آٹھ بج گئے۔ اس نے اطمینان سے گاڑی پارک کی اور دبے پاؤں چلتا ہوا عشی کے دروازے پر کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ مدہم مدہم بے ہنگم سی آوازیں آرہی تھیں جن کو سننے کے لیے ارشاد کو سماعت کا پورا زور لگانا پڑا۔ اس کے ہونٹ دانتوں پر کسی بھیڑیے کے انداز میں کھینچ گئے۔ اس کی وہی کیفیت تھی جو شکار سامنے دیکھ کر خونخوار درندے کی ہوتی ہے۔ اس کا کان دروازے میں بنے ہوئے جالی کے سوراخ سے پیوست ہو گیا۔ تمام قوتیں سرگرم عمل ہو گئیں۔ بھری ہوئی سانس سن کر اس کی سانسیں بھی بے ترتیب ہو گئیں جنس تیز ہو گیا۔ سارا بدن بھی میں تپنے لگا انتقام کی بھیٹی میں وہ انتقام جس کی سزا نہ تھی جزا تھی اور ارشاد کی آرزوؤں کے عین مطابق تھی۔

وہ سیدھا کھڑا ہوا اور بائیں کاندھے کی بھرپور ٹکر دروازے پر ماری۔ ٹھیکے پر سنے ہوئے ابارٹمنٹ کا بظاہر دلکش دکھائی دینے والا لیکن باطن کھوکھلا کواڑ ارشاد کی ٹکر نہ سہار سکا اور قدم بوس

ہو گیا۔ اندر ارشاد نے جو کچھ دیکھا وہ غیر متوقع نہ تھا۔

شوکت مرزا اور عشی سکتے میں رہ گئے پھر ذرا ہوش ٹھکانے آئے اور اپنی حالت کا احساس ہوا تو یوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے جیسے مٹھنا طیس کے دوسرے قریب لانے پر جھٹکے سے الگ ہوتے ہیں۔ عشی ہونق شوکت مرزا سن تھا۔ اور ارشاد..... کمرے کے وسط میں دونوں ہاتھ کمر پر لگائے خون آلود لگا ہوں سے دونوں کو گھور رہا تھا۔

”کپڑے پہن لو شوکت مرزا..... میں نہیں چاہتا کہ تمہاری برہنہ لاش دنیا کے سامنے تماشہ بنے۔“ ارشاد کی سنجستہ آواز عشی اور شوکت مرزا کی ہڈیوں میں تیرتی چلی گئی۔ شوکت مرزا ایک کراٹھا اور تپائی پر رکھے کپڑے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر ارشاد نے اسے مہلت نہ دی۔ اس کی برداشت کا بیانیہ لبریز ہو کر پھلک اٹھا تھا۔ اس نے قالین پر رکھی ماربل کی خوبصورت تپائی اٹھائی سر سے بلندی پھر اس کا ہاتھ اس وقت رکھا جب شوکت مرزا کی بولہ بان عریاں لاش بے جان اور پھٹی پھٹی بے نور آنکھوں سے چمت کو گھور رہی تھی اس کے پیچھے کے چپترے کھوپڑی سے نکل کر سرخ قالین کو داغدار کر رہے تھے۔

عشی سنائے میں بیٹھی چپ چاپ سب دیکھ رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور جھنجھکاہیں شوکت مرزا کی عبرت انگیز لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ عشی کے چہرے پر نفرت سے تھوک گر ارشاد واپس ہوا جب بھی عشی کے گنگ جسمے میں جنبش نہ ہوئی۔

جاتے جاتے ارشاد نے دیکھا آس پاس کے لوگ فلیٹ کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے جھانک کر اندر ہونے والی واردات کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اُن کے رنگ فق تھے ہر ایک کی شکل پر

مختلف تاثرات تھے۔ ارشاد کو باہر آتا دیکھ کر اس میں بھلکڑی مچ گئی وہ یوں منتشر ہوئے جیسے ہلکے پھلکے بادل تیز آمدنی کا سامنا ہونے پر چھٹ جائے ہیں۔ ارشاد اُن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نکلتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

مقدمے میں ذرا بھی جان نہیں تھی۔ ارشاد بلا پس و پیش کیے اقبال جرم کر چکا تھا۔ چشم دید گواہ بھی موجود تھے۔

وکیل صفائی نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اتنا ہی ثابت کر سکا کہ یہ قتل عمد نہیں بلکہ اشتعال کا رد عمل ہے۔ دلیل پرمغز بھی گواہوں نے بھی اس کی تائید کی موقع واردات پر ارشاد کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ گھر سے ارادہ قتل کر روانہ نہیں ہوا تھا۔ جس تپائی سے اس نے شوکت مرزا کو ہلاک کیا وہ عشی کی ملکیت تھی اور دوران قتل ارشاد نے عشی کے کمرے سے ہی اٹھا کر استعمال کیا تھا۔

عشی اور ارشاد کی محبت کے بھی لا تعداد شہادت تھے اور عشی کی بے وفائی کی ٹھوس شہادتیں بھی دستیاب تھیں سب سے بڑی شہادت تو موقع پر شوکت مرزا کی قابل اعتراض حالت میں پڑی ہوئی لاش تھی۔

عدالت میں ارشاد نے اقرار کیا کہ عشی اس کی پہلی اور آخری محبت ہے اور وہ اپنی اس پوچی میں غبن برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا چنانچہ یہ قتل اس سے سرزد ہوا۔“

چونکہ ملزم ہی مزاحمت پر آمادہ نہ تھا لہذا چند ہی پیشیوں میں فیصلہ ہو گیا۔

عمر قید کی سزا سن کر کوئی اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا ارشاد نظر آ رہا تھا۔ نہ تو اس کے سراپے پر سوگواری طاری تھی اور نہ ہی کسی قسم کے چپچٹاؤے یا قلق کا

اظہار ہو رہا تھا۔

عدالت کے کٹہرے سے اتر کر وہ جیل جانے لگا تو اس کا وکیل تاسف سے بولا۔

”مجھے بے حد افسوس ہے ارشاد صاحب میں آپ کو اس طویل سزا سے نہ بچا سکا۔ آپ نے میرا لبنا بھی تو نہیں مانا آسانی سے ہتھیار ڈال دیے۔“

”آپ ناحق افسوس کر رہے ہیں وکیل صاحب مقدمے کا فیصلہ میری مرضی کے عین مطابق ہوا ہے اور یہ مجرم کی خوش بختی ہوتی ہے کہ وہ حسب مزاج سزا پانے میں کامیاب ہو جائے۔“ ارشاد نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

”پھر بھی..... درست ہے کہ حالات سے بھوتہ کر لینا دل گردے کی مضبوطی کی دلیل ہے لیکن یہ عرصہ بہت طویل ہوگا۔ آپ ذرا سی اہت لرتے تو اس مدت معیاد میں کی ہو سکتی تھی۔“

ارشاد نے وکیل کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں آپ کی ذہانت کا تہہ دل سے معترف ہوں۔ آپ نے حتی الامکان سعی کر ڈالی مگر وکیل صاحب..... اپنی پسند کی سزا پانا بھی تو اعزاز ہے آپ مطلق شرمندہ نہ ہوں۔ میں بہت خوش ہوں مرقید کی سزا چودہ برس ہوتی ہے نا۔“

وکیل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ارشاد زور سے ہنس دیا۔

وکیل صاحب سمجھے کہ چودہ برس کے عرصے کی نقدیق اُن کی زبان سے سن کر ارشاد کے اوسان ظاہر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔

”اس مدت میں تھوڑی بہت کی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور اس کا دار و مدار جیل میں آپ کے چال چلن پر ہوگا۔“

”اوہ وکیل صاحب..... آپ کیسے وکیل ہیں

کہ اپنے موکل کو نہیں سمجھتے“ میں ذرا برابر پریشان نہیں ہوں اور نہ ہی سزا میں کی کا خواستگار ہوں جتنی بیشی ہوا اتنا ہی اچھا ہے۔“

”آپ جیسا آپنی اعصاب کا مالک میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔“ وکیل صاحب اسے ستائش سے دیکھ رہے تھے۔ ارشاد نے وکیل صاحب کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور ہنسا جھکا کر بولا۔

”آپ کے تجربے میں مجھ سا مجرم کوئی نہ آیا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ بھی نہ آئے.....

میں نے..... نرالا کھیل کھیلا ہے وکیل صاحب۔ ایک تیرے دو شکار کر لیے ہیں۔ ایک بیٹھ دو کاج والا محاورہ مجھ پر صادق آتا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں نے محاروں کو خود پر صادق کر دکھایا ہے۔ جس سزا کو آپ سزا کہہ رہے ہیں میرے لیے وہ جزا ہے اور میں اسی جزا کا طالب تھا۔ میں نے بازی جیت لی ہے وکیل صاحب ہمارا نہیں ہوں۔“ وہ رُکا پھر اس نے بے حد تشکر سے کہا۔

”میں آپ کا بے حد مشکور ہوں وکیل صاحب کہ آپ نے مجھے پھانسی سے بچالیا اور نہ..... سارا کھیل بڑ جاتا۔“ سپاہی ارشاد کی چھٹکریاں کھینچتا ہوا چل پڑا۔ وکیل صاحب ہکا بکا کھڑے اس سر پھرے نوجوان کو تک رہے تھے جس نے عمر قید کی سزا پائی تھی پھر بھی اپنے وکیل کے لیے اس کی آنکھوں میں ممنونیت کا طوفان موجزن تھا اسے اپنے وکیل سے گلہ نہ تھا نا لاش کا شکوہ نہ تھا بلکہ وہ وکیل کا شکر گزار تھا سزا پانے کے باوجود.....

☆.....☆.....☆

سزا بھگتتے کے دوران ارشاد نے دابستہ ایسے چال چلن کا مظاہرہ نہیں کیا جو اس کی معیاد اسیری میں کی کا سبب بن سکتا۔

ایک روز سپاہی نے آکر بتایا کہ اس کی ملاقات آئی ہے تو وہ ششدر رہ گیا۔ تھائی کون جو اس سے ملنے آتا۔ سیٹھ امداد دھامڑا کے اونچے شعلے کی اس نے جس طرح سچ چوراہے میں دھجیاں بکھیری تھیں وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے پھر ارشاد کا منہ کیوں دیکھتے۔ آخری مرتبہ انہوں نے فیصلے کے دن ارشاد کی صورت دیکھی تھی اور فیصلہ سنتے ہی کمرہ عدالت سے رخصت ہو گئے تھے بغیر ملے وہ دن اور آج کا دن سیٹھ امداد دھامڑا اس سے ملنے نہیں آئے۔ خود ارشاد کو ان کی آمد کا یقین نہیں تھا۔

عشی کو ملاقات کے لیے آیا دیکھ کر ارشاد کو ایک نیا ذہنی جھٹکا لگا۔ اس نے طعن و تشنیع کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

”غالبا اپنے چہیتے شوکت مرزا کی رحلت پر مجھے لعنت ملامت کرنے آئی ہو۔“ اس نے جلے کسے لہجے میں کہا۔ جواب میں عشی کچھ نہ بولی زار و قطار رو پڑی۔ ارشاد کی حیرت دو چند ہو گئی۔

”ابھی تک شوکت مرزا کے گل کا دھم ہرا ہے..... کیوں؟“ اس نے بے دردی سے دوسرا تیر چلایا۔ عشی کے آنسوؤں کی روانی تیز ہو گئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ارشاد کے قدموں میں گر پڑی۔

”مجھے معاف کر دو ارشاد..... خدا کے لیے مجھے معاف کر دو..... میں بہک گئی تھی۔“ اس کے الفاظ ہچکیوں میں ڈھل کر زبان سے باہر آ رہے تھے۔

”مجھے بہکانے میں شوکت مرزا کا ہاتھ تھا۔ مانتی ہوں کہ میں اس کی باتوں میں آ گئی۔“ یہ نئی صورت حال ارشاد کو بوکھلانے کے لیے کافی تھی۔

”یہ کیا پا کھنڈ پھیلا یا ہے تم نے؟“

”میرا یقین کرو ارشاد..... مجھ پر بھروسہ کرو میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ ان سارے حالات کا ذمہ دار وہی مردود شوکت مرزا تھا تم نے اچھا کیا اُسے مار دیا وہ اسی ذلیل موت کا مستحق تھا۔ خطا میری بھی ہے میرے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ اسی کی معافی مانگنے آئی ہوں۔ آخر انسان اور فرشتہ میں یہی تو فرق ہوتا ہے میں بھی انسان ہوں خطا وار ہوں جو چاہے کہہ لو جیسی سزا چاہے دے لو مجھے قبول ہے کم از کم دل سے ایک بوجھ تو ہٹ جائے گا۔ خدا کے لیے ارشاد مجھے معاف کر دو درگزر کر دو مجھے رہ رہ کر تمہاری محبت کی گہرائیاں ڈراتی ہیں تمہاری کچی جاہت کے ناگ ڈستے ہیں میں واقعی اس قابل نہیں تھی جتنا تم نے مجھے چاہا۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ تم اندر سے چٹان نکلو گے۔ میں تو تمہارے دیوانے پن کو محض دل لگی سمجھ رہی تھی۔“

عشی کی لرزیدہ آواز لمحہ لمحہ مدہم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ارشاد کا دل پکھل پکھل کر آنکھوں کے راستے باہر آنے لگا۔

”اب تم کیا چاہتی ہو؟“ ارشاد جب بولا تو اس کی آواز مرعش ہو چلی تھی۔

”میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو وقت گزر گیا عقل آئی تو اب جب تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔“ عشی کی کیفیت اب ایسے جواری جیسی تھی جو اپنی کل جمع جھنڈاؤں پر لگا کر ہار چکا ہو اور قمار خانے کے باہر شکست خوردہ کھڑا چاروں طرف حسرت سے دیکھ رہا ہو کہ شاید کہیں سے کوئی فیبی مدد آ جائے۔ ارشاد چیپ رہا۔

”میرے اوپر تمہارا یہی احسان بہت ہو گا کہ تم مجھے دل سے معاف کر دو گے ورنہ یہ بچو کے مجھے

یہی چین نہیں لینے دیں گے۔“ عشی کی ہمت نہ تھی کہ ارشاد سے آنکھیں چار کر سکتی۔ اس کا سر بہ طور جھکا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ارشاد نے لمبا سانس بھر کر کہا۔

”میں نے تمہیں دل سے معاف کیا۔“

”سچ ارشاد.....“ اُسے شادی مرگ ہو گیا تھا۔ یقینی اور بے یقینی کے درمیان اس نے پھر تعذر بق چاہی۔

”تم نے مجھے معاف کر دیا؟“

”ہاں.....“

”تم عظیم ہو ارشاد..... سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا کہوں کیا مطلب دوں کس نام سے پکاروں۔“ وہ پتہ نہیں کیا کچھ کہتی رہی۔ ارشاد کے کان کچھ نہیں سن رہے تھے البتہ اس کی روح پر نہ شبہ و ارا لفاظ کی پھوار برس رہی تھی۔ تو بازی اب ملل طور پر میرے اختیار میں آ گئی ہے۔ ارشاد نے دل ہی دل میں سوچ کر بے اختیار خدا کا شکر ادا کیا۔

تمام گلے شکوے دھل دھلا کر صاف شفاف ہو گئے تھے۔ وہ دونوں ملاقات کا وقت ختم ہونے تک ایک دوسرے میں کھوئے رہے کبھی ماضی کی الغریب یادیں زیر بحث آئیں کبھی حال کی تلخیاں اور کبھی مستقبل کے دھندلے جاتے جاتے عشی نے بھرپور اعتماد سے ارشاد کو یقین دلایا۔

”مابوس مت ہونا ارشاد..... تم اکیلے یہ سزا نہیں کاٹ رہے میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم سلاخوں کے پیچھے ہو اور میں سلاخوں کے باہر..... میں انتظار کروں گی۔“

”کیا تم اتنا مہر کر سکو گی؟“ ارشاد نے توثیق چاہی۔

”ہاں..... تمہاری خاطر چودہ تو کیا چودہ سو سال بھی گزارنا پڑے تو میں تامل نہ کروں گی۔ مگر..... تم بھی وعدہ کرو کہ مجھے فراموش نہیں کرو گے۔“

ارشاد نے خوشدلی سے قہقہہ لگایا۔

”اگر تمہیں فراموش کر دینا اتنا ہی سہل ہوتا تو شوکت مرزا اپنی جان سے نہ جاتا۔“

☆.....☆.....☆

قدرت کو ان کا عارضی ملاپ بھی گوارا نہ تھا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ارشاد کا تبادلہ لاہور جیل کر دیا گیا۔

عمر بعض لوگ قدرت سے بھی لڑ جھگڑ کر اپنی مرضی کر لیتے ہیں۔ لاہور جیل منتقل ہوئے ارشاد کو دو ماہ بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ عشی اس سے ملنے پہنچ گئی۔ یہ انکشاف ارشاد کو متعجب کر گیا کہ عشی ہمیشہ کے لیے کراچی کو خیر باد کہہ کر مستحکم لاہور کی سکونت اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

”لاہور کیوں آ گئیں؟“

”تمہارے بغیر کراچی میں رہ ہی کیا گیا تھا..... اور پھر..... شوکت مرزا کے گل کا واقعہ زبان زد عام ہو چکا ہے۔ میں ماضی کو بھلا دینا چاہتی ہوں۔ کراچی میں رہتے ہوئے ایسا ممکن نہ ہوتا۔“

”اچھا کیا تم نے.....“ ارشاد نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ پھر ذرا سنبھل کر بولا۔

”عشی..... تم یہاں جیل آنے سے ذرا پرہیز ہی کیا کرو۔“

”کیوں؟“

”بس..... مجھے اچھا نہیں لگتا..... عجیب عجیب قسم کے لوگ یہاں پائے جاتے ہیں ویسے بھی ہمیں ایک اعلیٰ مستقبل کا آغاز کرنا ہے اور اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ ماضی سے یکسر ناطہ توڑ لیا

جائے اور حال سے بھی کم از کم رابطہ رکھا جائے۔“
ارشاد مختلف زاویوں سے عشی کو قائل کرتا رہا۔
بات معقول تھی عشی کی سمجھ میں آگئی اب اس نے
ملاقات کے لیے آنا کم کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

چار برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ارشاد کا
تبادلہ ملتان جیل ہو گیا۔ اسے اطمینان ہوا کہ فاصلہ
زیادہ ہو جائے گا تو عشی کی آمد و رفت بھی خود بخود
کم ہو جائے گی۔ ایسا ہی ہوا آہستہ آہستہ عشی نے
آنا بند کر دیا۔ اس کے لیے لاہور سے ملتا کا سفر
آسان نہیں تھا دوسرے اس میں ارشاد کی بھی رضا
تھی۔

روشن مستقبل کی تیاریاں ارشاد نے زور و شور
سے شروع کر دی تھیں۔ اس کا رویہ اپنے ساتھی
قیدیوں سے بالکل بدل گیا تھا ہر وقت ہونٹوں پر
مسکراہٹ رہتی دکھ سکھ میں پیش پیش رہتا تھا اور وہ
جیل کے حکام کو بہتر سے بہتر چال چلن کا ثبوت مہیا
کر رہا تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وقت کے
پر نکل آئے اور ناگوں میں بجلی بھری۔

☆.....☆.....☆

نیا قیدی آتا ہے تو کچھ دن اداس رہتا ہے اور
پھر ماحول سے مسابقت پیدا کر کے گرد و پیش میں
دچکپی لینا شروع کر دیتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی
چارہ نہیں ہوتا۔ مگر تین مہینے گزر گئے اور ظفر جوں کا
توں رہا دلبرداشتہ و بیگانہ اس کے رویے میں کوئی
تبدیلی نہ آئی۔ ارشاد کو اس نوجوان کو بجا بجا دیکھ
کر افسوس ہوتا تھا۔ کوئی بہت گہرا دم اس کے دل
پر نقش تھا جو کسی طرح مندمل ہونے کا نام نہیں لے
رہا تھا۔

کئی مہینے ارشاد اس کا خاموشی سے جائزہ لیتا
رہا۔ تجزیہ کرتا رہا اور منتظر رہا کہ وہ حالات سے

سمجھوتہ کر لے لیکن بے سود..... دن گزرنے کے
ساتھ ساتھ ظفر کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔
صحت جواب دے رہی تھی، آنکھوں کے گرد حلقے
پڑ گئے تھے۔ رخسار پچک گئے تھے اور بالوں میں
سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ ارشاد کو اس پر بڑا ترس آیا۔
اس نے تہیہ کر لیا کہ ظفر کو کھٹکال کر رہے گا۔
موقع پا کر اس نے گفتگو چھیڑی۔

”دوست..... مجھے تمہارا نام تو معلوم ہے لیکن
اس کے باوجود ہم آپس میں اجنبی ہیں۔“ ظفر نے
گردن اونچی کر کے اپنی نظر ارشاد پر ڈالی اور
دوبارہ ہان بننے میں مشغول ہو گیا۔

”ایسا لگتا ہے کہ تم ابھی تک جیل سے آشنا نہ
ہو سکے ہو یہ غلط ہے۔“ ظفر اب بھی کچھ نہ بولا۔
ارشاد کہتا رہا۔

”جیل کی دنیا باہر کی کائنات سے جدا ہوتی
ہے۔ یہاں سب ایک جیسے ہوتے ہیں لہذا آپس
میں میل محبت سے رہتے ہیں۔ دوسرے سے دل کا
حال کہہ دینا بہتر ہوتا ہے، پوچھ لگا ہو جاتا ہے۔
حالانکہ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ جب تک
تمہاری سزا پوری نہیں ہو جاتی باہر کی خود غرض دنیا
کو بھول جاؤ وہاں بڑی نفسانسی ہے بڑی بھیڑ
بھاڑ ہے اتنی کہ بھائی بھائی کو نہیں پہچانتا۔ آزاد
ہو کر نئی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کرنا۔ لیکن
تمہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تم آزاد ہونے تک
زندہ نہیں رہو گے مر جاؤ گے۔ تم خود اپنے آپ کو
قتل کر رہے ہو۔“ ظفر کا دل بھرا آیا اس کی آنکھوں
میں نمی تیر گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے بھی علم ہے کہ تمہارا نام ارشاد ہے۔“
”اور کیا جانتے ہو؟“ ارشاد مسکرایا۔

”تمہارے جرم کی نوعیت بھی پتہ ہے۔“
انجائیت پا کر دھیرے دھیرے ظفر کھل رہا تھا۔

”پھر بھی تم سبق نہیں لیتے۔“
”مجھے حیرت ہوتی ہے۔“
”کس پر.....“

”تم پر..... تمہاری حالت پر..... قتل کا کوئی
ہرم میں نے اس قدر مطمئن نہیں دیکھا۔“ ارشاد
نے قہقہہ لگایا۔

”تو تمہیں یہ بھی خبر ہوگئی کہ میری رہائی میں
صرف چار دن باقی رہ گئے۔“

”اسی پر تو تجب ہے پوری سزا کاٹ کر بھی تم
بے حد تردد تازہ نظر آتے ہو۔“ ظفر نے ارشاد کی
صنعت کو سراہا۔

”اسیری کے دوران میرے وزن میں بائیس
پونڈ کا اضافہ ہوا ہے۔“ ارشاد نے سینہ پھلا کر فخر
سے بتایا۔

”مجھے اپنے آپ پر دکھ ہوتا ہے اور تم پر
انتخاب..... وجہ یہ ہے کہ میرے اور تمہارے جرم
میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں ہے۔ قریب قریب ایک
سا جرم ہے ایک سی سزا ہے۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا۔“ ارشاد نے سفید جھوٹ
بلا۔

”ذرا بتاؤ تو سہی تم یہاں کیسے آن پہنچے؟“
”ایک عورت کی خاطر۔“ ظفر نے پھر سر
ہلاتا لیا۔

”کیا اُسے دوسری دنیا روانہ کر دیا؟“ ارشاد
نے بشارت سے دریافت کیا۔

”نہیں..... اُس کے آشنا کو..... میں بھی
تمہاری طرح غصے سے دیوانہ ہو گیا تھا۔“

”اس دیوانگی پر شرمندگی نہیں غرور ہوتا
پا ہے۔“ ارشاد نے اس کا دل بڑھایا۔

”اپنی محبت میں نقب برداشت کرنے والے
بغیرت ہوتے ہیں مجھے مسرت ہوگی اگر تم مجھے

تفصیل سے ایک ایک بات سناؤ۔ اپنے جیسے
دیوانوں سے مل کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔“
اس سے قبل کہ ظفر اپنی داستان سنانا سپاہی
نے ارشاد کو پکارا۔

”کیا ہے؟“ بے وقت کی خلل اندازی ارشاد
کو گراں گزری۔

”تمہاری ملاقات آئی ہے۔“
”غلط فہمی ہے تمہاری مجھ سے ملنے بھلا کون
آ سکتا ہے۔ جاؤ کسی اور ارشاد کا بلا دواؤ گا۔“

”نہیں..... سارے قیدیوں میں ارشاد
دھماڑا اولاد امداد دھماڑا تم اکیلے ہو اور ملاقاتی نے
اسی نام کے قیدی کو بلوایا ہے۔“ سپاہی نے بیزاری
سے کہا اور ارشاد کا جواب سننے بغیر واپس روانہ
ہو گیا۔

ارشاد اُسی الجھن میں گرفتار تھا کہ اس سے
ملاقات کرنے کون آ سکتا ہے۔ بہر حال وہ ملاقاتی
کمرے میں پہنچا۔

”ارے وکیل صاحب آپ کیسے؟“ اشتیاق
رضوی کو مقابل دیکھ کر ارشاد دم بخود رہ گیا۔

”بس ایسے ہی..... تم سے ملنے آ گیا۔“ وکیل
صاحب نے مسکراتے کی کوشش کی اور سر جھکا کر
سوچنے لگے۔

”فرمائیے۔“ ارشاد نے بے تاب سے پوچھا۔
”سیٹھ صاحب کی وفات کی اطلاع تو تمہیں مل
گئی ہوگی۔“

”جی ہاں لیکن یہ تو بہت پرانی خبر ہے کئی سال
گزر گئے ڈیڈی کے انتقال کو۔“

”ہوں.....“ وکیل صاحب نے ہنکارا بھرا اور
ارشاد اُن کی خاموشی پر کھلا کر رہ گیا۔

”تمہاری سزا کب ختم ہو رہی ہے۔“
”چار دن اور رہ گئے ہیں۔“

بے مصرف اور بے قیمت

لاشیں سب اٹھوائی گئی ہیں
جتنے زخمی تھے اُن کو امدا فرما کر دی گئی ہے
جسموں کے ٹکڑے اعضا اب وہاں نہیں ہیں جہاں پڑے تھے
سب کچھ ویسا ہے جیسا اُس بم کے پھٹنے سے پہلے تھا
البتہ مرنے والوں کے ٹوٹے ہوئے اربانوں کا اک ڈھیر ابھی تک وہیں پڑا ہے
جھلے ہوئے اور سخ شدہ خوابوں کا بھی انبار لگا ہے
اربانوں اور خوابوں کا کیا کر سکتے ہیں ہم
اُن کو دفنانے کے بارے میں بھی کوئی حکم نہیں ہے
جن کے تھے یہ اُن کے سوا کسی اور کے کام نہیں آسکتے
ان کی کوئی قیمت ہوتی تو کباز ہی لے جاتا
بالکل ہی بے مصرف ہیں نئے قیمت ہیں یہ
آؤ کہ ہم سب مل کر ان کو دور نہیں پھینک آئیں جا کر
اس سے قبل کہ گلے سڑے اربانوں اور خوابوں سے اٹھنے والا نقض ساری فضا آلودہ کر دے
آخر ہم اس شہر کو صاف رکھیں گے تو آئندہ نسلیں
صحت مند اور صاف فضا میں پیدا ہوں گی
یہ نشانیں اس کے بعد ہمیں اپنے بچوں کو یہ سمجھانا ہوگا
ان اربانوں اور خوابوں کے کتنے مضر اثرات ہیں ممکن
تاکہ ہمارے بچے ان سے دور رہیں اور چین سے اپنی عمر گزاریں
ویسے تم نے غور کیا ہے؟
اربانوں اور خوابوں کی لغت میں ہم سب کی محنت سے کتنے قلیل عرصے میں کتنی کمی ہوئی ہے؟
اب تو یوں لگتا ہے جیسے پولیو اور چپ دق سے بھی پہلے شاید
اربانوں اور خوابوں کی مہلک بیماری مٹ جائے گی
خیر ابھی تو ہاتھ بڑھاؤ
اربانوں اور خوابوں کا یہ ڈھیر ہٹاؤ
بے مصرف اور بے قیمت انبار اٹھاؤ!

عرفان ستار

وکیل صاحب اس کی بھری ہوئی سانسیں دیکھ کر
گھبرا گئے۔

”تم تلی رکھو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے
پہلی وصیت کی بابت تمہیں بتانے کے بعد سیٹھ امداد
نے اس میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا تھا۔ وجہ یہ بھی کہ
چودہ سال کی بندش کا سن کر تم نے جو برتاؤ اُن کے
ساتھ روا رکھا وہ اس سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ تمہارا
جو رویہ چودہ سال کی شرط سننے کے بعد ہو گیا تھا اس
سے وہ ہر دم خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا
کہ تم غصے میں دیوانے ہو کر اُن کی جان نہ لے
لیتھو۔۔۔۔۔۔ چنانچہ انہوں نے اپنی وصیت میں یہ مزید
شرط بھی شامل کر دی کہ اگر تم نے نفل کا جرم کر لیا تو اُن
کی تمام دولت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ
گے۔“ پھر یہ ہوا کہ تم نے واقعی شوکت مرزا کو مار
ڈالا۔“

”اس واقعے کے بعد سیٹھ امداد بہت پریشان
رہنے لگے تھے اسی دوران ان پر دل کا دورہ پڑا۔ پھر
تم جیل چلے گئے اور سیٹھ صاحب اسپتال میں داخل
رہے۔ انہوں نے گاہ بگاہ مجھ سے تذکرہ بھی کیا
کہ وہ طبیعت سنہلتے ہی وصیت نئے سرے سے لکھیں
گے جس کی رو سے تم رہا ہوتے ہی تمام جائیداد کے
مالک ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔۔ لیکن موت نے انہیں مہلت نہ
دی اور وہ کوئی تحریری بیان دینے سے پہلے ہی خالق
حقیقی سے جا ملے۔ اب اُن کی ایک ہی وصیت ہے
جس پر ان کے دستخط ہیں اور وہ وصیت تمہارے لیے
قاتل ہے۔“ وکیل صاحب خاموش ہو گئے۔
”تو پھر اس دولت کا کیا بنے گا؟“ ارشاد کی
آواز کنویں میں سے برآمد ہو رہی تھی۔

”جو بن رہا ہے۔۔۔۔۔۔ مصیبت کے مطابق وہ
ساری دولت و جائیداد فلاحی اداروں کے نام کر دی
گئی ہے۔“ اس کے آگے بھی اشتیاق رضوی نے

وکیل صاحب دوبارہ سوچوں میں گم ہو گئے۔
ارشاد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”آپ خاموش کیوں ہیں وکیل صاحب؟“
”کاش میں خاموش کا خاموش ہی دنیا سے اٹھ
جاتا۔ لیکن افسوس مقدر میں یہ نہیں تھا۔“
”آخر کیوں؟“ ارشاد کے رگ و پے میں
سرسریاں ہی رینگنے لگیں۔

”یہ خبر سناتے ہوئے مجھے رنج ہو رہا ہے۔“
وکیل صاحب واقعی مقوم تھے۔

”آپ صاف صاف بتائیے وکیل
صاحب۔۔۔۔۔۔ مٹی لپٹی رکھے بغیر۔۔۔۔۔۔ میں ہر قسم کی خبر
سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔“ ارشاد نے کہہ تو دیا تھا لیکن
درحقیقت اس کی ہمت پست ہو رہی تھی۔

”تم کہتے ہو تمہاری سزا چار دن کی رہ گئی ہے۔“
”جی ہاں۔۔۔۔۔۔ یہ درست ہے۔“ ارشاد نے
جلدی سے کہا۔

”یہ غلط ہے۔۔۔۔۔۔ تمہاری سزا ساری عمر پوری نہ
ہوگی۔“

”کیا مطلب؟“

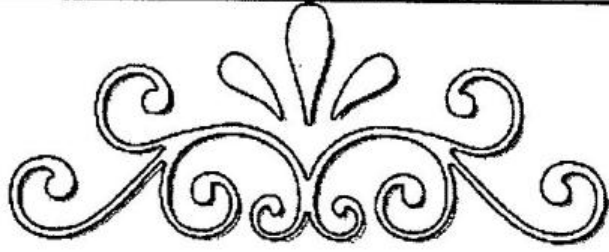
”مطلب سمجھنے کے لیے پتھر کا دل چاہیے۔“
اشتیاق رضوی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

”اپنے باپ کی لامحدود دولت کے اکھوتے
وارث ہوتے ہوئے بھی تم اس میں سے ایک پیسے
کے بھی حقدار نہیں رہے۔“ وکیل صاحب نے دھماکہ
کر دیا۔ ارشاد اچھل پڑا۔

”کیا بکواس کر رہے ہیں آپ؟“

”یہ بکواس نہیں تمہارے مرحوم باپ کی وصیت
ہے۔“

”ایک وصیت کی خاطر تو میں نے جان بوجھ کر
چودہ سال کی قید خرید لی۔ یہ دوسری وصیت کہاں سے
آگئی۔“ ارشاد دھتکے سے اکھڑ گیا۔



دوسری دنیا

مگر کل رات کو جب
میرا بیٹا، فیس بک کھولے ہوئے تھا
اور بیٹی اپنے موبائل پر سمر ڈھونڈتی تھی
دوستوں کے، جن کو اس نے
اپنے کانچ کے بھی قصے سنانے تھے
ایک ایک میں نے کچھ پوچھا
نہ جانے کیا کہا تھا
ذہن میں بالکل نہیں لیکن
بس اتنا یاد ہے مجھ کو
کبھی چھوٹے سے اک پل میں
بظاہر نرم لہجے میں
کئی اک بات
پھر بن کے لگتی ہے
مجھے اُس پل نے
جو میرے اور اُن کے بیچ حائل تھا
بہت دیر سے سمجھایا
کہ بچے آج جس دنیا میں رہتے ہیں
یہ ہے اک ”دوسری دنیا“
تم اس دنیا سے باہر ہو

حمیرا راحت

ابھی کچھ دن ادھر کی بات ہے
جب میرے بچوں نے
میری آنکھوں سے اُس دنیا کو دیکھا تھا
(جو دنیا میری دنیا تھی)
میں اک پل بھی زمانے اور اُن کے درمیاں
پہچان تھی
اُن سارے رستوں کی
جو بالکل اجنبی تھے اُن کی آنکھوں کے لیے
انگلی پکڑ کر میری بچے
جب کبھی باہر نکلتے تو
سوالوں سے بنی زنجیر
قدموں میں مرے یوں ڈال دیتے کہ
سفر کرنا مراد دشوار ہو جاتا
مگر پھر بھی
میں اپنی آنکھوں کو اک طرف رکھ کر
تخل سے جواب ہر بات کا دیتی
سمجھتی تھی کہ اُن کو
میرے تفصیلی جوابوں کی ضرورت ہے
تجبی تو وہ میری دنیا کو جانیں گے

”رہائی مبارک ہو۔“
”شکریہ اب اپنی کہانی سناؤ۔“ ارشاد پھسکڑا مار
کر بیٹھ گیا۔

”میں نے بھی قتل کیا ہے تمہاری طرح.....
اشتعال میں آ کر۔“ ظفر رک گیا۔ اسے شاید کہانی
سنانے کے سلیقے سے آگئی نہ تھی۔
”کسے؟“

”اس کے آشنا کو۔“
”وہ کون تھی؟“

”میری آشنا..... صرف آشنا ہوتی تو شاید مجھ
سے قتل سرزد نہ ہوتا لیکن وہ ہر جانی بھی تھی بے وفا
تھی اور یہی اس قتل کا محرک تھا۔“
”تو پھر اس عورت کو سزا دینی تھی۔“

”یہی غلطی ہوگئی..... اس لمحے میں اندھا ہو چکا
تھا۔ اس کے یار کا میں نے قیام نہ دیا۔“ ظفر کے
جڑے پھینچ گئے۔

”تمہیں اس عورت سے بہت محبت تھی؟“

ارشاد کے سوال پر ظفر نے اسے ایسے دیکھا
جیسے بزرگ ننھے بچوں کے بے معنی سوالات پر دیکھتے
ہیں۔

”جس سے شدید محبت ہو اسی کے لیے قتل جیسا
تنگین جرم ہے دھڑک کیا جاسکتا ہے۔“
”وہ بھی تمہیں چاہتی تھی۔“ ارشاد کو دلچسپی
ہوئی۔

”اس کا یہی کہنا تھا۔“ ظفر نے مختصر سا جواب
دیا۔ چند ثانیے دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ پھر
ارشاد نے پہل کی۔

”نام کیا تھا اُس ہر جانی کا؟“

”عشرت.....“

ارشاد بری طرح چونکا۔

”کہاں رہتی تھی؟“

بہت کچھ کہا۔ ارشاد کی ڈھارس بندھائی مگر ارشاد کے
کان سن ہو چکے تھے۔ زبان مفلوج تھی اور آنکھیں
پتھر لگی تھیں۔

اپنی مانوس کوٹھری میں اسے تمام رات نیند نہ
آئی۔ یہ سانحہ روح فرسا تھا اس اور اس سے مفر بھی
ممکن نہ تھا۔ دنیا میں اب رہ ہی کیا گیا تھا۔ جس
دولت کی خاطر اس نے چودہ سال قید بھگتی وہی اس
سے چھن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے سیلاب جاری
ہو گیا۔ کچھ بھی تو باقی نہ بچا تھا..... پھر..... گھٹا ٹوپ
اندھیرے میں ننھا سا ستارہ ٹٹمٹمایا۔ ابھی بہت کچھ
باقی تھا دنیا بھر نہیں ہوئی تھی زندہ رہنے کا ایک سہارا
ایک مقصد ہی گیا تھا۔ اور یہ سہارا یہ مقصد تھا.....
عشی.....

ارشاد کے آنسو ختم گئے۔ بدن میں پھیلتی ہوئی
آگ سرد پڑ گئی اور..... وہ پُر سکون گہری نیند کی
آغوش میں گم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اب وہ وہی پرانا والا ارشاد تھا..... پہلے جیسا
چلبلا زندہ دل سارا دن اس نے اپنی خوش گزاردیا۔
”ہاں تو پیارے ہماری بات چیت ادھوری رہ
گئی تھی۔“ ارشاد نے ظفر کے کندھے پر دباؤ ڈال کر
گر جوشی سے کہا۔

”کیا کرو گے سن کر۔“ ظفر نے اس انداز میں
نالٹا چاہا جس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب
کچھ بتا دینے کا دلی طور پر خواہشمند ہے۔
”خوش ہوں گا۔“

”اس میں خوشی کا کون سا پہلو ہے۔“

”ہے..... اور پھر کل صبح میری رہائی بھی ہو رہی
ہے اس سے اچھا موقع پھر نہیں ملے گا۔ خدا جانے
پھر ملاقات ہوئی بھی ہے کہ نہیں۔“ ظفر نے افسردگی
سے اسے دیکھا۔

یادِ سیموم

☆..... ایک ایسی تحریر جو

آپ کو برسوں یاد رہے گی

☆..... دوشیزہ کی مصنفہ

ڈاکٹر سیمیں رخ کے قلم سے

☆..... ناقابل فراموش تحریر

☆..... ستمبر سے دوشیزہ کے

صفحات پر

تھی۔ اس قسم کی بے چینی کا اسے پہلے بھی ایک دفعہ تجربہ ہو چکا تھا۔ شوکت مرزا کو جہنم رسید کرنے سے چند ثانیے پیشتر اس کی یہی کیفیت ہوئی تھی۔

وہ دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا ظفر کے قریب آیا۔

ظفر دنیا و مافیہا سے بے خبر لمبی تانے سورہا تھا۔ ارشاد کے ہاتھوں کی مچھلی بڑھ گئی انگلیاں سخت ہو گئیں..... وہ جھکا..... اس نے اپنی انگلیوں کو غور سے دیکھا بار بار کھولا اور بند کیا۔ اس کی آہنی گرفت میں یقیناً ظفر کو آواز نکالنے کی بھی گنجائش نہ ہوگی۔

وہ دوزانو بیٹھ گیا..... دونوں ہاتھ آگے بڑھائے..... اس کے ہاتھ ظفر کی گردن کو چھو رہے تھے..... پھر..... ذہن کے کسی گوشے میں کونسا سال رکا عجیب سا جھماکہ تھا وہ جس کی چکا چوند میں ارشاد کو سب کچھ واضح نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ ظفر کی گردن دبوچے بغیر واپس آ گئے۔

وہ اپنی جگہ آ کر لیٹ گیا۔ صبح اس کی رہائی ہونے والی تھی..... وہ حساب لگانے لگا۔ جیل سے رہا ہونے پر کچھ رقم بھی دی جاتی ہے۔

وہ تھیندہ لگا رہا تھا۔ اتنی رقم تو ضرور مل جائے گی کہ لاہور تک ٹکٹ آ جائے۔ اسٹیشن سے شادمان کالونی کا کرایہ نکل آئے..... اور..... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔ اب بھی اتنی رقم نکال جائے گی جس میں ایک عدد عمدہ قسم کی چھری خریدی جاسکے۔

حساب چکانے کا پروگرام تشکیل پا گیا تھا۔ اب کوئی اٹکھن باقی نہ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ گہری اور میٹھی نیند کا جادو اس کے ذہن کے گرد مضبوطی سے بٹھا چلا جا رہا تھا۔

☆☆.....☆☆

”لاہور میں۔“

”لاہور میں کس جگہ؟“ ارشاد کا دل اٹھ پھل ہونے لگا۔

”شادمان کالونی کے فلیٹ میں۔“ ارشاد کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے زمین کو انگلی سے کریدتے ہوئے پوچھا۔

”وہی عشرت تو نہیں جس کی گردن کے بائیں جانب موٹا سامہ ہے۔“

”ہاں ہاں.....“ اب کے چونکنے کی باری ظفر کی تھی۔

”اور دائیں آنکھ کے نیچے سرخ رنگ کا تل ہے۔“

”ہاں..... مگر تمہیں کیسے معلوم؟“ ظفر نے بے قراری سے پوچھا۔ ارشاد تھوک نکل کر رہ گیا۔

”میں بھی چند مہینے شادمان کے فلیٹوں میں رہ چکا ہوں۔ اس لڑکی سے آمتا سامنا ہوتا رہتا تھا۔“

”کمال ہے..... ویسے وہ لڑکی تھی کیسی؟“ ظفر نے اشتیاق سے سوال کیا۔

”تمہیں اب تک پتہ نہیں چلا۔“ ارشاد نے گھورا اور ظفر نے شیشا کر گردن دوسری سمت موڑ لی۔

☆☆.....☆☆

رات بقی جاری تھی۔ اس جیل میں یہ دوسری رات تھی جس نے ارشاد کی نیندیں چرائی تھیں۔ اس کے دماغ میں ہندیا سی بک رہی تھی۔ شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بالکل تہی دست رہ گیا ہے۔ صبح اسے آزادی مل رہی تھی لوگ آزادی پر خوش ہوتے ہیں اور اس کا دل رو رہا تھا۔ سارے بدن میں اٹکھن ہو رہی تھی۔ اعصاب تڑپ رہے تھے۔

اس نے اپنی کونٹری میں سوئے ہوئے ظفر پر نگاہ ڈالی اور نفرت میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہتھیلیوں میں مچھلی ہو رہی تھی عجیب سی بے چینی ہاتھوں پر سوار

مظفر گڑھ سے ارسال کردہ کہانی

منزل کی جستجو

ایسے لڑکے کی کہانی جس نے بچپن سے

جوانی تک بہت کچھ سہا تھا مگر ہمت نہ ہاری.....

محمد شہزاد

میں امین سلیم ہوں، ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کا مالک۔ کروڑوں کا بینک بیلنس رکھنے والا، اپنے تین بچوں اور بیوی کے ساتھ خوش و خرم اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والا۔ میرے بارے میں شاید کسی نے نہ سوچا ہو کہ یہ ایک جھونپڑی میں پیدا ہوا ہے۔ میرے بارے میں سب کی یہی رائے ہے کہ یہ روپیہ پیسہ مجھے ورثے میں ملا ہے اور میں ایک امیر ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔

مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ اور حقیقت کیا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔

نہ میں نے کسی کے پوچھنے پر اسے کبھی کچھ بتایا۔ مگر آج زندگی کے بچپن سال گزار لینے کے بعد میں اپنے آفس میں اس سربراہی کرسی پر بیٹھ کر اپنی زندگی کی حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

میں امین سلیم عرف راجو میاں وقاص کا

رشتہ داروں کے گھر سے روٹی کھا کر اپنا پیٹ اٹاتا۔ اس سے پہلے کہ میں اس غم سے سنبھلتا اور اپنی آگے کی زندگی کے بارے میں کچھ سوچتا، گاؤں میں ہونے والی ایک چوری کا الزام نہ سر لگا دیا گیا۔

سب گاؤں والوں نے ایک پنچایت اکٹھا لی اور اس پنچایت کے سربراہ نے یہ حکم دیا کہ اگر اس نے چوری کی رقم واپس نہ کی تو اسے سزا دی جائے گی۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں اس چوری کا

زمدار ہوں یا نہیں۔ بس فوراً فیصلہ سنا دیا۔ میں نے بہت قسمیں کھائیں کہ میں نے یہ چوری نہیں کی لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔ چوری ہونے والی رقم آٹھ لاکھ روپے تھی۔ فیصلہ کرنے والے نے ساری رقم کی بھرپائی میرے ذمے لگا دی۔ اور ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر میں نے یہ رقم تین دن کے اندر ادا نہ کی تو وہ مجھے گاؤں سے باہر نکال دیں گے۔

میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا جو میں بچتا۔ صرف ماں کی ایک گلے کی چین تھی، خدا جانے کہ وہ چاندی کی تھی یا نہیں۔ مگر وہ میری ماں کی



آخری نشانی تھی۔ میں اسے نہیں پہچان چاہتا تھا۔ اور اگر کچھ بھی دیتا تو میرے پاس ہرگز بھی اتنی رقم نہ ہو پاتی کہ میں چوری کی رقم ادا کرتا۔ میرے لیے جیسے راستے بند ہو چکے تھے۔ میں بہت پریشان تھا۔ چوری کے الزام کی وجہ سے سب رشتہ داروں نے مجھ سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ میں پوری دنیا میں گویا اکیلا رہ گیا تھا۔ پھر مجھے ایک راہ بھائی دی، گاؤں چھوڑ دینے کی۔ اس سے پہلے کہ پنچایت والا مجھے اس گاؤں سے بے قصور نکالتے۔ اس سے بہتر تھا کہ میں خود یہاں سے چلا جاؤں۔ میں نے اپنا مختصر سامان اور کتابیں باندھی اور رات کے اندھیرے میں گاؤں سے چپکے سے نکل پڑا۔ اور شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب میں شہر پہنچا تو صبح ہو چکی تھی۔ شہر پہنچنے کے بعد میں سارا دن بازار میں گھومتا رہا کہ شاید کوئی کام مل جائے مجھے جس کی اجرت سے میں کچھ کھا سکوں۔ مگر مجھے کسی نے کوئی کام نہیں دیا۔ سارا دن گھومنے کی وجہ سے میں بہت تھک چکا تھا۔ اور مجھے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔ میں سڑک کے کنارے چل رہا تھا جب مجھے وہاں سو روپے کا نوٹ نظر آیا، اس سے پہلے کہ کوئی اور اسے دیکھتا۔ میں نے لپک کر وہ نوٹ اٹھالیا اور جیب میں ڈال لیا۔ مجھے ٹھنڈے سینے آنے لگے۔ گوکہ وہ نوٹ ایسی ہی پڑا ہوا تھا مگر پھر بھی مجھے عجیب احساس ہو رہا تھا۔ میں نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکا اور رات کے کھانے کے لیے یہ ڈھابے پر آ گیا۔ رات کا کھانا کھا کر میں باہر وہیں سڑک کے کنارے اپنی کتابوں پر سر رکھ کر سو گیا۔

صبح سورج کی تیز روشنی سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں اٹھا تو میری کتابیں غائب تھیں۔ کوئی انہیں اٹھا کر چلا گیا تھا۔ مگر وہ کتابیں میری زندگی کا مقصد تھیں، میرا سہارا بننے والی تھیں۔ پریشانی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے یوں پریشان دیکھ کر ایک صاحب میرے پاس آئے اور مجھ سے وجہ پوچھنے لگے۔ میں نے ٹھیک سے جواب نہیں دیا۔ مجھے اپنوں نے دھوکہ دے دیا تھا پھر میں کسی غیر پر کیسے بھروسہ کرتا۔ مگر صاحب بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے تو میں نے انکو سب سچ بتا دیا جو مجھ پر گزر چکا تھا۔

”تم پریشان نہ ہو بیٹا۔ میں تمہیں کتابیں لادوں گا، تمہاری تعلیم پوری کرواؤں گا۔ کیا میرے ساتھ چلو گے؟“

میں نے ان کی بات پر دو منٹ سوچا اور راضی ہو گیا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ ان کے گھر میں صرف چند لوگ ہی تھے۔ میں نہیں جانے کہ وہ کون تھے اور نہ میرا کسی سے تعارف تھا۔ بس ایک عالی شان کمرہ مجھے دے دیا۔ وہ کمرہ ہمارے جھوپڑے سے تین گنا بڑا تھا۔ میرے لیے کسی محل جیسا تھا۔ ان صاحب نے اپنا نام کاظمی بتایا۔ مجھے پہننے کو اچھے کپڑے دیے، اور بہت لذیذ کھانا۔ میں نے ایک وقت میں اتنے سارے پکوان کھئی نہیں کھائے تھے۔ اگلے دن کاظمی صاحب مجھے ایک بہت اچھے اسکول میں داخل کروا کر آ گئے۔ میرے لیے سب خواب جیسا تھا، میں خود کو خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ کاظمی صاحب

میں مزید آسائشات میسر کر دی۔ لپ ٹاپ، گاڑی ڈرائیور۔ مجھے اپنا آپ ایک شہزادے کی طرح لگنے لگا۔ میں نے اکثر کاظمی صاحب سے مہنایات کی وجہ پوچھی تو انہوں نے یہی کہا کہ انہیں خدمتِ خلق کرنے کا بہت شوق ہے۔ اور ہمارے گھر میں جو باقی لوگ رہتے ہیں، انہیں بھی انہوں نے سہارا دے کر اپنے گھر میں رکھا ہے۔ ان کی بیوی بچے ملک سے باہر رہتے ہیں مگر وہ باہر نہیں گئے کیونکہ انہیں اپنے ملک سے پیار ہے اور وہ یہاں رہ کر اپنے قوم کے لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کی ان باتوں نے بہت متاثر کیا تھا۔ مجھے انکو دیکھ کر ناشی ہوتی تھی کہ لوگوں میں ابھی بھی نیکی کرنے کا جذبہ باقی ہے۔

کاظمی صاحب کے گھر میں میرا ایک سال اتنی جلدی گزر گیا کہ پتہ ہی نہیں چلا۔ مجھے یوں دس ہور ہا تھا کہ میرے سارے خواب پورے ہو گئے تھے۔ کاظمی صاحب سے میری بہت اچھی بات ہو گئی تھی۔ ہم شام کے بعد ساتھ وقت گزارتے تھے۔

اس دن میں صبح اسکول نہیں گیا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کاظمی صاحب کی ملازمہ نے میرے لیے سوپ بنا کر لائی۔ میں نے جیسے ہی سوپ پیامیرے پیٹ میں جلن سی ہونے لگی، ادم ٹھٹھنے لگا۔ میں نے ملازمہ کو آواز دینی چاہی مگر میرے حلق سے آواز ہی نہیں نکلی، میرے پاس پڑی ٹرے نیچے گری تو ملازمہ نے بات کر دیکھا اور تیزی سے میری طرف آئی۔ اسی وقت مجھے خون کی الٹی ہوئی اور اس کے بعد مجھے

کوئی ہوش نہ رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے کچھ صحیح سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف سفیدی سے چھائی تھی، پھر کچھ دیر بعد منظر واضح ہوا تو وہ ایک ہسپتال کا کمرہ تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر کاظمی صاحب کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ ایک سوئڈ بوئڈ آدمی۔ ان دونوں کی میری طرف پیٹھ تھی۔ وہ سوئڈ بوئڈ آدمی غصے میں کچھ بول رہا تھا۔ ”میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ تمہیں ہر طرف نظر رکھنی ہے پھر تم سے اتنی بڑی لاپرواہی کیسے ہو گئی؟“

”مجھے نہیں پتہ باس! میں نے ملازمہ سے بہت پوچھ گچھ کی ہے، ڈرایا دھمکایا مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔“

”تم ملازمہ کے بجائے وہاں کے گارڈز سے پوچھو۔ ویسے ہمارا بچہ جال کا میاب رہا۔ میں جانتا تھا کہ دشمنوں کا خنجر ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس لیے اس بچے کو میں نے دانے کے طور پر استعمال کیا۔ اتنی آسائشات میں پالا اور آدمی دنیا کے سامنے یہی ڈرامہ کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ کیونکہ میرے دشمن جو مجھ سے اپنی شرائط منوانے کے لیے میری کمزوری کی تلاش میں تھے، اور یہ بچہ جو میرا نام نہاد بیٹا ہے وہ اپنے خنجر کے ذریعے اس پر ضرور وار کریں گے۔ اور میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ بس وہ خنجر اب جلد ہی پکڑ میں آ جائے گا جو ہماری اسمگلنگ کی ساری رپورٹیں دشمنوں کو پہنچاتا ہے۔“

یہ سب سن کر میرے رونگٹے کھڑے

ہو گئے۔

”اور اس بچے کا کیا کرنا ہے؟“ کاظمی صاحب بولے۔

”کیا مطلب کیا کرنا ہے؟ ہمارا کام ہو گیا تو وارد ہونا ہے اب۔ ویسے تو جب اسکو نہ ہر دیا تھا تب ہی تمہیں نہیں پہچانا چاہیے تھا۔ مرجانا ایسے ہی۔“

”میں اسے ویرانے میں پھینک دوں گا۔ مارنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اس کا زندہ ہونا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، اسے ہمارے ٹھکانے کے پتہ ہے، اور یہ تمہیں اور سارے لوگوں کو پہچانتا ہے، یہ ہمیں پکڑا جا بھی سکتا ہے۔“

”مگر اس۔۔۔“

”اگر نگر کچھ نہیں۔ میں تمہارا پاس ہوں اور میرا حکم ماننا تمہارا فرض ہے۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو تم جانتے ہو کہ اس بچے کے ساتھ تمہیں مروانا، میرے جیسے انڈر ولڈ ڈان کے لیے بالکل مشکل نہیں ہے۔“ وہ آدمی تیز لہجے میں بول کر چلا گیا اور کاشی صاحب باہر ہی کھڑے رہے۔

میں آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میرے ماتھے پر ڈھنڈے پسینے آرہے تھے۔ میرے اوپر آج بہت بُرے افسانات ہوئے تھے، وہ بھی اپنے سارے۔ ایک ساتھ۔ میں دعا کر رہا تھا کہ کاظمی صاحب اندر نہ آئیں، اگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ مجھے ہوش آگیا ہے اور پھر وہ وہی کریں گے جو کرنے کا انہیں حکم ملا

ہے۔ میری خوش قسمتی کہ کاظمی صاحب کمرے کے باہر سے ہی چلے گئے۔ میں نے آنکھیں کھول کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ سامنے کھڑکی سے شام کا اندھیرا دیا تھا۔ مجھے وہاں سے بھاگنا تھا، ہر صورت اراک سے بیلے ہی۔

میرے کمرے کے باہر کوئی گارڈز نہیں
تھے۔ ان لوگوں کا یہی خیال ہوگا کہ میں ان کی
حقیقت نہیں جانتا اس لیے میں ہوش میں آنے پر
کبھی بھی بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں
نے کمرے سے نکل کر باہر جھانکا۔ کلنگی صاحبہ
بھی اب وہاں نہیں تھے۔ کاریڈور میں ایک آدمی
لوگ ہی تھے۔ میرے لیے ایک اچھا موقع تھا
مگر ہسپتال کے کپڑوں میں ہونے کے باعث
میں پکڑا جاسکتا تھا۔ مجھے دوسرے کپڑے چاہیے
تھے۔ کسی بھی طرح سے۔ کاریڈور سے ایک دوار
بوائے خزانہ دکھایا ہوا میرے کمرے کی طرف آ رہا
تھا، میں واپس بیڈ پر آ کر لیٹ گیا اور اس دوار
بوائے کے اندر آتے ہی میں کمر پر ہاتھ رکھ کر
کمرانے لگا۔

”کیا ہوا؟“ وہ پریشان سامیری طرف آیا۔
 ”میری کمر میں کچھ چھ رہا ہے، دیکھ
 یہاں۔“ میں نے تکلیف بھری آواز میں اسے
 مزید قریب بلانا چاہا۔

”کس طرف؟“ وہ میرے قریب جھکا
میں نے اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کے
میں جکڑا اور اس کی گردن کے پچھلے حصے پر پورا
طاقت سے اپنی کہنی سے وار کیا۔ وارڈ بوائے
وار نہیں سہہ سکا اور فوراً بے ہوش ہو گیا۔ میں

وہ واروازہ بند کیا۔ اور اس کے کپڑے بدل
پر ماسک لگائے ٹرائل دھکیلتا
ایڈور میں آ گیا۔ میری کوشش یہی تھی کہ
پہلے کہ کوئی میرے کمرے میں جا کر اس
وارڈ بوائے کو دیکھتا، مجھے اس ہسپتال
ہلڈ جزلڈ ٹکنا تھا۔ کار ایڈور سے باہر نکلتے ہی
ای ہسپتال کے رسپشن پر پہنچا میری رفتار
تیزی آگئی۔ مگر اسی وقت مجھے سامنے سے
ساحب آتے نظر آئے۔ میری سانسیں
بائیں، میرے منہ پر ماس پر تھا، ایسا مشکل تھا
وہ ماسک کے باوجود بھی مجھے پہچان لیں مگر
میرے دل میں ڈر سا تھا۔ وہ میرے
سے گزرتے ہوئے دو منٹ ٹھکے اور ٹھہر
میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں
ان سے ان کے پاس سے گزر گیا اور پیچھے سے
ان کی بربڑانے کی آواز آئی۔

”اتنے چھوٹے بچے کو جاب پر رکھ لیا،
تے۔“

ان کی یہ بات سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی، وہ بہرے لڑا گئے چلے گئے۔ اور میں نے ٹرائی ہسپتال لے اینٹرنس پر چھوڑی اور باہر آ گیا۔ باہر آ کر مجس یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی قید سے نکل آیا ہوں۔ میں ہسپتال کی حدود سے باہر آیا اور وال کے کنارے چلنے لگا۔ میں یہاں سے کہیں دور جانا چاہتا تھا۔ وہ دن میں نے پھر سڑکوں پر گرا، اتنی آسائشوں کے یہ مشکل میرے لیے بہت بھاری ثابت ہو رہی تھی مگر میں پھر بھی امل بن تھا کہ میں اس چنگل سے نکل آیا ہوں۔

چند دن بعد میں نے ایک ہوٹل میں بیرے کا

کام لے لیا۔ تنخواہ کے پیسے بہت کم تھے مگر میرے لیے غنیمت تھے۔ میں نے ہوٹل کے مالک سے درخواست کر کے رات اسی ہوٹل میں گزارنے کی اجازت لے لی۔ کچھ مہینوں میں ہی میرے پاس پیسے جمع ہو گئے تو میں دوسرے شہر چلا گیا۔ کیونکہ مجھے ڈرتا کہ وہ لوگ ابھی بھی میری تلاش میں ہوں گے۔

دوسرے شہر جا کر مجھے ایک بہتر ہوسٹل میں
جا بٹل گئی، میں نے اسکول میں داخلہ لے
لیا اور پڑھائی شروع کر دی۔

دن مہینوں میں اور مہینے سال میں نرتے گئے، میں نے میٹرک کے بعد انٹر کا امتحان بھی امتیازی نمبر سے پاس کر لیا۔ اور یونیورسٹی میں الیکٹرکل انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔ یونیورسٹی ختم ہونے سے پہلے میں نے سی ایس ایس کا امتحان دیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

الیکٹرکل انجینئرنگ بننے کے بعد مجھے ایک اچھی جاب مل گئی مگر میں نے دوبارہ سی ایس ایس کا امتحان دیا اور کامیاب رہا۔

میری زندگی میں مشکلیں کم ہوئیں، پھر میں نے اپنے دوست کی بہن سے شادی کر لی اور اپنے بچوں کے ساتھ ایک خوش و خرم زندگی گزر رہا ہوں۔

میرے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی سب خواہش کرتے ہیں۔ مگر یہ سب حاصل کرنے کے لیے میں نے بہت لمبی جستجو کی ہے کیونکہ خواب ان کے ہی پورے ہوتے ہیں جو منزل کو پانے کی جستجو کرتے ہیں۔

صوابی سے ارسال کردہ عبرت ناک تحریر

حسد کی آگ

حسد ایسی بلا ہے جو اگر چٹ جائے تو پھر موت ہی آپ کا علاج ہوتی ہے۔ حاسد

زندگی بھر حسد کی آگ میں جلتا ہے اور موت کے بعد جہنم کی آگ اس کا مقدر بنتی ہے۔

کوثر اسلام

میر اور احتشام کا تعلق خیبر پختون خواہ کے

ایک دور افتادہ گاؤں سے ہے۔ ہم دونوں کا بچپن سے کچھ ایسا ساتھ تھا جیسے گہوؤں کے ساتھ گندم یا برنی کے ساتھ کھویا۔ ہمارا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہوئے اور لڑتے ہوئے بھی۔ میں دن کا زیادہ تر حصہ احتشام کے گھر ہی گزارتا تھا۔ اس کی وجہ ایک تو احتشام سے میری دوستی تھی دوسری احتشام کے ابو۔ احتشام کے ابو ماسٹر اکرام ہمارے گاؤں کے اسکول کے ہی ہیڈ ماسٹر تھے۔ لمبا قد، خوبصورت تراشیدہ داڑھی، موٹا چشمہ اور سفید کپڑوں کے ساتھ کالا واسکٹ پہنے۔ سر اور داڑھی کے بالوں میں سے جگہ جگہ سے سفیدی جھانک رہی تھی۔ انکی شخصیت بہت بارعب تھی، سب ان سے بہت مرعوب تھے اور میں بھی۔ سب انکی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ مجھے بھی

بالکل بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ مجھ میں احتشام میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ ہر شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ ماسٹر اکرام ہمیں محنت کی عظمت کے بارے میں بتایا کرتے تھے، اور ساتھ ساتھ اپنے گزری ہوئے حالات کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ انہوں نے جب ہوش سمجھا تو فاقوں کو گھر پر راج کرتے اور غربت کی طرف ناچنے دیکھا۔ غربت نے انہیں وقت پہلے بڑا کر دیا تھا۔ وہ سخت محنت کرتے، ساتھ پڑھائی بھی جاری تھی۔ ان کے والد تند خور سخت مزاج انسان تھے۔ وہ تعلیم خلاف تھے۔ ماسٹر اکرام کی کتابیں نذر کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تو پڑھے گا تو ہم کیا کھائیں گے؟“

ماسٹر اکرام نے مکرہمت نہیں ہاری

حالی کے ساتھ ساتھ مزدوری کرنے لگے۔ انرا انکی محنت رنگ لائی اور تعلیم مکمل کرنے کے لئے وہ اپنے گاؤں میں اسکول میں ماسٹر مقرر ہو گئے۔ مناسب تنخواہ کی وجہ سے گھر کے حالات بہتر آ رہے تھیں۔ ہمارے گاؤں کی لڑکی رشیدہ، جن کو اب ہم رشیدہ چچی کہتے ہیں ان سے ماسٹر اکرام کی شادی ہو گئی۔ اللہ نے ان کے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا تھا۔ سب سے چھوٹے بیٹے احتشام اور مائرہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ احتشام ابھی اسکول کے ساتھ انٹر میں تھا اور مائرہ ساتھیوں کلاس

میں تھی۔

ماسٹر اکرام کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ حج کرنے بیت اللہ کی سعادت حاصل کریں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی پینشن کی رقم سے انہوں نے اپنے اور اپنی بیوی کے لیے حج کا داخلہ کر لیا، قرعہ اندازی ہوئی اور ان کا نام نکل آیا۔ انہوں نے پورے گاؤں میں مٹھائی بانی اور گاؤں کے سب لوگ انہیں مبارک باد دینے آئے تھے۔ میں بھی انہیں مبارک باد دینے گیا، وہ بہت خوش تھے۔ اور خوش میں بھی تھا کیونکہ انہوں نے اپنی محنت اور ایمانداری کا اچھا صلہ پایا تھا۔



مگر انکی روانگی سے چند دن قبل جب میں اور احتشام ساتھ بیٹھے پڑھائی کر رہے تھے تو اس کے گھر سے فون آیا کہ مائرہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ گھر آ گیا تو اس کی امی نے بتایا کہ مائرہ ان کی بیٹی عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی ہے۔ کبھی بلاوجہ ہنستی ہے تو کبھی روتی ہے۔ کہتی ہے کہ

”میرے ہاتھ پیروں میں جان نہیں، دماغ پر ایک بوجھ سا ہے۔“ ماسٹر صاحب اور احتشام اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور تسلی دے دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، بس چند دواؤں سے ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر دوائی کے استعمال کے باوجود بھی انکی بیٹی کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ اس کی حالت بگڑتی رہی، ماسٹر اکرام کی روانگی سے ایک دن قبل اس کی حالت بہت خراب ہوئی۔ وہ ساری رات ڈرتی رہی، وہ چیخ چیخ کر ایک ہی بات بولتی۔

”وہ مجھے مار رہے ہیں بابا، مجھے بچاؤ۔ بابا بچاؤ۔“

ماسٹر اکرام نے وہ رات پریشانی میں جاگ کر گزاری۔ اگلے دن گاؤں والوں نے انہیں رخصت کیا۔ جاتے وقت انہوں نے احتشام اور اس کے بھائیوں کو تاکید کی کہ مائرہ کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دو، اور اس کا خیال رکھو۔

”آپ بے فکر رہیں بابا، ہم سب مائرہ کا بہت خیال رکھیں گے۔“ ان لوگوں نے ماسٹر اکرام کی پریشانی کم کرنے کی کوشش کی۔ ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد احتشام اور

اس کے بھائیوں نے مائرہ کو کئی ڈاکٹروں دکھایا، اس کے کئی ٹیسٹ ہوئے۔ ڈاکٹروں ٹیسٹ کے مطابق اسے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ڈاکٹروں نے چند سکون آور دوائیں دیں مگر مائرہ کا مسئلہ بڑھتا ہی رہا۔ رفتہ رفتہ اس ہاتھ ٹیڑھے ہو گئے۔ اس کی زبان پر چھاپ پڑ گئے۔ وہ کہتی تھی کہ میرے پیٹ میں آگ ہے۔ احتشام نے بڑی بہن کو بلا لیا۔ بھابھی سے وہ نہیں سنبھل رہی تھی تو شاید بہن کے ساتھ ہونے پر ٹھیک ہو جائے۔ تین دن اور رات مائرہ مسلسل جاگتی رہی۔ رات کو بڑی بہن اسے اپنے ساتھ سلائی مگر وہ سوتی ہی نہیں تھی۔ سارا رات وہ ڈرتی رہتی، چیختی رہتی۔ اگلے دن اس نے کھانا پینا اور باتیں کرنا چھوڑ کر دیں۔ دواؤں میں گھورتی رہتی۔ سب چیخ کے ذریعے اس کے منہ میں پانی ڈالتے لیکن مائرہ اسے پینے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ چند دن اسی طرح گزر گئے اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔

احتشام اور اس کے گھر والوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ انکی بہنان کے سامنے موت کے منہ میں جا رہی تھی مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

احتشام بھی مجھے ساری بات بتانے کے بعد پریشان سا بیٹھا تھا جب آپا ہمارے پاس آئی۔

”احتشام!“

”جی آپا۔“

”احتشام اگر مائرہ کی حالت اسی طرح رہی تو اس کا بچنا مشکل ہے۔ بیماری تو ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ایسا کرو کہ تم اسے مولوی

صاحب کے پاس لے جاؤ۔ شاید کلام پاک کے نور سے اسے کچھ افادہ ہو جائے۔“ انہوں نے انیال لہجے میں کہا۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں آپا۔ میں ابھی مولوی صاحب کو بلا کر لاتا ہوں۔“

مولوی صاحب کے آنے سے پہلے ہی ماسٹر اکرام کا فون آیا۔ وہ بہت پریشان تھے۔ انہیں مائرہ کی فکر تھی اور پھر اس کے علاوہ ان کے پاسپورٹ کا بھی مسئلہ ہو گیا تھا۔ جب گاؤں والوں نے رخصت کرنے کے بعد وہ حاجی کیمپ پہنچے تو وہاں انہیں پتہ چلا کہ ان کے پاسپورٹ میں کچھ مسئلہ ہے، وہ نیا پاسپورٹ بنوائیں۔ جبکہ انکی بیوی باسکتی ہے۔ ان کے کاغذات ٹھیک ہیں۔

ماسٹر اکرام کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ انکی بیوی اکیلی چلی گئیں۔ جبکہ ماسٹر اکرام ارجنٹ پاسپورٹ بنوانے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ ایک ہفتے کی کوششوں کے بعد ان کا پاسپورٹ بن گیا۔ حاجی کیمپ میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد وہ اب حج کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اور یہ سب انہوں نے گھر والوں کو اب فون کر کے بتایا تھا کہ وہ لوگ پریشان نہ ہوں۔

احتشام مولوی صاحب کو بلا کر لے آیا۔

مائرہ چارپائی پر بے سندھ کیٹی تھی۔ اس کا گورا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ مولوی صاحب آنکھیں بند کر کے کچھ پرہتے رہے، اس دوران ان کے چہرے پر کئی رنگ آ جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا کہ اس پر

کالا جادو کی مہلک قسم ”موت کا جادو“ کیا گیا ہے۔ یہ بس آج رات تک کی مہمان ہے۔ سب گھر والوں کا رنگ فق ہو گیا۔ احتشام نے منت بھرے انداز سے کہا۔

”مولوی صاحب خدا کے لیے کچھ کریں۔ میری بہن کو بچائیں۔“

”بچانے والا اللہ ہے۔ اس کا جادو کا توڑ میرے پاس نہیں۔ مگر فکر نہ کریں میرے استاد محترم کو ہستان سے تشریف لائے ہیں۔ آپ کی خوش قسمتی ہے۔ وہ بہت بڑے عامل ہیں۔ میں انکو بلا کر لاتا ہوں۔“ مولوی صاحب یہ کہہ کر اٹھ گئے۔ کافی دیر کے بعد وہ جب واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک نورانی شخصیت تھی۔ نورانی چہرہ لمبی داڑھی، سفید کپڑے، سر پر گڑی باندھے وہ کافی بارعب لگ رہے تھے۔

”السلام علیکم باباجی! ادھر تشریف لے آئیں۔“ احتشام کے بڑے بھائی نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

بابا مائرہ کو احتشام اور اس کی بڑی بہن کی موجودگی میں کمرے میں لے گئے۔ باقی سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ بابا نے اپنے ارد گرد ایک حصار کھینچی اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد مائرہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اس کی آنکھیں لال انگارے ہو رہی تھیں۔ اس کے سر کے بال کھڑے تھے۔ اس نے غرا کر کہا۔

”زندگی چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ۔“ یہ آواز یقیناً مائرہ کی نہیں تھی۔ بابا پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کیے اپنے عمل میں مصروف رہے۔ مائرہ نورانی بابا کی طرف لپکی۔ مگر اسے

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا
کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو
ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ
سی کوشش۔

بہت جلد.....

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے
روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

بہت جلد.....

زور کا جھکا لگا۔ اور وہ چارپائی پر گر گئی۔ وہ نورانی
بابا کے ان دیکھے حصار سے نکل گئی تھی۔ نورانی بابا
نے آنکھیں کھول کر اسی پر پھونک ماری تو وہ
ترپنے لگی۔ اس نے چیخ کر کہا۔
”بس کرو۔“

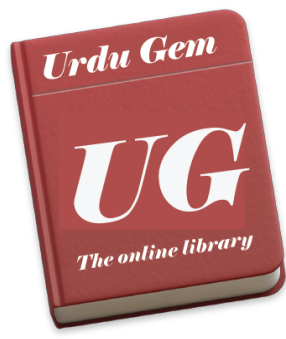
مگر نورانی بابا نے عمل جاری رکھا۔ مارہ
کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلانے لگی۔ کچھ دیر بعد
جب نورانی بابا نے عمل ختم کر کے پھونک ماری تو
مارہ بے سدھ ہو کر بستر پر گر پڑی۔ احتشام اور
آپا تیزی سے آگے آئے۔ اور مارہ کو سنبھالا۔

”بیٹے فکر کی کوئی بات نہیں، تمہارے ایک
رشتہ دار نے یہ کالا جادو کیا تھا۔ کالے جادو کے
زور پر کچھ شدید جن بھی آئے۔ مگر جادو اور
جنات میں نے ختم کر دیے۔ ایک ہفتے میں اس
کے اثرات مکمل ختم ہو جائیں گے۔ میں آپ کو
کچھ تعویذ دے دیتا ہوں۔ آپ یہ بچی کو پہنا
دیتے گا۔“ یہ کہہ کر بابا نے کچھ تعویذ لکھ کر دیے
اور کہا ساتھ میں چند دنوں تک گھر میں سرخ
مرچوں کے ساتھ یہ چھ تعویذ جلائیں۔

ماسٹر اکرام کی واپسی تک مارہ بالکل ٹھیک
ہو گئی تھی۔ انکی آمد کے دو دن بعد ماسی خالدہ
ماسٹر اکرام سے ملنے آئیں۔ وہ ماسٹر اکرام کی
خالدہ زاد تھیں۔ انکی حالت بہت خراب تھی۔ ان
کے بدن پر جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی پھنسیاں نکل
آئیں تھیں۔ اس میں سے پیپ نکل رہی تھی اور
نا قابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی۔ وہ ماسٹر
صاحب کے پیروں میں پڑ گئی۔ اور رورور کر معافی
مانگنے لگی۔

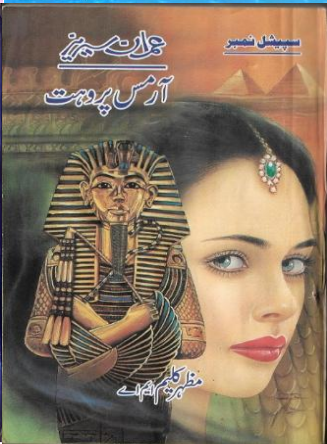
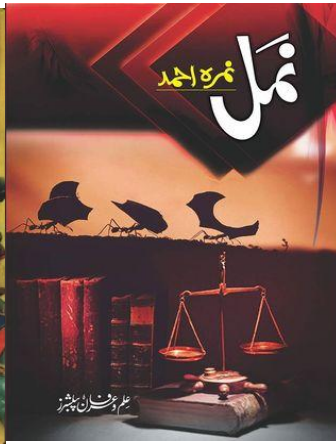
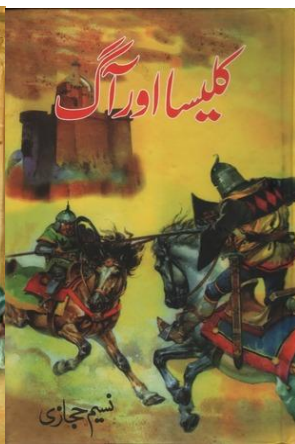
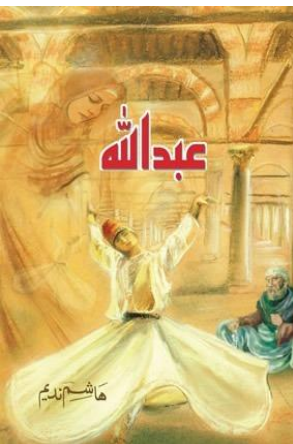
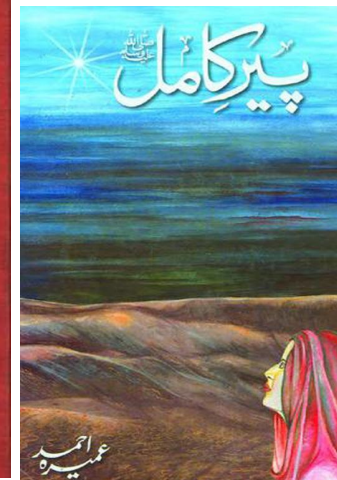
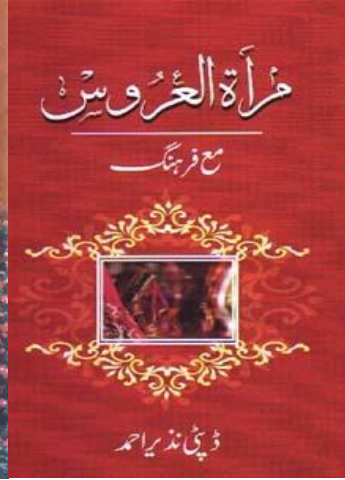
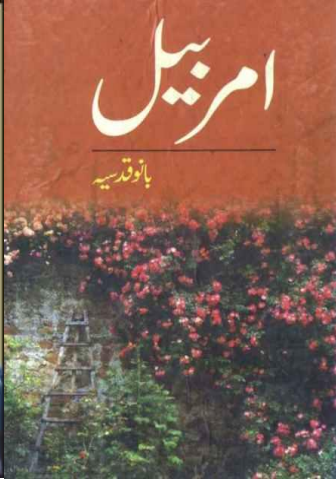
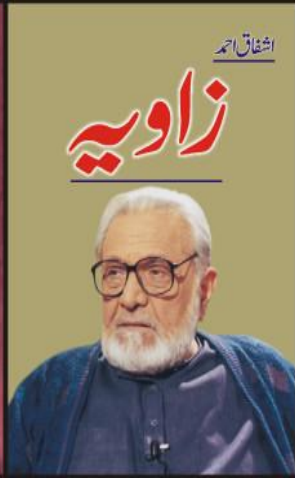
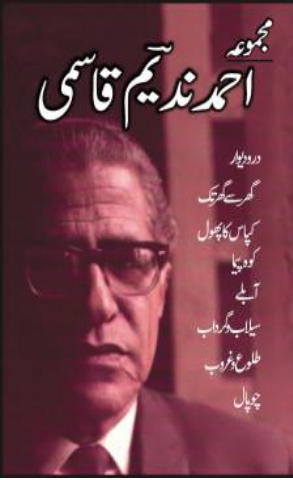
”مجھے معاف کر دو ماسٹر میں حسد کی آگ میں

☆☆.....☆☆



UrduGem.com

URDU KA KHAZAANA



بورڈی شریف سے ارسال کردہ تحریر

قلندری طریقت

ہمیں اپنے بزرگوں سے محبت کرنی چاہیے اور ان کا احترام کرنا چاہیے اور اس کا سب سے اچھا طریقہ ہے کہ خرافات کے بجائے ان کے سیدھے سادھے راستے کو اپنائیں

تحسین جو نیو

وادی مہران کو سلام عقیدت پیش کرتے ہیں جسے باب السلام ہونے کا شرف حاصل ہے جس کے وجود نے اسلامی مراکز آج بھی بلند و بالا مینار کی طرح کھڑے گزرے ہوئے حسین لمحات کی یاد تازہ کرتے ہیں ایسے چند مقامات ہیں۔ سیون، روہڑی، حیدر آباد، سکھر، بکھر، بھٹ شاہ، ہالا، ٹیاری، بلوی، شہداد کوٹ، ٹھٹھہ، لاڑکانہ اور پیر جو گوٹھ شامل ہیں۔

جن کےطن اقدس میں اُن گنت محبوبانِ خدا صحابہ کرام، تابعین، اغواث، اقطاب، ابدال، علماء، ربانین، فقہاء، احناف، محوین، مفسرین اور تحقیقین آرام فرما ہیں۔

ایسی ہی ایک عظیم ہستی سیون شریف (ضلع دادو سندھ) میں آرام فرما ہیں۔ جنہیں دنیا شہباز ولایت، مخدوم اولیاء، سید الاصفیاء، امام الاقفا، حضرت حافظ سید محمد عثمان مروندی سیوہانی سرکار المعروف لال شہباز قلندر قدس سرہ الاقدس کے نام سے جانتی ہے۔



سیدنا عثمان غنی ذوالنورین کے مزار پر لے کرنا اور سلام عرض کرنا چنانچہ والد صاحب نے ہمیت ایسا ہی کیا۔

(لال شہباز قلندر صفحہ 54)

حضرت شہباز قلندر چھٹی صدی ہجری کے ۱۱۰۰ میں تبریز (آذربائیجان، روس) کے قریب ۱۱۰۰ گاؤں مروند میں 573ھ/1177ء میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔

آپ صبح النسب سادات میں سے ہیں اور سیدنا امام محمد جعفر صادق کی اولاد سے ہیں۔

حضرت شہباز قلندر کو بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا از حد شوق تھا اور سات سال کی عمر میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ تھوڑے ہی عرصہ میں عربی اور فارسی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔

”لال اور شہباز کا مطلب“

”آپ کو لال شہباز کہا جاتا ہے اس کا مطلب ہے کہ لعل کے متعلق ایک حکایت سے روشنی پڑتی ہے۔ امام العارفین غوث العارفین، تیرہویں صدی کے مجدد برحق حضرت محمد راشد پیر سائیں رونے دھنی قدس سرہ اپنے ملفوظات



مبارک میں فرماتے ہیں۔
”مخدوم لعل شہباز کو کامل اکمل ولی اللہ کی تلاش تھی عرصہ دراز کی جستجو کے بعد آخر جویندہ ہائندہ است ایک عشق کے جلے ہوئے اور سراہا سوز و درد شخص کی زیارت نصیب ہوئی اور ان کی صحبت اختیار کی جب نماز کا وقت ہوا تو شہباز قلندر نے بزرگ سے عرض کی بزرگوار نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے اٹھیے کہ نماز ادا کریں۔“ بزرگ نے فرمایا۔

”نماز کیا ہے؟“

شہباز قلندر نے کہا۔

”نماز عبادت.....“ پھر بزرگ کو وضو کرا کے جماعت میں لا کھڑا کیا اور شہباز قلندر خود امام بن گئے مخدوم شہباز قلندر نے جب نماز کی تکبیر اللہ اکبر کہی تو اللہ کا اسم پاک سن کر وہ بزرگ محبوب حقیقی کے عشق میں جل کر خاک ہو گئے۔

مخدوم رحمۃ اللہ علیہ جب نماز سے فارغ ہوئے تب کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بزرگ تو جل کر خاک ہو چکے ہیں۔

وہ لوگ جن کے ہاں اللہ تعالیٰ کا نام پاک لیا جائے تو وہ انوار و تجلیات کی ہیئت سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جلال و عظمت سے پردانوں کی طرح اپنی ہستی کو جلا دیتے ہیں ان کی نگاہ غیر اللہ کی طرف نہیں اٹھتی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں دیکھتی۔

شہباز قلندر نے وہ خاک اقدس اپنے چہرہ انوار اور بدن پر مل لی۔

اس خاک پاک کا شہباز قلندر پر ایسا اثر ہوا کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا نام مبارک سنتے تھے تو یکدم آپ کے جسم کے ہر ایک بال مبارک کی جڑ سے خون نکلتا تھا۔

اس روز سے شہباز قلندر لال کہلائے کے لغوی معنی ہیں سرخ رنگ کا قیمتی پتھر طرح لعل پتھر پتھروں میں اعلیٰ شان والا ہے طرح شہباز اولیاء اللہ میں اعلیٰ شان والے ہیں شہباز جس طرح شہباز (بڑا باز) پرندہ پرواز کے سبب تمام پرندوں کا سردار کہلاتا ہے اسی طرح حضرت شہباز قلندر بلند پرواز کے سہ قلندروں کے سردار پیشوا اور شہباز ولایت ہیں جیسا کہ سرکار غوث اعظم خیر جبران خیر دیگرانہ قصہ غوثیہ میں فرماتے ہیں۔

”جس طرح باز اشعب (سیاہ سفید پرور والا باز) تمام پرندوں پر غالب ہے اسی طرح میں تمام مشائخ پر غالب ہوں۔“

ان دلائل سے واضح ہوا کہ لال کہلانا سرور (لال) لباس کی وجہ سے نہیں تھا۔ جس طرح عام لوگوں نے اور غیرت مستند کتابوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ شہباز قلندر سرخ لباس پہنتے تھے بلکہ اس لال خون کی جانب نسبت ہے جو کہ محبت اللہ میں جسم کے بال بال سے جاری ہوا تھا۔ مخدوم سندھ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی رقم طراز ہیں۔

آپ سیر و سیاحت کرتے ہوئے عارف کامل حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر رپانی (جو کہ سراج الامت امام اعظم سینا ابو حنیفہ کی اولاد سے تھے) کی خدمت میں پہنچے انہوں نے فرمایا۔

”ہند میں تین سولندر موجود ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ سندھ تشریف لے جائیں۔“ ان کے مشورہ کے مطابق آپ نے سندھ میں پہنچ کر سیونستان (سہون شریف) میں قیام فرمایا۔

(تحفہ الاکرام سندھی جلد 3 صفحہ 349 تذکرہ صوفیائے سندھ صفحہ 202)

اس سے یہ روایت رد ہوتی ہے اکثر جہلا میں ۴۰ ہر ہے کہ دنیا میں فقط ڈھائی قلندر ہوتے ہیں۔

حضرت شہباز قلندر مخدوم سید محمد عثمان مروندی رحمۃ اللہ علیہ اخیر عمر مبارک میں سیہون تشریف لائے۔

حضرت شہباز قلندر بذریعہ کشتی دریائے ندھ پر محو سفر تھے۔ جب کشتی لکی شاہ صدر کے قریب پہنچی تو امام الاولیاء شیخ المشائخ سند الالقیاء آقاب ربانی حضرت سید صدر الدین شاہ لکھاری رحمۃ اللہ علیہ (آستانہ علیہ) لکی شاہ صدر اسٹیشن کے برابر میں ہے اور تحصیل سیہون شریف) کی کرامت اور تصرف سے شہباز قلندر کی کشتی رک گئی۔

حضرت شہباز قلندر راز کو سمجھ گئے اور کشتی سے اتر کر سیدھے غار میں حضرت کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔

جہاں آپ پہاڑی کی غار میں چلہ گاہ میں مصروف عبادت تھے۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد حضرت نے فرمایا۔

”آپ سیہون میں قیام فرمائیں اور دین کی خدمت بجالائیں۔“

شہباز قلندر نے جواب میں دودھ سے بھرا ہوا پیالہ خدمت میں پیش کیا جب کہ مطلب یہ تھا کہ یہ علاقہ دودھ سے بھرے ہوئے پیالے کی مانند اولیاء اللہ سے بھرا ہوا ہے۔ اب میری کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

حضرت نے بھرے ہوئے دودھ کے پیالے پر گلاب کا پھول رکھ دیا اور ارشاد فرمایا۔

”یہ علاقہ (سیونستان) اولیاء اللہ کرام سے اگرچہ بھرا ہوا ہے لیکن آپ اس پھول کی طرح

ممتاز ہوں گے۔
شہباز قلندر راضی ہو گئے اور مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا اور فرمایا۔

روایت ہے کہ سیہون میں قیام سے قبل قلندر شہباز نے لکی میں شاہ صدر الدین سے ملاقات کی اور ان سے عرض کی کہ آپ اپنی اولاد میں ایک بیٹا میرے ساتھ کیجیے تاکہ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔

چنانچہ شاہ صدر الدین نے اپنا پوتا شاہ صلاح الدین لکھاری ان کی خدمت میں دے دیا۔ سید صلاح الدین کو ہی قلندر شہباز کے دربار کی سجادہ نشینی نصیب ہوگی۔

ایک دوسری روایت ہے کہ آپ اپنے تینوں احباب غوث بہاؤ الحق زکریا سید جلال الدین بخاری اور بابا فرید الدین رحمتہ اللہ علیہ کے ہمراہ شاہ صدر الدین کی زیارت کو لکھی آئے تھے۔ (شہباز قلندر صفحہ 78)

شہباز قلندر کے عہد میں سیہون گویا سندھ میں علم و علماء الاسلام کا مرکز تھا اور آپ علماء کے اس کھکشاں میں مثل آفتاب تھے۔

مخدوم شہباز قلندر نے سیہون میں رہ کر بگڑے ہوئے لوگوں کو سیدھے راستے پر لگایا اور ان کے اخلاق کو سنوارا انسانوں کے دلوں میں نیکی اور سچائی کی لگن پیدا کی اور ایک روحانی ماحول پیدا کیا۔ وہ دو سال تک سیہون شریف میں رہ کر اسلام کا نور سندھ میں پھیلاتے رہے۔

ہزاروں انسانوں نے آپ سے ہدایت پائی اور بہت سے بھٹکے ہوئے لوگوں کا رشتہ اللہ عزوجل سے جڑ گیا۔

ان کے رشد و ہدایت کا سلسلہ سندھ تک محدود نہیں روس سے لے کر سندھ تک پھیلا ہوا

انہوں نے ساری زندگی تبلیغ کی پورے
برصغیر کا روحانی دورہ کیا۔ مدرسہ بہاریہ ملتان میں
بیٹھ کر عرب و عجم کے طالبات علم ظاہر و باطن کو
فیضیاب کیا۔

آپ کی تصانیف سے ایک دنیا ایک طویل عرصہ تک اکتساب فیض کرتی رہی۔

اس کے علاوہ وصال کے بعد سے آج تک کروڑوں عوام و خواص مزار مقدس سے فضا یاب ہوئے ہیں اور تاحشر سیراب ہوتے رہیں گے اور ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق استفادہ کرتا رہے گا۔

حضرت شہباز دلایت شہباز قلندر مخدوم حافظ حاجی سید محمد عثمان سیوانی قدس سرہ الاقدس اکثر ایک وزنی پتھر گردن میں لڑکا لیتے تھے۔ ایک تو وہ پتھر تبرک تھا اور دوسرا یہ کہ وزنی ہونے کے سبب گردن ہمیشہ جھکی رہتی تھی۔ اس سے انسان میں تکبر پیدا نہیں ہوگا۔ تواضع و انکساری انسان کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ جتنی تواضع زیادہ ہوگی اتنا مرتبہ بلند ہوگا۔ سر جھکانے کے سبب نظر کی حفاظت ہوتی ہے وہ خواہ مخواہ بھٹکنے سے محفوظ رہتی ہے اور توجہ و خیال ہمیشہ اللہ سبحان و تعالیٰ کی جانب رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مسلمانوں کو نظر کی حفاظت کے لیے اس طرح حکم فرمایا ہے۔

”ترجمہ: اے محبوب ﷺ مسلمان مردوں کو حکم
دواپنی لگا ہیں کچھ پیچی رکھیں۔“ (سورۃ النور)

آپ نے شادی نہیں کی تھی۔ اس لیے شادی ترک کی کہ آپ ہمیشہ سفر میں رہتے تھے اگر حضرت لعل شہباز قلندر کی پیروی کرنے کا شوق ہے تو پرہیزگاری کریں، پنج وقتہ نماز کی پابندی

معمول بنالیں، شب بیداری کی عادت ڈالیں
 ذکر شریف و درود شریف کا کثرت سے ورد کریں
 اپنے بچوں کو حافظ قرآن بنائیں حرام سے
 اجتناب اور شریعت مطہرہ پر عمل پیرا ہوں۔

حضرت شہباز قلندر سید محمد عثمان مروندی 21 شعبان المعظم 25ھ/ 1454ء کو رحلت ایزدی کی آغوش میں آرام فرما ہوئے۔

حضرت شہباز قلندر مخدوم محمد عثمان کا مقبرہ
شریف سب سے پہلے سلطان فروز تغلق کے
زمانے میں والی سیہون ملک اختیار الدین نے
175ء کو تعمیر کروایا۔

اس کے بعد انکب بادشاہ کے عہد اقتدار میں
(ترخانی) خاندان کے آخری حکمران مرزا جانی
بیگ نے بنوایا۔ جانی بیگ کی وفات کے بعد ان
کے بیٹے غازی بیگ نے 1009ء کو روضہ کی
مرمت کروائی۔

شاہجہان کے زمانے میں نواب سید مجدودہ
 عرف دیندار خان نے خانقاہ کی عمارت کو مکمل
 کروایا اور خانقاہ کے صحن کو کاشی کی اینٹوں سے
 زین کیا اور متصل مسجد شریف تعمیر کروائی۔

حضرت شہباز قلندر کے مزار کا چبوترہ لاڑکانہ
کے زمیندار رئیس حاجی محبوب خان دکن مرحوم
نے بنوایا۔

روضہ پاک کے دروازے پر 1312ھ/ 189ء کو اوستہ نور محمد فیصل گرنے چاندی
ہائی۔

آج کل بازار میں شہباز قلندر کی جو تصویر
تیار ہے۔ وہ تصویر جعلی ہے اور حضرت شہباز
قلندر کی تعلیمات کے برعکس ہے۔ اس کا اصل
دور کا بھی واسطہ نہیں۔

لیکن شہباز قلندر کی ایک قدیم نادر و نایاب

لہویر کا محقق و مورخ سید جسام الدین راشدی
مؤم نے سراغ لگایا اور کتاب مقالات الشعراء
(الجمیعہ سندھی ادبی بورڈ 1957ء) کے صفحہ
411 پر عکس دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ تصویر لاہور
لے میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ تصویر بھی اصل نہیں
ہے بلکہ کسی مصور کی پینٹنگ کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ بھی
حقیقت ہے کہ یہ تصویر بازاری تصویروں سے کافی
مختلف و قدیم ہے۔ مغل دور یا اس سے بھی پہلے کی
ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم دور میں
انسانوں کے دماغ میں شہباز قلندر کے متعلق کیا
تصور تھا وہ تصور اس تصویر سے ابھرتا ہے اور
حقیقت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

یہ تصویر حضرت شہباز قلندر کی تعلیمات کی
انہی میں حقیقت کے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔
آپ ایک سایہ دار درخت کے نیچے جائے نماز پر
آبھدی صورت میں بیٹھے ہیں لباس عربی اسلامی
لباس کرتا زیب تن ہے ہاتھ میں بیچ ہے داڑھی
بارک سفید حد شرعی (مٹھی بھر) سے ایک دو انگلی
انڈ زلف مبارک کانوں کی لوٹیک، موچیں سنت
بارک کے مطابق کٹی ہوئی اور ہنڈوؤں کی طرح
باریک ہیں چہرہ مبارک چاند کی طرح روشن
بال ماند و فقیر اندیشان سے تشریف فرما ہیں۔

آج کے ملک اپنے نفس کے غلام ہیں
 ۰ مہرت کی تعلیمات پر قلعہ عمل پیرا نہیں غیر شرعی
 اور رئیس انہوں نے خود نکالی ہیں۔ جن کا حضرت
 ۸۔ بہاؤ قلندر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ انہیں
 چاہیے کہ مذکورہ تصویر کی روشنی میں اپنا جائزہ
 لیں۔

شہباز ولایت مخدوم اولیاء حضرت حاجی
ماہظ سید محمد عثمان مروندی سیوہانی قدس سرہ
۱۱۱ قدس کا عرس مبارک ہر سال آپ کی درگاہ

عالیہ پر بتاریخ 18، 19، 20 شعبان المعظم کو نہایت عقیدت و محبت سے منایا جاتا ہے۔ جس میں دور دراز علاقوں سے لوگ آ کر شریک ہوتے ہیں اور آپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں عرس مبارک میں صرف سندھ ہی نہیں بلکہ پنجاب، بلوچستان، مکران، سرحد کے علاوہ ہندوستان، افغانستان اور ایران سے بھی لوگ بکثرت شریک ہوتے ہیں۔

اب تو حکومت کی طرف سے ادنیٰ کانفرنس اور ثقافتی شو (موسیقی) بھی ہونے لگے ہیں یہ دربار مقدس محکمہ اوقاف سندھ کے قبضے میں ہے جس کی بے انتظامی و دیدنی ہے۔

عرس شریف کے مبارک و مقدس پروگرام کو اخلاق و کردار سے آزاد لوگوں کا میلہ ملا کر اناج گانا، کھیل تماشا خواندہ کا بے پردہ ہونا، محفل موسیقی، دھمال اور دھمال پر عورتوں کا رقص، شور و ہنگامہ، مزار میں مہندی لے جانا قلندر کی شادی کرانا، ملکتوں کی عجیب و غریب حرکتیں، اصحاب کرام کی شان میں گستاخی اور بد رسوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

ان تمام خرافات کا حضرت شہباز قلندر کے عقیدہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

حکومت اور مسلمانوں کو ان خرافات و بیہودہ حرکات کا نوٹس لینا چاہیے۔ شہباز قلندر کا نذرانہ جو کہ ہزاروں روپے یومیہ اور لاکھوں روپے ماہانہ بناتا ہے حکومت لے جاتی ہے لیکن حضرت کی اصل تعلیمات مسلک و شرف پر خرچ نہیں کرتی۔ اس نذرانے کی آمد سے حضرت کا اصل دارالعلوم (فقہ السلام) جاری کرنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

☆☆.....☆☆

ملتان سے ارسال کردہ دلخراش تحریر.....

تماشا

وہ بھی سراپا سوال تھی کہ یہ میڈیا اس وقت کہاں تھا جب مجھے نو چار اور کھسوٹا

جار ہاتھا..... عصمت دری کرنے والے تو جرگے کی نظر میں محترم ٹھہرے

فاطمہ عبدالحق

میرے گھر کے سامنے میڈیا کا جہوم ہے۔ ہر

چینل والے دوسرے چینل پر بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ میرے گھر کے سامنے جہوم کیوں تھا؟ آخر ایسی کون سی خبر تھی جو میڈیا کو ایک غریب کے در تک پہنچ لائی تھی۔ دراصل یہ سب یہاں میرا تماشا لگانے آئے تھے۔ یہ کس قسم کا تماشا تھا؟ اس کے لیے آپ کو میری کہانی سننا ہوگی آئیں میں آپ کو اپنی کہانی سناتی ہوں۔

”میرا نام بخاور تھا لیکن مجھ سے زیادہ بد نصیب اس دنیا میں کوئی نہیں جنوری کی سردشام کو میں ملتان کے ایک قبائلی علاقے میں پیدا ہوئی۔

خاندان کے بڑوں سے سنا ہے کہ میرا باپ مجھے دیکھنے نہیں آیا کیونکہ اسے بیٹے سے مطلب تھا جب بیٹا پیدا نہیں ہوا تو سب جائے بھاڑ میں اُن کی بھلا سے انہیں کیا؟ جس قدر جشن مجھ سے چار سال بڑے بھائی احسن کی کی بار منایا گیا تھا

ت نہ ہو سکی کہ ابا سے دوبارہ اس موضوع پر بات کر سکیں۔

البتہ ابا نے مجھ پر اتنا احسان ضرور کیا تھا کہ ایک استانی مجھے قرآن پاک کی تعلیم سکھانے امارے گھر آنے لگیں وہ بہت اچھی خاتون تھیں۔ انہوں نے مجھے قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھانا سکھایا۔

اس کے ساتھ انہوں نے مجھے اردو زبان کو پڑھنے اور لکھنے کی مشق بھی کروانا شروع کی آہستہ آہستہ میں پڑھنے کے ساتھ لکھنے کے قابل بھی ہوئی۔

وہ مجھے نئی نئی اسلامی اور تاریخی موضوعات پر کتابیں لاکر دیے لگیں یوں میں ایک نئی دنیا سے

روشناس ہوئی پھر یوں ہونے لگا کہ میری راتیں علم کے سمندر میں غوطے لگاتیں اور میرے دن بالکل ویسے ہی ایک بھیڑ بکری کی طرح گزرتے تھے۔ دنیا کی ہر راحت اور تفریح ختم ہونے کے لیے ہی ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کبھی اس کی مدت لمبی ہوتی ہے اور کبھی چھوٹی میری تفریح کی عمر ذرا چھوٹی تھی۔

کبھی ایک دن میں کتاب چھپانا بھول گئی اور ابا نے اسی دن میری استانی کو ذلیل کر کے نکال دیا یوں وہ واحد روشنی کی کرن جس کی بدولت میں باہر کی دنیا سے روشناس ہو رہی تھی۔

بجادی گئی کیونکہ ابا کا خیال تھا کتابیں لڑکیوں کو باغی بنادیتی ہیں یوں میری زندگی کا



اکلوتا روشن دان جس کے ذریعے سورج کی روشنی
مجھ تک پہنچی تھی بند کر دیا گیا۔

میری آنکھیں جو ابھی نئے نئے خواب بننے کا
تصور کر رہی تھیں ان کی کرچیاں میری روح کو
لبو لہان کر گئیں۔

میری سسکیاں میرے سینے میں ہی دم توڑ
گئیں تب میرا جی چاہا تھا کہ میں جنگل کے کسی
دیران حصے میں چلی جاؤں اور حلق پھاڑ پھاڑ کر
روؤں لیکن میں ایک لڑکی تھی اور لڑکیاں بہت
مضبوط ہوتی ہیں وہ بڑے سے بڑے درد چپ
چاپ سہہ لیتی ہیں میں نے بھی سب کچھ سہہ لیا
تھا۔ میرا بھائی احسن خان اچھے اسکول سے نکل کر
اب شہر کے مشہور کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اس کے
پاس جس قدر تعلیم آتی تھی وہ اسی قدر جاہل اور
وحشی بن گیا۔ پہلے زمانے میں لوگ تعلیم اس لیے
دلاتے تھے کہ ان کے بچے پڑھ لکھ کر معاشرے کو
ایک اچھا انسان دیں لیکن مقام افسوس کہ آج کل
لوگ اس لیے تعلیم حاصل کرتے ہیں تاکہ زمانہ
جاہلیت کی اقدار کو دوبارہ زندہ کریں پہلے کے
زمانے اور اب میں صرف اتنا فرق ہے کہ پہلے
کے لوگ بیٹیوں کے جسم زندہ زمین میں دفنا دیتے
تھے جبکہ آج کل زندہ روہیں دفنائی جاتی ہیں اور وہ
بھی انہی بیٹیوں کے جسموں کو قبر بنا دیا جاتا ہے وہ
زندہ لاش کی مانند زندگی بسر کرتی ہیں۔

زندگی تو پہلے ہی بہت درد دے چکی تھی مگر وہ
دن میری زندگی پر مزید کالک میرے چہرے پر مل
گیا۔ وہ دن جب میرے بگڑے ہوئے جوان
بھائی نے محلے کی ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کی
تھی۔ لڑکی والوں کو جب علم ہوا تو وہ میرے بھائی
کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے لیکن میرے ابا نے
کہا۔

”میرے بھائی کو قتل کیا جائے یا کوئی اور
اس کا فیصلہ جرگہ سنائے گا۔“

فیصلہ کرنے کے لیے چوک میں جرگہ بٹھایا
اور ہمارے ہاں جو عورتیں دروازے کی درز سے
بھی جھانکنے کا اختیار نہیں رکھتیں وہ بھی چوک میں
جمع تھیں ایک طرف ہمارا خاندان تھا جبکہ دوسری
طرف مظلومہ کا خاندان تھا درمیان میں جرگہ
کے لوگ تھے اور آس پاس علاقے کے لوگوں کا
ہجوم تھا۔ ہر شخص جرگے کا فیصلہ سننے کے لیے
تاب تھا۔ لیکن جرگے نے جو فیصلہ کیا وہ کسی بھی
غیرت مند باپ یا بھائی کے لیے شرم سے ڈوب
مرنے کا مقام تھا مگر میرے باپ اور بھائی کو کوئی
فرق نہیں پڑا تھا۔ میرا دل چاہا تھا کاش زمین دو گنا
بڑھے اور میں اس میں سا جاؤں کیونکہ جرگے کا فیصلہ
تھا جس طرح میرے بھائی نے مظلومہ راحیلہ پر
ظلم کیا بالکل اسی طرح راحیلہ کا بھائی لڑکے کی
بہن یعنی میرے ساتھ زیادتی کرے گا۔

مجھے لگا تھا کہ یقیناً آج تو میں مری جاؤں گی
لیکن میں بھی اپنے نام کے بالکل الٹ تھی ہاں
لیکن میری ماں خوش قسمت تھی جو وہیں آخری
سانس لے کر گر گئی مجھے اس لمحے دکھ کی بجائے اپنی
ماں پر رشک آیا تھا۔ میری آنکھوں نے جب کسی
کو بھی اس ظلم میں اپنا سامھی نہ پایا تو میں نے اپنی
آنکھیں راحیلہ پر گاڑ دیں۔ مجھے گھسیٹ کر
کمرے کی طرف لے جایا جا رہا تھا مگر میری
آنکھیں راحیلہ پر جمی ہوئی تھیں جن میں یہ اظہار
چھپی ہوئی تھی کہ تم تو میرے جیسی ہی ایک عورت
ہو تم پر جو ظلم ہوا وہی مجھ پر ڈھایا جا رہا ہے تم ہی
میرے درد کو سمجھ لو۔

لیکن اس نے بھی منہ موڑ لیا۔ دانت کے
بدلے دانت، کان کے بدلے کان، آنکھ کے

لے آنکھ اور قتل کے بدلے قتل ضرور لکھا ہے مگر
بادی کے بدلے زیادتی کہیں نہیں لکھا ہوا۔
”کیا تم نے سورۃ سجدہ نہیں پڑھی؟ اللہ تعالیٰ
کہتا ہے برائی کو بھلائی سے دور کرو۔ پھر یہ ظلم
کیوں؟“ کسی اور کے گناہ کی سزا ایک بے گناہ کو
کیوں؟ جرگے کا فیصلہ میری زندگی میں اندھیرا
لے آیا۔ مجھے اگر زندہ درگور کر دیا جاتا تو بھی میں
اف تیک نہ کرتی۔ مجھے اگر دیوار میں چنوا دیا جاتا
تو وہ بھی مجھے قبول تھا۔ لیکن درندگی کا نشانہ مجھے
ایوں بنایا گیا؟ میں نے اس درندے کی کتنی ہنٹیں
نہیں وہ مجھے چھوڑ دے؟ یا مجھ سے نکاح کے دو
دل ہی پڑھوالے اور مجھے ساری زندگی سزا دیتا
ہے۔ مجھے سب منظور تھا مگر میری وہاں کسی ایک
بہن بھی نہ تھی۔

میں اپنی نظروں میں گر کر بھی نہ مری بلکہ ابھی
تک زندہ ہوں۔ یہاں باہر میڈیا کا ہجوم ہے جو
مجھے انصاف دلانے کی بات کرتا ہے۔ یہ میڈیا
”اب کہاں سوچا ہوا تھا جب مجھے نوجوا کھسونا گیا تھا
اب ایک بے گناہ ہوتے ہوئے بھی مجھے بھاری
سزا دی گئی تھی۔ جب ایک مرد کا بھگتان ایک
عورت بھر رہی تھی اب کہاں کا انصاف؟ کیسا
انصاف؟ کیا تمہارا یہ انصاف میری کھوئی ہوئی
”صحت لوٹا سکتا ہے؟ یہ سب مجھے انصاف دلانے
نہیں بلکہ میرا قاتل بنانے آئے ہیں۔ ورنہ کوئی
ان جرگے والوں کو کیوں نہیں پوچھتا؟ انہیں سزا
کیوں نہیں دیتا؟ جن کے فیصلے میری جیسی لڑکیوں
کو اجاڑ رہے ہیں؟ آخر کب تک یہ سلسلہ چلتا
رہے گا؟ آخر کب تک یہ قماشے ہوتے رہیں گے
تک بے گناہ عورتیں تم مردوں کے کیے کی
سزا بھگتیں گی؟ آخر کب تک؟

☆☆.....☆☆

مشورہ صبا کے ہاتھ

چلو اب بھول جائیں ہم پرانی رنجشیں ساری

نئی اک ابتدا کر لیں

کبھی جو خواب دیکھا تھا

کہ مل کر ہم محبت کے حسیں نغمے ہمیشہ گنگنائیں گے

درختوں سے گلے مل کر

ہوائیں راگ چھبیریں گی تو ہم بھی جھوم جائیں گے

پہاڑوں کی فلک سے باتیں کرتی چوٹیوں سے

بالوں کے تھپہ پٹھ کر وادی میں اترے گی

تو دونوں بھیک جائیں گے

سمندر کے کنارے ڈوبتے سورج کا منظر

دیکھ کر ہم کھوے جائیں گے

کبھی ساحل کی گیلی ریت پر میلوں چلیں گے

اور قدم نہ ڈگ گائیں گے

شب ماہتاب جب ہوگی تو

اس کی دودھیسی چاندنی میں بیٹھ کر

گھٹنوں بہت ہی دیر تک باتیں کریں گے مسکرائیں گے

یہ باتیں سوچتے تھے ہم

تمہیں کیا یاد ہے جاناں تمہیں بھی یاد تو ہوں گی؟

وہ راتیں وہ ملاقاتیں

میرے کانوں میں جو رس گھول دیتی تھیں تری باتیں

تمہیں وہ عہد سارے یاد تو ہوں گے؟

گل

ڈھا کہ بوائز

.....

صرف وہ ہی تو ہیر نہیں ہوتا جو ہر دل میں بسا ہے کچھ ہیر و گمان بھی

ہوتے ہیں مگر ان کی گمانی سے بڑے بڑے نامور پیدا ہوتے ہیں.....

.....

الماس فاطمہ ارمان

.....

وہاں جانا چھوڑ دیا۔

جو پارک لوگوں سے بھرا رہتا تھا وہ ویران ہو گیا رمضانوں میں وہاں کے مبین تراویح کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ افطار پارٹی 14 اگست کے پروگرام سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ پارک ویران اور بھر ہو گیا۔

ایسے میں محلے کے چند بڑے لکھے لڑکے اور معمار آدمی اکٹھے ہوئے اور انہوں نے اس بات کا ارادہ کیا کہ وہ دوبارہ اپنی مدد آپ اس پارک کو نئے سرے سے بنائیں گے اس میں طارق محی الدین جو کہ کافی سال پہلے شہید ہو چکے ہیں یہ پارک بھی انہی کے نام پر گورنمنٹ نے تعمیر کروایا تھا ان کے چھوٹے بھائی جیتے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

دن رات کی محنت سے وہاں گھاس خوبصورت پودے اور صفائی ہوئی پارک کی رونق قریبی کینوں سے دوبالا ہونے لگی پھر لوگوں نے آنا جانا شروع کر دیا بچے کھیلنے کودنے لگے۔ اس

یہ کہانی میں آنکھوں دیکھی سنار ہی ہوں اس کی تصدیق ساءنی وی دنیا نی وی اور جیو چینل نے بھی کی ہے۔ یہ کہانی ہی نہیں یہ حوصلہ اور امید ہے یہ جیتو ہے یہ اپنے ملک اپنے محلے سے محبت ہے آس پاس کے رہنے والوں سے پیار ہے یہ ہمارے محلے دنگیر بلاک 15 جاوید نہاری کے ساتھ والے پارک طارق محی الدین کی ہے جو کسی زمانے میں بہت خوبصورت ہوتا تھا۔

چھوٹے بڑے سارے دن کی تھکان اور گرمی سے بچنے کے لیے خاص طور پر جبکہ لوڈ شیڈنگ عروج پر ہوتی تو بچوں کو لے کر یہاں پر آ جاتے۔ کچھ فضول لوگوں نے اس پارک کو خراب کر دیا یعنی جھولے وغیرہ توڑ پھوڑ دیے جو خوبصورت پانی کا فوارہ بنایا ہوا تھا۔

اُس کو بھی خراب کرنے کے ساتھ توڑ دیا لوگوں نے یہ دیکھتے ہوئے وہاں پر کوڑا کرکٹ گھروں کا لمبہ پھینکنا شروع کر دیا تو لوگوں نے

محنت اور جدوجہد میں 70 لڑکے شامل تھے۔ انہوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا اس پارک میں جھکے ہوئے ڈھنوں کو فریش کرنے کے لیے ہمیں کوئی پروگرام ترتیب دینا چاہیے۔

انہوں نے اپنے بڑوں سے فیصلہ لیا جن میں قنبر بھائی اور دیگر جن کے نام مجھے نہیں پتہ ان سے مدد اور ان کی خوشی اور فیصلہ پوچھا وہ سب بہت خوش ہوئے۔

اس طرح 15 اپریل کو اس پارک کی سالگرہ کا اہتمام کیا گیا کیونکہ ان لڑکوں نے 15 اپریل سے ہی اس پارک کو آباد کرنے کا بیڑا اٹھایا انہوں نے پاس بنوائے جو کہ بہت سستے تھے یعنی 200 روپے میں آپ کے گھر کے 15 افراد اس پروگرام کو آگرا نچوائے کر سکتے تھے پروگرام بہت مزے کا تھا۔

جس میں میجک شو بچوں کے لیے جھولے بڑوں کے لیے ٹال اور سب سے مزے والی بات کے آتش بازی کا میڈی فنکار میوزیکل پروگرام جس میں مایہ ناز فنکاروں نے گائے گائے بہت اچھی کامیڈی کی مائیکل جیکسن ڈانس لڑکوں کی ٹیم نے کیا۔

بہت زبردست دھماکے ہوئے آپ کو یقین نہیں آئے گا۔

بہت عمر والے انکلوں نے بھنگڑا ڈالا اور اپنی خوشی کا اظہار کیا رنجرز اور پولیس نے بہت تعاون کیا۔

ہزاروں کا ہجوم تھا مگر کوئی بد نظمی نہیں تھی اور میں ان بچوں کو سلام پیش کرتی ہوں ان بڑوں کو سلام پیش کرتی ہوں۔

جنہوں نے اس پارک کے بنانے کے علاوہ محلے کے لوگوں میں خوشیاں پہنچائی ہر چہرہ خوش

سے گلزار تھا ہر بچہ پھولے نہیں سار ہا تھا اس کے علاوہ اس پارک کو ڈھا کہ پارک بھی کہا جاتا ہے اس لیے جن لڑکوں نے کارکردگی میں حصہ لیا ان کو ڈھا کا بوائز کا خطاب دیا گیا۔

میرے ڈھا کا بوائز میرے چھوٹے چھوٹے بھائی ڈھا کا پارک کے نام کی شرٹ پہنچے اتنے پیارے لگ رہے تھے خدا ان کو نظر بد سے بچائے میری دعا ہے وہ اس پارک کو اور خوبصورت بنائیں۔

انہوں نے یہ معرکہ انجام دے کر پاکستان کی قوم کو سبق دیا ہے کہ ہمیں اپنے ملک کو خود خوبصورت بنانا ہے اپنی مدد خود کرنا ہے جیتی سے رہنا ہے اور میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ اس پارک کا کسی تنظیم یا پارٹی سے کوئی تعلق نہیں اور پروگرام صرف محلے اور ڈھا کا بوائز نے ترتیب دیا اتنی خوبصورت سجاوٹ خوبصورت اسٹیج خدا ہم سب پاکستانی بھائیوں کو اس طرح کام کرنے کی توفیق دے آمین۔

اگر ہم پاکستانی ہونے کا حق ادا کر سکتے ہیں تو ہمیں کچھ اپنے وطن کے لیے کرنا ہے دوسرے ملکوں کے لوگ اپنے وطن سے کس طرح پیار کرتے ہیں۔

اپنی سرزمین کو ماں کا درجہ دیتے ہیں تو ہم ان سے کم نہیں ہم تو ان ماں بہنوں اور بزرگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے اس ملک کے لیے بہت سی قربانیاں دیں جان و مال کے نذرانے دیے ہیں خدا ہمارے ملک کو آباد رکھے۔

سوچنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے پچھلے کچھ سال بہت ہی مشکل تھے خدا وہ دور اب نہ لائے ہمارے ملک کی رونقیں برقرار رکھے۔

☆☆☆☆

کالے جادو کی بھیا ناک دنیا میں ایک خدارسیدہ عامل کی داستان

عامل کامل

کالی دنیا، جادو، جنات، ٹوٹے ٹوکوں، سیاہ دل لوگوں کی کالی دنیا، جہاں دوشیزاؤں کو جادو کی بھینٹ چڑھانا، شیطان کو خوش کرنے کا سب سے برا ذریعہ تھا اس دنیا میں ایک دین اور ایمان والے نے کس طرح نکل لی، اور اس نکلناؤ کے نتیجے میں پیش آنے والے دلچسپ، عبرت ناک، سبق آموز واقعات.....

دین و ایمان کی کشمکش کی داستان

تیسری قسط

پیر شاہ محمد قادری

میں خود بھی حیران تھا کہ نصیب اہل زبان کی طرح اردو بول رہی تھی.....

سے نکلنے کے بعد میں ادھر کا ہی رخ کروں گا.....

”اب یہ تو قسمت کی بات ہے کہ تم کب تک وہاں پہنچتے ہو۔“ والد صاحب کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔

”میں سمجھا نہیں اباجی.....!“

”تم جس راستے پر چل رہے ہو اس میں تمہاری ضرورت کسی کو بھی پیش آسکتی ہے اور تم خود بھی کسی کی ضرورت بن سکتے ہو اس لئے اگر کسی اور مسئلے میں الجھ کر تم جلد وہاں نہ جاسکو تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

اب میں چلتا ہوں.....!“

یہ کہہ کر والد صاحب چلے گئے ان کے جانے

”ہاں..... اب میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر والد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے: ”میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ مقابلہ ذرا سخت ہوگا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس شیطان کو تم ضرور ختم کر ڈالو گے.....

پھر تم باقی معاملات کے سلسلے میں بھی بہت اچھے اور موثر اقدامات کر رہے ہو، میں اب ہر لحاظ سے مطمئن ہوں..... اور اب میری خواہش ہے کہ تم صحرائی وظیفہ بھی جلد از جلد مکمل کرلو.....“

”جی..... میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اس مسئلے

ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ صبح نمودار ہو چکی ہے اور چاروں طرف اجالا پھیل گیا ہے۔

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ والد صاحب نے خواب ہی کی صورت میں مجھ سے ملاقات کی تھی اور مجھے شاباش دے کر گئے تھے۔

رات کو میرے سامنے آنے والی نصیحاں کی اصلیت نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے مقابل جو جن تھا وہ بے حد چال باز اور عیار تھا۔ اسی لئے مجھے اس کے خلاف محاذ قائم کرنے سے پہلے اچھی طرح ہر چیز کا جائزہ لینا ضروری تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے اور وہ چال باز اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھا لے۔

بہر حال ابھی وہ مرحلہ دور تھا، ابھی تو اس کا دار و مدار بڑے سردار پر تھا، اس کے حتی فیصلے کے بعد ہی میں کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔

حالانکہ میں اس وعدے کے بغیر بھی اس کی بیوی کا علاج کر سکتا تھا، لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ میرے اس عمل سے ایسی صورت حال بھی سامنے آئے کہ جس کی کوئی افادیت ہو..... اس کی بیوی جن کا شکار تھی اور وہ خود نہ جانے کتنے انسانوں کو شکار کر رہا تھا۔

اس لئے میری نظر میں یہ لوگ اس جن سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے جن کے خاتمے کیلئے سردار کے گورکھ دھندے کو بھی داؤ پر لگوادیا تھا۔

میں بستر سے نکل آیا اور پھر اٹھ کر میں نے

خیمے کا پردہ ہٹایا۔ سردار کا ایک آدمی شاید میرے اٹھنے کے ہی انتظار میں باہر موجود تھا۔ وہ فوراً ہی میری طرف لپکا:

”بادشاہ سائیں.....! آپ اٹھ گئے.....“

اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ”بادشاہ سائیں“ زوعام ہو گیا تھا اور ایسا سردار کے ہی حکم پر ہوا گا۔ میں زیر لب مسکرا دیا۔ پھر بولا:

”ہاں..... صبح بخیر.....!“

”آئیں سائیں.....! تشریف لے آئیں.....“

”کہاں چلنا ہے بھی.....!“

”میں آپ کو نہر پر لے جاؤں گا، جہاں آپ چاہیں تو غسل وغیرہ کر لیں..... پھر آپ میرے ساتھ ہی واپس آنا، سردار ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

میں نے سر ہلادیا۔ پھر میں اس کے ساتھ چل پڑا، درختوں کے درمیان سے نکلے ہوئے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک نہر اس طرح رواں تھی کہ اس کے دونوں اطراف میں درختوں اور جھاڑیوں کی قطاریں موجود تھیں۔

درمیان میں نہر کا پانی بہہ رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھتا رہا۔ جلد ہی ایک ایسی جگہ نظر آئی۔ جہاں نہر کے اس جانب والے حصے کو ایک گھنے درخت کی شاخوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ آدمی وہیں رک گیا اور مجھ سے بولا۔

”اس نہر کو ہم لوگ بھی استعمال کرتے ہیں اور پرلی طرف کے گاؤں والے بھی اسی نہر پر آتے ہیں۔ اس لئے میں آپ کو آگے سے لے کر آیا ہوں۔“

یہ جگہ نہانے کے کیلئے مناسب ہے۔ آپ کپڑے اتار کر انہی شاخوں پر ٹانگ دیں اور خوب جی بھر کر نہائیں۔ پھر مجھے آواز دے دیجئے گا، میرا نام بیدل ہے..... میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”جن کی طرح.....! میں نے بے ساختہ پوچھا۔“

”نہیں جی.....! اس نے نفی میں سر ہلایا:

”آپ سردار کی کا علاج کرنے آئے ہو۔ آپ کے سامنے جن کی طرح حاضر ہو کر مجھے اپنی شامت بلانی ہے.....! میں ادھر ہی ہوں آپ کے پیچھے.....“

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ پھر میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اپنے کپڑے اتارے اور نہر میں کود پڑا۔

ٹھنڈے اور فرحت بخش پانی نے گویا میری روح کو بھی ٹھنڈک عطا کر دی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ باہر ہی نہ نکلوں، لیکن چونکہ کسی کے آجانے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔ اس لئے میں تھوڑی دیر بعد ہی باہر نکل آیا۔

کپڑے سینے کے دوران نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔

پھر اس احساس کو اپنا وہم سمجھ کر میں نے نظر انداز کر دیا۔ اب ذرا ذرا سی باتوں پر تو اپنے منکلوں کو حاضر کرنا بھی اچھی بات نہیں تھی اور ویسے بھی یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے کپڑے بدلنے کے بعد بیدل کو آواز دی، وہ درخت کے عقب میں ہی بیٹھا ہوا تھا، اس لئے نورانی میری طرف لپکا۔

”جی سائیں.....! آپ تیار ہو گئے.....!“

”ہاں..... چلو.....!“ میں نے سر ہلایا۔

پھر ہمارا وہی کاسفر شروع ہوا۔ ہم کنارے کنارے ہی چل رہے تھے۔ دفعتاً گھوڑے پر سوار ایک چمپلی لڑکی نہر کے دوسری طرف سے گزری۔ وہ کافی غور سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کے جسم پر قبائلی لباس تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خاص طور پر میری طرف متوجہ تھی۔ پھر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہم سے آگے نکلنے کے بعد نگاہوں سے اوچھل ہو گئی۔ میں نے بیدل کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔

”یہ کون تھی بیدل.....! اور یہ تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے.....؟“

”یہ گلابی اندھی تھی بادشاہ سائیں.....!“ اس نے سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا: ”اسی کو دیکھ کر میرا یہ حال ہوا ہے۔“

”لیکن کیوں.....؟ وہ تو ایک لڑکی تھی بیدل.....!“

”ہاں..... وہ لڑکی ہی نظر آ رہی تھی، لیکن یہ ایسی ہے کہ اگر درخت کی طرف انگلی اٹھا دے تو وہ جل کر راکھ ہو جائے، نہر کی طرف اشارہ کرے تو نہر سوکھ جائے.....“

”کیا کہہ رہے ہو یار.....!“ میں ہنسا: ”کیا یہ کوئی جادو کر رہی ہے؟“

دونوں آدمی مجھے چھیڑ رہے تھے تو ہمارا خیموں تک پہنچنا ناممکن ہے۔“

”ارے.....!“

”ہاں بادشاہ سائیں.....!“ یہ سارے کا سارا گاؤں ہی وحشی درندوں کا گڑھ ہے اور اس کا ڈیرا..... اف..... اللہ کی پناہ.....

یہ دڑیرے کی چیت پیٹی ہے..... گلابو نام ہے اس کا.....!“

”یار تم ڈاکو ہو کر ان لوگوں سے ڈر رہے ہو؟“

”بادشاہ سائیں.....! میری کیا اوقات ہے..... قبیلے کا کوئی بھی آدمی ان سے نہیں الجھتا، حتیٰ کہ بڑے سردار بھی اس گاؤں والوں سے گریز ہی کرتے ہیں.....!“

”اوہ.....“ میرے منہ سے نکلا۔

تھوڑی دیر بعد ہماری واپسی ہو گئی تھی۔ مجھے سردار کے خیمے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ جو واقعی میرا منظر تھا، پھر جلد ہی ناشائستہ آگیا جس میں پیڑی روٹی، پراٹھے، لسی اور دیسی مکھن شامل تھا..... چنانچہ میں نے سیر ہو کر اس مزیدار ناشائستہ کو منمایا۔ اس وقت سردار کچھ خاموش خاموش سا تھا، میں نے بھی اپنے طور پر اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا، ظاہر ہے کہ میری حیثیت اپنی جگہ، لیکن وہ بھی تو سردار تھا.....

مجھے درشت انداز میں جھٹک سکتا تھا، نہ جانے کس بات پر اس کا موڈ خراب تھا اس لئے چپ رہنا ہی بہتر تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اس علاقے میں ایک افراتفری سی چل گئی۔ سردار کو اہم اعلان کرنا تھا۔ اسی بناء پر قبیلے کے تمام لوگ ایک مخصوص جگہ جمع ہو رہے تھے۔

پھر جب میں سردار کے ہمراہ وہاں پہنچا تو اس بڑے ہجوم میں چھوٹے سردار اور اس کے باغی ساتھیوں کو بھی وہاں موجود پایا، وہ بری طرح رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے اور انہیں ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اسی وقت سردار آگے بڑھا اور بلند آواز سے بولا:

”میرے قبیلے کے تمام باسیو.....! میں آج ایک اہم اعلان کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میں اب اس پیشے کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔ آج ابھی اور اسی وقت اپنے لئے کوئی اور سردار منتخب کر لو..... وہی سردار ان باغیوں کیلئے بھی فیصلہ سنائے گا۔ کیونکہ اب سزا یا معافی کا اختیار میرے ہاتھ میں نہیں ہے.....

جمع پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ ہر کوئی سردار کا منہ تک رہا تھا، خود چھوٹے سردار وغیرہ بھی حیران تھے کہ یہ اچانک ہی کون سی کاپلٹ گئی۔ پھر اس سکوت کو ایک بوڑھے آدمی نے توڑا تھا: ”لیکن سردار.....! اس فیصلے کی وجہ کیا ہے؟ آپ اچانک ہی ہمیں کیوں چھوڑنا چاہتے ہو.....؟“

”میرا پیشہ نصیبیاں کے علاج میں رکاوٹ بن رہا ہے۔“ سردار نے صاف کہا: ”اور وہ مجھے بے حد عزیز ہے..... میں لوٹ مار کر کے اور دوسروں کے گھر برباد کر کے اپنا گھر کیسے آباد کر سکتا ہوں.....! بس اسی لئے قبیلے کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔“

”لیکن سردار..... وہ تو ہمیں بھی عزیز ہیں۔“ کسی اور نے کہا۔ ”اور ہمیں آپ ہی کی سربراہی پسند ہے“ ہمیں یہ گوارا نہیں ہوگا کہ کوئی اور ہم پر حکم

چلائے..... ہاں.....!“

ایک شور مچ گیا، سب ہی اس آواز کی تائید میں تھے، لیکن اس وقت سردار بھی ایک الگ ہی موڈ میں تھا، وہ ان لوگوں کی اس پر جوش کیفیت سے قطعی متاثر نہیں ہوا تھا، وہ پھر بولا۔

”میں اب اس پیشے سے الگ ہو رہا ہوں..... اور اب کوئی مجھے سردار نہیں بولے.....“ ”اگر آپ نے یہ پیشہ چھوڑ دیا، تو ہم بھی آج سے اس پیشے کو خیر باد کہتے ہیں۔“ ایک پر جوش آواز گونجی۔

”لیکن ہمارے سردار آپ ہی ہوں گے۔“ ”لیکن پھر میں کسی بات کی سرداری کروں گا.....؟“ سردار کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”ہم لوگ کبھی باڑی کریں گے.....!“ کہا گیا۔

”یہ سینکڑوں مربع میل زمین بخر حالت میں پڑی ہے۔ ہم اسے زرخیز بنائیں گے اور اس میں اناج اگائیں گے..... فطرتی کاٹیں گے اور اس وقت بھی آپ ہی ہمارے سردار ہوں گے.....“ ”سردار.....! زمیندار.....! زندہ باد.....!“

شور سا گونج اٹھا۔ سردار کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آ گئے۔ اس نے اپنی جیب سے ایک بڑا سا کپڑا نکالا اور چہرہ صاف کرنے لگا۔ پھر وہ وہاں رکائیں تھا..... اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

”ان قیدیوں کا کیا کریں سردار.....!“ کسی نے چیخ کر پوچھا تھا۔

”آزاد کر دو.....“ جواب ملا: ”پھر یہ جہاں جائیں ان کی مرضی، اب تو ہمارے راستے ہی بدل گئے ہیں۔“

سردار نے رک کر جواب دیا۔

قیدیوں کو کھول دیا گیا۔ چھوٹے سردار کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر سردار کے آگے ہاتھ جھوڑ دیئے: ”ہمیں معاف کر دو سردار.....! اور اپنے ساتھ ہی رکھو.....! وقتی طور پر میرے دل میں سرداری کے منصب کا لالچ آ گیا تھا۔

لیکن آپ کے اس فیصلے کے بعد میں بھی اپنی خدمات ان کھیتوں کیلئے پیش کرتا ہوں، جو جلد ہی اس بخر زمین پر لہرائیں گے..... میں نے بھی آج سے آپ کے نقش قدم کو اپنا لیا ہے..... ہم اب یہاں اپنا ایک نیا گاؤں آباد کریں گے، جس میں ہم آنے جانے والی مسافریوں کے مسافروں کی مہمان نوازی کریں گے..... ان کیلئے اپنی خدمتیں وقف کر دیں گے.....“

چھوٹے سردار کی باتوں نے ایک بار پھر مجمع کو شور مچانے پر مجبور کر دیا۔ بڑے سردار نے مسکرا کر اسے گلے لگایا اور اس کی کمرچسپی۔

اس وقت میرے دل کا حال عجیب تھا، جو خوشی اور طمانیت مجھے حاصل ہو رہی تھی، اس کے بارے میں اندازہ کرنا بھی بے حد مشکل کام تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا..... اور اب مجھے اس کہانی کے بنیادی کردار کا مسئلہ حل کرنا تھا۔ میرا مطلب نصیبیاں سے تھا، اگر وہ درمیان میں نہ ہوتی تو شاید آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا.....

اس میں بھی قدرت کی مصلحت پوشیدہ تھی۔ آج نصیبیاں کی بیماری نے کتنے لوگوں کو روحانی صحت سے نوازا تھا..... سب کی کاپیا ہی پلٹ گئی تھی۔

اب مجھے پوری تندہی اور توجہ سے نصیبیاں کا

علاج کرنا تھا۔ چنانچہ میں سردار کو اس کے خیمے تک رخصت کرنے کے بعد اپنی ”جائے پناہ“ میں آ گیا۔ سامنے ہی میرا منکوا یا ہوا سامان ابھی موجود تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے اپنے گرد حفاظتی وظیفے کا حصار کھینچا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ابھی مجھے صرف تیاری کرنا تھی، پڑھائی کیلئے
ابھی کافی وقت پڑا تھا..... یوں کہنا چاہئے کہ پہلے
مرحلے میں تیاری تھی اور دوسرے مرحلے میں
پڑھائی اور اس وقت میں ابتدا میں مرحلے سے گزر
رہا تھا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ سردار کی آواز
میرے کانوں سے نکرائی:

”بادشاہ سائیں.....! کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔“

”جی سردار..... آ جائیں.....!“ میں نے ہانک لگائی۔

وہ مسکراتا ہوا اندر آیا اور میرے سامنے ہی
آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا:

”آپ مجھے بادشاہ مت بولا کریں
سردار.....!“ میں نے اسے مخاطب کیا: ”میرا نام

”اچھا تو آپ بھی مجھے سردار مت کہا

نہا: ”میرا نام کچل ہے.....!“

جواب دیا: ”میں تو بس ایک مہرہ ہوں۔“

ایک بڑی سی دری بچھائی گئی تھی، جس پر
 بے سامنے نصیباں آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی
 تھی اس کو دیکھتے ہی رات والا منظر میری آنکھوں
 میں گھوم گیا تھا۔

جسے پھر فوراً ہی میں نے اپنے ذہن سے جھٹکا
 'نہا' وہ نصیبان تھی ہی کب.....! جو میرا ذہن مجھے
 امانے کی کوشش کر رہا تھا اور میرے خیالات
 آگندہ ہو رہے تھے، خود اس کی آنکھوں میں بھی
 میرے لئے واجبی سی شاسانی تھی..... بہر حال
 میں نے گزشتہ رات کے واقعے کو اپنے ذہن سے
 اٹالنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کیلئے میں نے
 نو کو اپنے کام میں مشغول کر لیا۔ میں نے ایک
 ہونے میں آگ بھی گوا دی تھی۔ پھر جب آگ
 مروج پر آتی تو میں نے اپنے تیار کئے ہوئے
 اماں میں سے ایک کپڑے کی پوٹی نکالی اور اسے
 پھیرے کی طرح نصیبان کے جسم پر گھما کر آگ
 میں جھونک دیا۔

جیسے ہی پوٹلی نے آگ پکڑی، نصیباں کے بدن میں رعشہ طاری ہونے لگا۔ اس وقت میں نہ اپنے وجود کو بھی کافی بھاری محسوس کر رہا تھا، پھر میں نے دوسری پوٹلی نکالی اور اپنا عمل دہرایا۔ امانت نصیباں کے خدو خال بدلنے لگے..... اور اس کا رنگ بھی سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ پھر دیکھنے والوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ کیونکہ اب نصیباں کی جگہ کوئی اور بٹھا ہوا تھا۔ جس کی ہیئت انتہائی بھیاں تک تھی..... اس کی آنکھیں بڑی، گول اور انتہائی سرخ تھیں جبکہ ناک پھول کے بے حد پوٹی اور بھدی ہوئی تھی۔

کے کھلے ہوئے منہ سے بے حد کرہہ آوازیں نکل رہی تھیں۔ تیسری پڑیا کے جلتے ہی اس کے چہرے پر بے پناہ تکلیف کے آثار نمودار ہو گئے، پھر وہ زمین پر دہرا ہو کر اپنا سر پکٹنے لگا، اس کے حلق سے برآمد ہونے والی آوازوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور پھر جلد ہی یہ آوازیں معدوم ہو گئیں اور اس کا جسم بھی بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے اٹھ کر اسے سیدھا کیا تو تھیں اپنی اصلی شکل میں سامنے موجود تھیں اور بے ہوش تھیں..... اس کے سینے کا زیرویم چٹکی کر رہا تھا کہ وہ بہت گہری سانسیں لے رہی ہے۔

میرا پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ یوں جیسے میں نے کوئی پہاڑ توڑا ہوا اور درحقیقت دیکھا جائے تو مجھے اس سے کم محنت نہیں لگتی تھی..... اس کالی ماتا کے پجاری کو سامنے لا کر جلانا کوئی آسان کام نہیں تھا اور اس کا نتیجہ مجھے اپنی اندرونی کیفیت سے ہی محسوس ہو رہا تھا۔ جو ماورائی مخلوقات بات چیت کرتی ہیں، ان سے نمٹنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ لیکن یہ پجاری ان میں سے نہیں تھا۔ لہذا اسے جلا کر جسم کرنا ہی اس کا حل تھا، ورنہ دوسری صورت میں وہ خود میرے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ بہر حال میں نے سردار سے کہا:

”لہجے سردار.....! میں نے بھی اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ آپ کی بیوی اب اس آسیب سے آزاد ہو چکی ہے، انہیں آپ خیمے میں پہنچا دیجئے، اب یہ صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گی..... اور اب میں بھی آرام کروں گا..... ہاں.....!!“

توڑا تھا۔ پھر میں سردار کے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے خیے کی طرف چل دیا۔ میری ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ پھر میں چند قدم چلنے کے بعد خود بھی لہرا کر گر اور بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی، میرے سامنے سردار ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھا تو میری آہٹ سے اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

”اوہ..... شکر ہے..... بادشاہ سائیں کو ہوش آ گیا!“

میں مسکرا دیا، پھر میں نے کہا: ”اپنی بیگم کے پاس بیٹھنے کے بجائے تم میرے پاس بیٹھے ہو.....!“

”ہاں بادشاہ سائیں.....!“ اس نے سر ہلایا: ”وہ بھی سو رہی ہے۔ اتنے سالوں بعد میں نے اسے پہلی مرتبہ رات میں سوتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”اوہ..... اچھا.....!“

”ہاں سائیں.....! تمہاری تو جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ تمہارے برکتی قدم جب سے یہاں آئے ہیں، ہم لوگوں کی تو قسمت ہی بدل گئی ہے..... کیا بات ہے تمہاری.....! اوہ.....!“

”بس یہ سب دعاؤں کا نتیجہ ہے سردار.....“ ”دعائیں تو میری بھی بہت ہیں تمہارے لئے..... اور جس طرح تم نے کل اس بلا مقابلہ کیا ہے، وہ منظر تو میں بھی زندگی میں نہیں بھلا سکوں گا..... واقعی تم ایک باکمال اور طاقتور انسان ہو۔“

”اب میری اتنی تعریفیں مت کرو سردار میں مسکرایا: ”ایسا نہ ہو کہ میں تمہارے سر پر ہی جاؤں۔“

”میرا دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ تمہیں سر پر بٹھا لوں..... بس نہیں چل رہا میرا۔“ ”ایسا بس چلانا بھی نہیں کہ میں بے بس جاؤں۔ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں۔ تم ذرا اپنی ٹیکہ خبر لو.....“

”اچھا بادشاہ سائیں.....!“ ”پھر وہی.....“ میں نے آنکھیں نکالیں اس نے مسکراتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا اور باہر نکل گیا۔ میرا کام اب یہاں ختم ہو چکا تھا چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ آج ہی اپنے سفر پر روا ہو جاؤں اور سلسلہ وہیں سے جوڑوں کہ جہاں سے تانے بانے ٹوٹے تھے۔ آخر مجھے اپنا وظیفہ مکمل کرنا تھا۔

میں نے دوسرا لباس نکالا اور پھر تہا ہی نہر کی طرف چل پڑا۔ بیدل نے مجھے راستہ تو دکھائی دیا تھا۔ چنانچہ میں نے اکیلے ہی وہاں جانے کی ٹھان لی تھی۔ پھر اسی نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا میں اسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں گزشتہ دن بھی نہایا تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ مجھے اس پانی میں نہا۔ کاشفہ سا ہو گیا تھا اور نصیبیاں کے کیس کے بعد ویسے بھی میری کیفیت اتنی بو بھل ہو گئی تھی کہ راستہ گزرنے کے باوجود بھی میرے اندر کسبندی موجود تھی۔ اس لئے نہر کا پانی میرے لئے اس وقت اور بھی موزوں تھا۔ یہاں آج بھی سناٹا تھا۔ میں نے عادتاً چاروں طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اپنا لباس اتارا اور نہر میں اچھل گیا..... اف! کتنا سکون میسر آیا تھا مجھے..... اسے بیان کرنا میرے لئے بے حد مشکل ہے۔

چند منٹ تک میں اسی کیفیت میں رہا۔ پانی ہی پھر مجھے وہی احساس ہوا جو کل بھی مجھے بیان کر رہا تھا۔ کوئی مجھے دیکھ رہا تھا؟ ہاں..... یہ اتنا اٹل تھی کہ آج بھی مجھے دیکھا جا رہا تھا۔

پرندوں کی تروتازہ ہچچاہٹ سے فضا میں مہم می موسیقی کا رد ہم آ رہا تھا۔ عین اسی وقت گولی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی: ”ٹھانیں.....!“

کسی پرندے کی چیخ گونجی اور پھر وہ آواز مدوم ہو گئی۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنا کسی درخت سے کوئی دھم سے کودا تھا۔ چونکہ نہا تھا اس لئے یہ آواز بھی گونجی ویسے مجھے یقین ملا کہ یہاں کوئی شکاری موجود ہے، جس نے کسی پاندے کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا ہے۔ بہر حال میں اپنے ”کام“ میں ہی مصروف رہا۔

عین اسی وقت درختوں کے پتوں میں پانی خلاء نمودار ہوا اور ایک حسین لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ یہ وہی تھی جو گزشتہ روز گھوڑے پر سوار رہی تھی۔ ہمارے قریب سے گزری تھی اور اس کے بارے میں مجھے بیدل نے ایک عجیب سی کہانی سنائی تھی۔

”اے سنو.....! مجھے تیز اٹھا کر لا دو.....! اوہ طرف پڑا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

میں بری طرح سمٹ گیا۔ ظاہر ہے کہ میں اس وقت کپڑوں سے بے نیاز تھا اور نہر کا شفاف پانی میرا وجود چھپانے کیلئے ناکافی تھا۔

”سنا نہیں تم نے.....!“ اب کی بار وہ حلقی بولی: ”جلدی سے باہر نکلو.....!“

”مس صاحبہ.....!“ میں نے بھی انداز نیکیا کر لیا: ”کیا آپ کی نظریں کمزور ہیں؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ وہ شعلہ بار ہو گئی: ”اور تم نے یہ مجھے کیا بولا.....؟“

”مس صاحبہ.....!“ میں نے دہرایا۔ ”یہ کیا نام ہوا.....! کیا تم مجھے جانتے نہیں ہو.....؟“

”بالکل نہیں.....“

”ہوں..... کیا تم اس علاقے کے نہیں ہو.....؟ مجھ سے تو بچہ بچہ واقف ہے۔“

”یقیناً ہوگا، لیکن میں اس سعادت سے محروم ہوں۔ کیونکہ میں پردیسی ہوں۔“

”ہاں..... مجھے اندازہ ہے.....“ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر چونکی: ”کیا تم بہرے ہو! باہر نکلو اور میرا تیز اٹھاؤ۔“

”میرا نام سلمان ہے۔ کیا میں آپ کو دوبار مس صاحبہ کہوں!“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے زور سے گردن ہلائی: ”میں شہزادی گلزار ہوں.....“

”اچھا تو شہزادی.....!“ میں آرام سے بات کر رہا تھا: ”میری حالت آپ اس وقت دیکھ رہی ہیں۔ میں ابھی کیسے نکل سکتا ہوں..... آپ پردہ کریں گی تو میں باہر آ کر کپڑے پہنوں گا.....!“

”اوہ.....“ ایک بیک اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی اور فوراً ہی درختوں کے پتے برابر ہو گئے۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور باہر نکل آیا۔ عجیب قسم کی لڑکی تھی وہ..... اس کا مطلب یہ تھا کہ بیدل نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا، لیکن پائل پن، سکی پن اور وحشی پن میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ لڑکی پائل یا سکی تو ہو سکتی تھی، لیکن ہرگز نہیں تھی۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور اپنے

پرانے کپڑے کا پونٹا اٹھالیا۔ عین اسی وقت لڑکی کی آواز آئی:

”تیار ہو گئے.....!“

”جی شہزادی.....“ میں نے نعرہ لگایا۔ پتوں میں پھر خلا نمودار ہو گیا:

”ٹھیک ہے..... ادھر آ جاؤ.....“

میں جب اس کی بتائی ہوئی سمت سے آگے بڑھا:

”نہر میں کود کر اب ادھر آ جاؤ.....!“ دوسرا حکم جاری ہوا۔ میں ٹھنک کر رک گیا۔

”کیا.....؟ تم رکے کیوں.....!“

”میرے کپڑے گیلے ہو جائیں گے.....“ تو میں اس وقت جو کہہ رہی تھی غلط تھا؟ وہ

ہنس کر بولی اور میری کھوپڑی ناچ اٹھی..... یہ تو کافی تیز رفتار لڑکی تھی۔

بہر حال میں نے اپنے کپڑوں کو سمینا اور نہر میں سے ہوتا ہوا آہستہ آہستہ چل کر دوسری طرف

اتر آیا۔ اب وہ لڑکی میرے سامنے موجود تھی۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی اور قریب ہی ایک

درخت کے تنے سے اس کا گھوڑا بھی بندھا ہوا تھا۔ وہ مجھے کافی غور سے دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔

”جی..... اب بتائیں..... کہاں ہے وہ تیر.....؟“ میں نے پوچھا۔

”جیل کے پیٹ میں.....!“

”جی.....!“

”ہاں..... تم جب اس طرف آرہے تھے تو جیل نے جھپٹا مارا اور اسے اٹھا لے گئی۔“

”اوہ..... آپ دوسرا شکار کر لیں.....!“

”نہیں..... مجھے وہی کھانا تھا۔“ اس نے منہ پھلایا۔

”تو پھر آپ جیل سے رابطہ کریں۔“ نے جواب دیا: ”میں جا رہا ہوں۔“

”اے سنو.....!“ وہ آگے بڑھی: ”کہاں رہے ہو؟“

”جہاں سے آیا تھا۔“

”میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں.....“ نے کل ہی تمہیں دیکھا ہے..... اور تم مجھے بہتر

اچھے لگے ہو..... ادھر آؤ مجھ سے باتیں کرو..... اس نے بڑی لگاؤ سے کہا تھا۔

”معاف کرنا شہزادی.....!“ میرا لہجہ خشک تھا: ”میرے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا..... بہتر

سے کام کرنے ہیں مجھے.....!“ گلزار کا چہرہ واقعی گلزار ہو گیا اس کے چہرے

پر شدید غصے کے آثار نمودار ہوئے اس نے اپنی رائفل وہیں بچھنی اور پاؤں پچھتی ہوئی اپنے

گھوڑے کی طرف لپکی۔ میں نے اس پر قلعی توڑ نہیں دی اور نہر کے راستے واپس اپنے علاقے

میں آ گیا۔ اپنے علاقے سے مراد سردار کا علاقہ.....!

اس کا گھوڑا میرے سامنے سے ہی بگٹ لگا تھا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں اس سے

بے نیاز ہو کر اپنے راستے پر قدم اٹھا رہا تھا ابھی تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ مجھے گھوڑوں کی

ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تعداد میں کئی ہوں اور پھر جیسے ہی میں درختوں

کے درمیان سے نکلے گا ایک کڑک دار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:

”رک جاؤ.....!“

میں واقعی ٹھنک کر رک گیا۔ دائیں جانب سے پانچ گھڑ سوار برآمد ہوئے ان میں سے آگے گلزار ہی تھی باقی چاروں جوان مرد تھے۔ ان کی

لہ و قامت کافی اچھی تھی۔ البتہ ان کے ہونٹوں لے اور موجود سوئی موٹی مونچھیں الگ سے ہی

ملی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے خوں خوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ مزید میرے

قریب آ گئے: ”تم کون ہو.....! اور تم نے ہماری بہن کو

ایوں چھیڑا.....!“ ”میں نے چھیڑا ہے.....!“ میں چونکا: ”یہ تم

ایا کہہ رہے ہو.....!“ ”ہماری بہن نے ہمیں بتایا ہے۔“ وہی

۱۱۔

”میں نے کوئی چھیڑ چھاؤ نہیں کی.....“ ”تو کیا ہماری بہن جھوٹ بول رہی ہے!“

”ہاں.....“ ”گلو اس مت کرو.....“ وہ پھر کر دھاڑا:

”جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟“ مجھے بھی تاؤ آ گیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ان

بہن کے بھائیوں کو مڑا چکھا دوں۔ لیکن میں ضبط کر گیا۔ جب مجھے دنیا میں نکل کر مظلوموں کی مدد

کرنا تھی۔ تو یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ طرح طرح لے لوگوں سے میرا واسطہ پڑنا لازمی تھا اور ان کی

بق اور ناحق باتوں کو برداشت کرنا تھا۔ چنانچہ ہاتھوں بعد میں نے کہا:

”میں کیا جانوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور اس سے کہہ رہا ہوں۔ میں تو یہاں اچھی ہوں“

”دیکھی ہوں.....“ ”اوہ..... تم پردیسی ہو.....؟“ وہ لوگ

بے تکے اور پھر انہوں نے عجیب سے انداز میں گلزار کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس وقت

گلزار نے اپنی ایک بے ساختہ مسکراہٹ کا گلہ گھونٹا ۱۲۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا تھا۔

”ہاں.....“

”یہاں کس لئے آئے ہو.....!“

”میں مسافر ہوں۔ حادثاتی طور پر یہاں پہنچا ہوں۔“ میں نے گول مول جواب دیا: ”چند

روز کیلئے مجھے ان خیمے والوں نے اپنے پاس ٹھہرایا ہے..... میں شاید کل روانہ ہو جاؤں گا۔“

”کیا!! تم ان چوروں کے یہاں ٹھہرے ہو!“ ایک نے چونک کر کہا۔

”ہاں.....!“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی چور ڈکیت ہو.....!“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے میں نے کہا نا کہ میں مسافر ہوں.....“

”اچھا.....“ ایک نے سر ہلایا: ”بس یہیں پر تمہاری قسمت یاوری کرگئی۔ ورنہ اب تک تمہاری

لاش کو چیل اور کوکے نوچ رہے ہوتے.....!“ ”میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے؟“

میرے لہجے میں حیرت تھی۔ ”ہماری بہن کو بری نظر سے دیکھنا بہت بڑا

جرم ہے..... ہم لوگ اب تک نہ جانے کتنے لوگوں کو اسی چکر میں موت کے گھاٹ اتار چکے

ہیں.....“ ”اوہ.....“ میرے منہ سے نکلا۔ تو بیدل سے بچ ہی کہا تھا۔

”اب چونکہ تم پردیسی ہو اس لئے ہم تمہیں قید میں ڈالیں گے.....“ وہی بولا تھا: ”چلو

ہمارے ساتھ.....!“ ”کہاں.....!“

”ہمارے کوٹھ..... چلو..... بیٹھ جاؤ.....“ میں نے چند لمحے سوچا، پھر میں نے اپنے

مؤکلوں سے مشورہ لیا۔ جواب حیرت انگیز تھا۔

مجھے ان کے ساتھ بیٹھ جانے کا اشارہ ملا تھا۔
 ”کیا سوچ رہے ہو؟“ ایک نے ہنس کر پوچھا۔
 ”کیا بھاگنے کا ارادہ ہے؟“
 ”یہی سمجھ لو..... کیونکہ میرے پاس گھوڑا ہے اور نہ رنڈ اٹھل!“
 ”حاضر جواب بھی ہو.....“ اس نے آنکھیں نکالیں۔
 ”چلو..... جلدی آؤ.....!“
 میں جھٹ سے گنار کے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اس آدمی نے فوراً ہی مجھے ٹوکا:
 ”اے..... ادھر آؤ.....!“ وہ مجھے بری طرح گھور رہا تھا۔

”اوہ..... اچھا.....!“ میں جیسے چونکا، گنار نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔
 پھر میں اس کے بھائی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچیں اور ان کے رخ گھما دیے۔ جلد ہی وہ مناسب رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ آگے جا کر یہ نہر کافی چھوٹی ہو گئی تھی، وہیں سے اسے گراس کرنے کے بعد گھوڑے واپس ہوئے اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

یہاں بھی گھنے درختوں کا سلسلہ موجود تھا۔ ایک جنگل نما علاقے سے گزرنے کے بعد آبادی کے آثار دکھائی دیئے۔ جہاں کافی تعداد میں مکانات بنے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک چھوٹا سا شہر آباد ہے کچھ مکانات کچے تھے اور کچھ لال اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ یہاں لوگوں کی بھی کافی آمد و رفت تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان لوگوں پر نظر پڑتے ہی لوگ مرحوب انداز میں سلام کر رہے تھے اور بعض ان سے خوف زدہ بھی تھے۔

ایک بڑے سے مکان کے سامنے وہ لوگ

رک گئے اور انہوں نے مجھے بھی اترنے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک بھائی گنار سے مخاطب ہوا:
 ”جاؤ تم..... گھر میں جاؤ.....!“
 ”میں واپس جا رہی ہوں.....“ وہ ہنسنے لگی۔
 ”تیرا شکار کرے لاؤں گی.....!“
 ”کل چلی جانا.....“ اس کا انداز نرم تھا۔
 ”آج گھر میں رکھے ہوئے تیرے گزرا کر لو.....“
 ”نہیں.....“ اس نے منہ بنایا: ”وہ ہمارا ہے.....!“

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور وہاں سے چلی گئی۔ یہ لڑکی میری سمجھ سے باہر تھی۔ یوں اس کے بھائی بھی کچھ کم نہیں تھے۔ بہر حال اسے ان لوگوں سے پالا پڑ ہی گیا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ان کے کئی خادم بھی تھے، جو فوراً ہی آگے لپکے تھے اور انہوں نے گھوڑوں کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے لی تھیں۔ ان کا رخ شاید اصطبل کی طرف تھا۔
 یہ لوگ مجھے اندر لے آئے، فوراً ہی دو اسلحہ بردار آگے بڑھے:

”اسے بند کر دو..... پردہسی ہے“ کھانہ پینے کا خیال رکھنا.....!“
 ”تا بعداد ہیں جی.....! انہوں نے سر کو خم کر دیا اور پھر کسی قدر کثرت انداز میں میری طرف دیکھ کر بولے: ”چلو.....“
 فی الحال میرے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ میں ان کے ہمراہ چل بڑا۔ یہ مکان حویلی کی طرح پر بنا ہوا تھا۔ دالان سے گزرنے کے بعد ہم ایک بڑے سے برآمدے میں داخل ہوئے۔ جہاں ایک قطار میں ترتیب سے کمرے بنے ہوئے تھے۔

کمرے کے دروازے کے ساتھ ایک

دالان والی کھڑکی موجود تھی اور کمرے میں پینک تھا۔ ہمارا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔
 ”ایک کمرے کا دروازہ کھولا گیا اور پھر مجھے داخل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ ایک پہرے والے نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا:
 ”اب تم یہاں آرام کرو..... بھوک لگے تو دروازے دینا.....!“
 ”کچھ اور لگے تو.....!“ میں نے جھٹ سے کہا۔
 اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا:
 ”اس کونے میں جو دروازہ ہے، وہ کچھ اور.....!“

”ٹھیک ہے..... اور مجھے اب بھوک بھی لگ رہی ہے.....“ میں نے سر ہلایا۔
 ”تھوڑا صبر تو کرو.....“ وہ بولا: ”ابھی تو.....“
 ”ابھی آیا ہوں تو کیا ہوا“ میں رات سے بھوکا تھا۔
 ”ٹھیک ہے..... ہم انتظام کرتے ہیں.....“

اس نے کہا اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔ میں نے دائیں طرف موجود دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندر واقعی ہاتھ روم موجود تھا اور کافی سا کھانا تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور پینک کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چھت میں باقاعدہ پینک بھی موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس چھوٹے گاؤں میں بھی انتظام تھا۔

میرے پاس اب فی الحال کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ آنے کا اشارہ کیوں ملا تھا، میں نے مؤکلوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان اس طرف بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میں اس وقت ان انجان اور عجیب قسم کے لوگوں کی قید میں تھا..... کہاں وہ سردار کا قبیلہ اور کہاں یہ لوگ.....!

لیکن مجھے اس وقت بھی مصلحت پسندی سے کام لینا تھا اور خود کو حالات کے دھار سے پر چھوڑنا تھا۔ پھر دیکھنا تھا کہ قسمت کیا گل کھلائی ہے۔ مجھے اس وقت سردار چل وغیرہ کا بھی خیال آیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ لیکن اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے تلاش کرنے کیلئے کس قسم کے ذرائع استعمال کریں گے..... کیا انہیں معلوم ہو پائے گا کہ مجھے گنار کے بھائی اپنے ساتھ لے آئے ہیں؟ کیونکہ بیدل کی زبانی مجھے ان لوگوں کے متعلق تھوڑا بہت معلوم ہو چکا تھا، یقیناً سردار چل کو بھی گنار وغیرہ کے بارے میں مکمل آگاہی ہوگی اور انہیں اس بات کا بھی علم ہوگا کہ میں جس جگہ سے غائب ہوا تھا، وہاں گنار کا آنا جانا بھی رہتا ہے۔

خیالات کی رو بہتی چلی گئی۔ اسی دوران مجھے گنار کا خیال بھی آیا، وہ نہ جانے کس قسم کی لڑکی تھی.....! اس کا کردار کچھ واضح نہیں ہو سکا تھا۔ اگر بظاہر دیکھا جائے تو وہ بے حد شوخ و شنگ قسم کی لڑکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ گزشتہ روز بھی مجھے چھپ کر دیکھتی رہی تھی۔ لیکن کیوں.....؟ کیا یہ ایک اخلاقی جرم نہیں تھا؟ اور وہ بھی لڑکی ذات ہو کر اس حرکت کی مرتکب ہو رہی تھی..... ایک گاؤں گوشت جیسی جگہ پر اس قدر بے باک قسم کی لڑکی کی موجودگی کچھ عجیب سا تاثر قائم کر رہی تھی..... یقیناً اس میں بھی کوئی بھید تھا..... ابھی اس بات پر غور کرنا فضول ہی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وقت کے دھارے پر بہنے کے بعد ہی گنار کے

بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل ہو جائیں..... لیکن فی الحال تو میں اندھیرے میں تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھیں کہ وہی دونوں پہریدار نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں ایک خوان تھا جو کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ دروازے کی چل درز میں کافی کشادہ خلاء موجود تھا۔ اس نے اسی خلاء سے وہ خوان اندر کھسکا دیا۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس آگئے:

”لو..... اٹھا لو!“ وہی بولا تھا: ”ہم تمہارے لئے کھانا لے آئے ہیں۔“

”اچھا.....“ میں نے سر ہلایا: ”اب ایک بات تو بتاؤ.....“

”کیا!.....!“ اس نے پوچھا۔ وہ مجھے ٹٹولنے والی بات سے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے کس جرم میں یہ سزا ملی ہے؟“

”ہمیں نہیں معلوم..... یہ بات زمیندار لوگ جانیں۔“

”اچھا..... یہ تو بتاؤ کہ مجھے یہاں کب تک رہنا ہوگا؟“

”گیارہ تاریخ تک.....“ دوسرا بول اٹھا۔

پہلے والے نے اسے تیز نظروں سے گھور کر دیکھا۔

بولنے والا بغلیں جھاٹنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ جملہ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ہو۔

”کیا مطلب.....!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جنہوں نے تمہیں قید کیا ہے، وہی بتا سکیں گے۔“ پہلے نے جواب دیا: ”ہمیں کچھ نہیں معلوم.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور پھر دونوں وہاں سے چلے گئے۔

اب میں سوچ میں ڈوب گیا، دوسرے

اس..... اس دوران میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ جاننے کے بعد بھی مجھے اچھی طرح یاد رہا۔ مجھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خواب نہ ہو بلکہ حقیقت

اس خواب میں جو منظر دکھائی دے رہا تھا، وہ من عجیب سا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اگر کوئی انسان وہ خواب دیکھ لیتا تو جاننے کے بعد اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کیلئے بہیمان ضرور ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دونوں طرف ایک ایک فرد اس طرح موجود ہے

انہوں نے میرے ہاتھوں اور پیروں میں

فیریں ڈال رکھی ہیں۔ میں ان کے ساتھ آہستہ

آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں..... لیکن کہاں؟

بات خود مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ میرے

انسان کی رات سے بھی زیادہ گہرا اندھیرا ہے۔

مجموع اس وقت یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ میں قدم

بہاں رکھ رہا ہوں۔ بس میں آگے بڑھ رہا ہوں

ان اندھیرے میں کھوتا چلا جا رہا ہوں..... پھر

ای میرے سامنے ایک بھیا تک وجود

آتا ہوتا ہے یہ کوئی بلا ہے جس کا پورا وجود ہی

میرے میں مدغم نہیں ہو رہا بلکہ میں صاف طور

پر دیکھ رہا ہوں اس کے ہاتھوں کا گوشت بھی

میں اس وقت ایک عجیب وغریب قسم کے خواب سے دوچار تھا..... کافی دیر تک میرا ذہن اس

خواب سے پراگندہ رہا..... نہ جانے کیوں مجھے

اس قسم کا خواب دکھائی دیا تھا.....! ہو سکتا ہے کہ

کھانے سے میں بدقسمی کا شکار ہو گیا ہوں۔

کیونکہ اکثر معدے کی خرابی کے باعث بھی اس

نوعیت کے خوابوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ میں

اٹھا اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔ جب میں ہاتھ منہ

وغیرہ دھو کر باہر نکلا تو کھڑکی کی سلاخوں میں دو

جانے پہچانے چہرے دکھائی دیئے، یہ گنار کے

بھائی تھے:

”کھانا کھا لیا تم نے.....!“

”ہاں.....“

”اور کچھ چاہئے.....!“ پوچھا گیا۔

”ہاں.....“ میں نے جلدی سے سر ہلایا۔

”کیا..... بولو.....!“

”رہائی.....!“ میں نے جواب دیا اور ان

کے منہ بن گئے۔ پھر ان میں سے ایک بولا تھا:

”اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہو گے مل جائے

گا..... کیونکہ ہم تمہیں تنگ نہیں کرنا چاہتے.....

اگر تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہو تو فوراً بتاؤ۔“

”اس مہربانی کی وجہ.....!“ میں نے پوچھا:

”میں قیدی بھی ہوں اور میرا خیال بھی رکھا جائے

گا؟“

”تم بہت زیادہ بولتے ہو۔“ وہ جھلا گیا:

”بات یہ ہے کہ ہم لوگ بہت مہمان نواز ہیں اس

لئے سب سے ہمارا سلوک یکساں ہوتا ہے۔

چاہے وہ دوست ہو یا دشمن.....“

”بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر.....“

میں نے جواب دیا: ”میں زندگی بھر آپ لوگوں کی

اس مہمان نوازی کو یاد رکھوں گا۔“



(EARLY CHILDHOOD INCLUSIVE EDUCATION SCHOOL)

• Montessori • Kindergarten • Remedial education • Daycare
• Speech therapy • Inclusive education • Play group class



Plot No-22, CP & Barar Co-Operative
Housing Society, Off Amir Khusro Road,
Near Tahir Medical Center, Karachi.

03202632430, 03343117002

scld@yahoo.com scld@yahoo.com

”زندگی بھر.....!“ اس نے دہرایا۔ پھر عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولا: ”ٹھیک ہے۔ یاد رکھنا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں اس کے انداز کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن میں اس سلسلے میں ناکام رہا۔

”اچھا..... اب ہم جا رہے ہیں.....“ پہلے
نے کہا: ”ہم بس تمہاری خیریت معلوم کرنے
آئے تھے۔“

”ایک بات پوچھوں.....!“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

”ہاں..... پوچھو.....!“
”کیا میرے علاوہ بھی یہاں کوئی اور قیدی
موجود ہے؟“

”اس بات کا تم سے کیا تعلق.....؟“ وہ بھنا کر بولا: ”تم صرف اپنے آپ سے مطلب رکھو اور انہی فکر کرو.....“

”میں اس لئے پوچھ رہا تھا کہ اگر کوئی اور بھی یہاں موجود ہے تو اسے بھی میرے ساتھ ہی کر دو اچھا ہے..... ہم دونوں کا وقت آسانی سے گزر جائے گا..... کیا خیال ہے؟“

”بہت برا خیال ہے۔“ جواب ملا اور پھر وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

راست کو ملنے والا کھانا بھی بے حد شاندار تھا،
میں اب الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ آخر اس خاطر
مدارت کی کیا حقیقت تھی.....! میں اس وقت ان
دونوں بھائیوں کے سامنے گیارہ تاریخ کا تذکرہ
کرتے کرتے رک گیا تھا..... نہ جانے پھر کیا
معاملہ ہوتا۔ اس لئے فی الحال میں نے خاموش
رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ پھر میں نے سوچا تھا کہ
ان چہریداروں کو ہی کسی وقت کریدوں گا۔ ہو سکتا
ہے کہ کوئی اہم بات سامنے آجائے۔

کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی مجھ کا غلبہ ہونے لگا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اتنی تیزی سے غلبہ ہو گیا۔ بہر حال میں نے ایک بار پھر پلانک اور لمبی تان کر سو گیا۔ لیٹنے سے قبل دروازہ کھڑکی اندر سے لگانا نہیں بھولا تھا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب
بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کوئی چیز میری ناک سے
نکلی اور شاید اسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی
میں نے آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا:

”ارے احمق.....!“ ایک دلی دلی سی
میرے کانوں سے گھرائی: ”ادھر دیکھو.....
ہوں گلنار.....!“

اب میں نے چونک کر کھڑکی کی طرف
واقعی وہاں گلزار موجود تھی:

”دروازہ کھولو جلدی سے.....“ اس سرگوشی کی۔

میں اٹھا اور دروازے کی کنڈی کھول دی
جھٹ سے اندر آ گئی۔ اس نے کنڈی دھکی

چڑھا دی تھی۔ اب مجھے یاد آیا کہ اس نے
احمق کہا تھا، میں اسے گھورنے لگا..... لیکن بولا

نہیں۔ وہ بے چاری مجھ سے واقف کہاں تھی
اسے کیا معلوم تھا کہ میں کون ہوں، میری

”تم نے اندر سے کنڈی کیوں کیا ہے..... بہر حال میں ضبط کر گیا۔“

”تو کیا میں ایسے ہی سو جاتا.....!“

شک کیا: ”رات میں نہ جانے کون آ کر میرا
کر ڈالتا میں سوتا ہی رہ جاتا.....“

اب وہ آرام سے پنک پر بیٹھ چلی گئی
نے میری بات سنی اور مسکرا کر بولی:

۴۴۱

استے جتن کرنے کی کیا ضرورت تھی..... کب کا کاٹ کے ڈال دیتے.....“

”میں تمہارے اس جملے کا کیا مطلب لوں.....؟“ میں نے اسے گھورا: ”کیا مجھے کسی اور طرح مارنا مقصود ہے؟“

یہ سن کر وہ گڑبڑا گئی، لیکن پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی:

”تم مذاق اچھا کر لیتے ہو..... یہ بتاؤ کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو.....؟“

”پہلے تم میری بات کا جواب دو..... پھر بات آگے بڑھانا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا: ”یہ وقتی قید ہے، پھر تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔“

”اچھا..... پھر گیارہ تاریخ کا کیا چکر ہے!“

میں نے اچانک ہی پوچھا۔

”یہ سنتے ہی وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی، پھر وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی:

”تم کو..... تم کو کس نے بتایا..... تمہیں کیسے معلوم ہوا.....؟“

”تمہارے پہریدار آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سن لیں.....“

”کیا..... کیا سن..... تم سنے!“

”میں زیادہ نہیں صرف گیارہ تاریخ والی بات ہی پلے پڑی تھی۔“ میں نے بتایا۔

”اوہ“ اس کے منہ سے اطمینان بھری سانس نکل گئی: ”بات یہ ہے کہ گیارہ تاریخ کو ہمارا سالانہ جشن ہے، اس میں تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔“

”کس چیز کا جشن؟“

”ہوتا ہے بس..... یہ ہماری قدیم روایت ہے..... صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے یہ جشن..... ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے سے.....!“

”اس جشن کو نوعیت کیا ہوتی ہے؟“

”ارے..... تم تو بحث ہی کرنے لگے..... وہ جھنجھلا کر بولی: ”کیا میں اس لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

”تو پھر کس لئے آئی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں سے بے پناہ محبت جھانکنے لگی۔ پھر وہ بڑی اداس ہوئی:

”میں نے پرسوں بھی تمہیں نہر کے کنارے دیکھا تھا۔ بس..... میں جب سے ہی تمہیں چاہنے لگی ہوں..... مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“

میں نے ایک بے ساختہ قسم کے قہقہے کو پیدا میں ہی روکا اور بولا:

”محبت.....! کیا مطلب.....؟“

”اگر محبت ہوئی تو تم جھوٹ نہ بولتیں..... میں نے تیرے نظروں سے گلناری جانب دیکھا۔“

”جھوٹ..... کیا جھوٹ.....؟“ وہ چونکا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

”تم گیارہ تاریخ کی حقیقت اب بھی سے چھپا رہی ہو۔ مجھے سچ بتاؤ۔“

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ خاموش رہی تھی۔ میں اس کا غور سے جائزہ لیتے ہوئے بولا:

”اگر اس وقت میرے پاس آئینہ ہوتا تو میں تمہیں تمہاری ہی شکل دکھاتا، تاکہ تم اپنے جھوٹ کا خود ہی سامنا کر لیتیں۔“

”تم نے فضول باتیں کر کے میرا موڈ خراب

دیا ہے۔“ اس کے تیور بگڑ گئے: ”میں کتنے مان لے کر تمہارے پاس آئی تھی۔“

”یہاں میری جان مصیبت میں پھنسی ہے۔“

”میں نے رو دینے کا انداز اختیار کیا: ”اور تمہیں اپنے ارمانوں کی، یعنی ہری ہری سوچہ رہی..... اف..... کیا ہوگا میرا.....؟“

اب میں نے واقعی باقاعدہ رونا شروع کر دیا، مادہ بونٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی:

”ارے..... ارے..... یہ کیا کر رہے ہو؟ تم تو روتوں کی طرح رو رہے ہو..... چپ ہو جا.....“

”ارے میں تو مارا گیا۔“ میں نے دہائی دی:

”بے قصور مجھے پھنسا یا گیا“ میں نے تو تم کو چھیڑا سی نہیں تھا۔“

”ہاں..... ہاں..... مجھے معلوم ہے۔“ وہ جلدی سے بولی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی:

”نی الحال تم آرام کرو، میں کل آؤں گی تمہارے پاس..... ہاں.....“

”یہ کہہ کر اس نے جلدی سے کنڈی کھولی اور اٹھ گئی، وہ دوسری طرف سے دروازے کو بند نا بھولی نہیں تھی، پھر اس نے سلاخوں کی طرف الوداعی ہاتھی لہرایا اور روفو چکر ہو گئی۔

میں بے اختیار مسکرانے لگا۔ رویا تو پہلے بھی اس تھا..... بس اس لڑکی سے نجات حاصل کرنے کا مجھے یہی حل نظر آ رہا تھا۔

اب اگر وہ دوسرے دن میرے پاس آئی، تو اس سے بہت کچھ اگلوئے کی کوشش کروں گی..... کیونکہ میرے آج کے رویے نے اس کے سے یہ بات تو اگلوادی تھی کہ مجھے خواہ خواہ پاس کر یہاں لایا گیا تھا اور اس بات سے گلنار ابی طرح واقف تھی۔

بہر حال اب میں اس لڑکی کو اپنا مہرہ بنا کر کوئی لائحہ عمل تیار کر سکتا تھا۔ یہ بات تو واضح تھی کہ وہ پیار محبت کا صرف ڈھونگ رچا رہی تھی..... میرے نظریے کے مطابق وہ جس ٹائپ کی لڑکی تھی۔ اس کے سامنے یہ سب فضول اور بکواس تھا..... وہ صرف اپنے وقتی مقاصد کیلئے مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھی.....

گیارہ تاریخ کے بارے میں سن کر جس طرح وہ چونکی تھی اور اس کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری قید سے اس تاریخ کا کوئی نہ کوئی واسطہ ضرور ہے..... اس نے جو بات بتائی تھی وہ میرے حلق سے نہیں اتر سکی تھی۔

میں نے جب سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ جسمانی طاقتوں کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی کافی حد تک تیز کام کرنے لگا تھا..... ورنہ ان ذہنی داؤ پیچوں سے میرا پہلے کب واسطہ پڑا تھا..... جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، میری تمام صلاحیتوں میں مزید بہتری اور مضبوطی آتی جا رہی تھی..... اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ کیونکہ ہر جگہ صرف جسمانی قوتیں استعمال نہیں ہوتیں۔ کہیں پر ذہنی جنگ بھی لڑنی پڑتی ہے..... کسی کامیابی کیلئے ان دونوں قوتوں کا مشترکہ ہونا لازمی ہے..... اور پھر میں تو اپنے اسلاف کے سائے میں تھا، وہ سایہ جو بے حد مضبوط اور ناقابل شکست تھا.....

دوسرا دن بھی معمول کے مطابق گزرا، تین وقت مجھے آج پھر بہترین اور لذیذ کھانا دیا گیا، اس کے علاوہ بھی مجھ سے میری فرمائش پوچھی گئی۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ آزادی کا سوال کرنا تو فضول ہی تھا..... اور اس کے علاوہ



آپ دو شیزہ کے خریدارین کو ملک کو
نرم ہمارا دل پیچھے

اندرون ملک = 1000 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

کویت	65 امریکی ڈالرز	ایران	65 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	65 امریکی ڈالرز	سری لنکا	65 امریکی ڈالرز
یو اے ای	65 امریکی ڈالرز	جاپان	65 امریکی ڈالرز
مصر	65 امریکی ڈالرز	لیبیا	65 امریکی ڈالرز
یونان	65 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	65 امریکی ڈالرز
فرانس	65 امریکی ڈالرز	جرمنی	65 امریکی ڈالرز
برطانیہ	65 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	65 امریکی ڈالرز
ناروے	65 امریکی ڈالرز	پولینڈ	65 امریکی ڈالرز
امریکہ	75 امریکی ڈالرز	کینیڈا	75 امریکی ڈالرز
افریقہ	75 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	75 امریکی ڈالرز

اگر آپ پاکستانی کرنسی میں پاکستان کے کسی بینک کے ذریعے ادائیگی کرنا چاہیں تو
75 امریکی ڈالر کے حساب سے مندرجہ بالا شرح کے مطابق بینک ڈرافٹ ارسال
فرمائیں۔ مطلوبہ رقم کا ڈرافٹ Sach-Chee Kahaniyan Monthly کے نام بھیجیں۔
آپ کو ایک سال تک آپ کا پسندیدہ رسالہ ہوائی ڈاک سے بذریعہ رجسٹرڈ ملتا رہے گا۔

آئی ای ایچ کے II C-88 فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
P.O Box # 3129 P.E.C.H.S Karachi 78400 فون نمبر 35893122 • 021-35893121

انجان سا بن گیا۔ پھر میں نے کہا:
”کیا تم رات میں سوتی نہیں ہو؟“
”کہاں نیند آتی ہے۔“ وہ ایک ادا سے
مسکرائی: ”بس رات ہوتی ہے اور بے چینی شروع
ہو جاتی ہے۔“
”ہوں۔۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا
ہاضمہ خراب ہے۔۔۔۔۔“
”نذاق اڑا رہے ہو میرا؟“
”نہیں مس صاحبہ۔۔۔۔۔! میں نے نفی میں
بلا یا: ”میں جس حال میں ہوں اس میں وہ تو
سب کچھ سوچ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ یہاں پر کسی
خیال کا تصور بھی نہیں آ سکتا۔“
”میں نے سوچا تھا کہ تمہارے پاس اب نیند
آؤں گی۔“ اس نے کہا: ”لیکن پتا نہیں کیا
ہے تمہارے اندر۔۔۔۔۔ میں خود بخود ہی یہاں
چلی آئی ہوں۔“
”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک رحم
شہزادی ہیں اور مظلوموں کی مدد کرنا آپ
عادت میں شمار ہے۔۔۔۔۔ آپ اگر شیر اور تیل
دشمن ہیں تو کیا ہوا۔۔۔۔۔!“
”پھر تم نے میرا مذاق اڑایا۔۔۔۔۔!“ اس
مجھے گھورا۔
”میں نے کہا تھا کہ ان دو دونوں میں
ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی۔ میرے تمام
اور احساسات کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔۔۔۔۔ میں
حالت میں آپ سے کیا بات کروں۔۔۔۔۔
آپ بھی مجھے کسی قسم کا حوصلہ نہیں دے رہے
ہی مجھے یہ بتا رہی ہیں کہ میں یہاں سے کب
پاؤں گا۔۔۔۔۔“
(اس دلچسپ داستان کے بتایا
آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے)

کوئی اور چیز مانگنا بھی بے سود تھا۔۔۔۔۔ وہ دن میں
نے نہایت خاموشی سے گزارا۔ کسی سے بھی چھیڑ
چھاڑ نہیں کی۔
اس رات کو میں جاگ رہا تھا۔ جب کھڑکی پر
آہٹ ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ
گلنار ہی تھی اور آج خلاف توقع مسکراتی ہوئی اندر
داخل ہوئی تھی۔
”کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آج جاگ رہے ہو؟“
”ہاں۔۔۔۔۔ نیند نہیں آرہی تھی۔“
”کیوں۔۔۔۔۔!“ اس نے میری آنکھوں میں
جھانکا: ”کیا میری یاد آرہی تھی؟“
”پتا نہیں۔۔۔۔۔“ میں نے کندھے اچکائے:
”دو دن گزر گئے“ اب تو میری ذہنی کیفیت بھی
ٹھیک نہیں ہے۔“
”دل توڑ دیتے ہو تم ایسی بات کر کے۔۔۔۔۔“
وہ بڑے پیار سے بولی تھی پھر اس نے جلدی سے
کہا: ”یہ پلنگ دروازے کی طرف لے آؤ۔۔۔۔۔
کھڑکی سے آؤ ہو جائے گی، پھر ہم اطمینان سے
بیٹھ کر باتیں کر لیں گے۔۔۔۔۔!“
میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا، تھوڑی دیر
بعد ہی ہم دونوں آنے سے بیٹھے ہوئے تھے۔
”یہ دل توڑنے کی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت
ہے۔“ میں نے کہا: ”اگر تم کسی پرندے کو پکڑ کر
پنجرے میں ڈال دو گی تو وہ بھی تم کو ہوجائے گا“
میں تو پھر انسان ہوں۔۔۔۔۔“
”ہاں۔۔۔۔۔ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔!“
”اب دیکھو نا۔۔۔۔۔! مجھے قطعی یاد نہیں ہے کہ
آج دن کیا ہے تاریخ کون سی ہے۔۔۔۔۔!“
”آج جمعرات ہے۔۔۔۔۔ اور نو تاریخ
ہے۔۔۔۔۔“ وہ روارواری میں بدل گئی۔ پھر وہ غور سے
میری طرف دیکھنے لگی۔ لیکن میں اس وقت

کراچی سے ارسال کردہ انتہائی پُر اسرار کہانی

جو ڈر گیا وہ مر گیا

منابل بھی ڈر گئی تھی کوئی تھا جو اُسے ڈر رہا تھا..... مگر درحقیقت

کوئی اُسے راہ راست پر لانا چاہتا تھا

نفیسہ سعید

اپنی یونیورسٹی کا کام ختم کرتی جو بھی تھا وہ پچھلے دو ماہ

میں ہی علیحدہ کے ساتھ رہ کر رہ رہی تھی کیونکہ علیحدہ کا تعلق پنجاب کے کسی چھوٹے سے شہر سے تھا۔

لہذا اُس کی عادتیں بھی ویسی ہی تھیں رات جلدی سونا، صبح سویرے اٹھنا، وہ کوئی مووی نہیں دیکھتی تھی اور نہ ہی بلا ضرورت کسی کے ساتھ لاہور شہر گھومنے جاتی یہ وہی وجہ تھی جو منابل کی دوستی اُس سے زیادہ ہوش کی دوسری لڑکیوں سے تھی جو اُس کی طرح زندگی جی کر اور انجوائے کرتے ہوئے جینا جانتی تھی۔

علیحدہ نے شروع شروع میں بہت کوشش کی کہ منابل کو بھی اپنے ساتھ نماز کا عادی بنائے مگر وہ بات ہے کہ پرانی عادتیں بدلنے میں زندگی گزر جاتی ہے لہذا چند ہی دنوں میں علیحدہ کو اندازہ ہو گیا کہ منابل کے سلسلے میں کی جانے والی اُس کی یہ کوشش بے کار ہے اس لیے وہ خاموشی سے سائیڈ پر ہو گیا شاید وہ سمجھ چکی تھی کہ ہر انسان اپنی زندگی کے ماحول کے مطابق جیتا ہے۔

کمرے میں پچھلی زیرو پاؤر کے بلب کی ہلکی سی روشنی نے منابل کی نیند خراب کر دی کیونکہ وہ بچپن سے ہی اپنے کمرے میں مکمل اندھیرا کر کے سونے کی عادی تھی لیکن جب لاہور کے ایک انٹرنیشنل تعلیمی ادارے میں حصول علم کے شوق نے اُسے ہوشل کے اس کمرے میں لا بٹھا تو اسے اندازہ ہوا اپنی بچپن کی عادتیں ختم کرنا کتنا مشکل عمل ہے نیز جو آرام و سکون کی زندگی آپ کو اپنے گھر میں حاصل ہوتی ہے اُسے تیاگ کر جینا بھی شاید نفس جہاد ہے۔

کیونکہ پچھلے دو ماہ سے وہ جو کچھ یہاں براشت کر رہی تھی عام زندگی میں منابل جیسی لڑکی سے اُس کی امید رکھنا قطعی ناممکن تھا ابھی صبح سویرے نیند خراب ہو جانے پر بنا کچھ کہہ اُس نے خاموشی سے اپنی چادر منہ تک اوڑھ لی اور اُس کی روم میٹ علیحدہ صبح سویرے اٹھ کر نماز کے بعد تلاوت قرآن کی عادی تھی یہ وہی وجہ تھی کہ وہ رات بھی جلد سو جایا کرتی جبکہ منابل جو کہ شروع سے ہی دیر تک جاگنے کی عادی تھی یہاں بھی تنہا بیٹھی کبھی کوئی مووی دیکھ لیتی یا

اور اسی نئے ماحول کو اپنانے میں ابھی منابل کو کچھ وقت لگے گا۔

☆.....☆.....☆

سمسٹر کے بعد ہونے والی ایک ہفتے کی چھٹیوں نے ہاشل کو بھی تقریباً خالی کر دیا وہ لڑکیاں جولاہور کے قریبی شہروں سے تعلق رکھتی تھیں اپنے گھروں کو سدھار دیں گی جبکہ منابل کے والدین ان دنوں لندن اُس کے بڑے بھائی کے پاس گئے ہوئے لہذا مجبوراً اُسے یہ ہفتہ ہوشل میں ہی گزارنا تھا کیونکہ اُس کا لاہور میں کوئی ایسا قریبی عزیز بھی نہ تھا جہاں جا کر وہ اپنا ایک ہفتہ گزار سکتی جبکہ اکثر لڑکیاں لاہور اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلی گئی تھیں۔

منابل کی طرح کچھ ایسی لڑکیاں جن کا تعلق دوسرے ممالک سے تھا وہ بھی ہوشل میں ہی موجود تھیں اور وہ بھی منابل کی طرح شروع سے ہی تنہائی

کی عادی تھیں کیونکہ گھر میں وہ اور ماما ہوتیں اور دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف اُس لیے ہوشل کے خالی ہونے سے اُسے کوئی خاص فرق نہ پڑا البتہ خوشی ہوئی کہ کچھ دن علیحدہ کے بغیر وہ کمرے میں آزادی سے گزار سکے گی اسی لیے رات اُس نے کچھ ڈراؤنی فلمیں اپنی پوائس بی میں ڈالیں تاکہ کمرے میں موجود بیوی پر دیکھ سکے اور نہ علیحدہ کی وجہ سے وہ بیوی بھی آٹھ بجے بند کر کے مووی پر اپنے لیپ ٹاپ پر دیکھتی جس کا اُسے ذرا مزہ نہیں آتا۔

اسی خوشی میں اُس نے جلدی جلدی کافی بنا کر اپنے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور ایک ڈراؤنی فلم لگا کر بیڈ پر آ بیٹھی اُس نے بستر پر بیٹھنے سے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ اچھی طرح لاک کر لیا تاکہ کسی دوسرے کمرے میں موجود لڑکی اسے یہاں آ کر بلا وجہ ڈسٹرب نہ کرے وہ ہمیشہ ایسی فلمیں بڑی یکسوئی سے



دیکھنے کی عادی تھی۔ اسی لیے ٹی وی کی آواز تھوڑی تیز کر کے اُس نے اپنا تکیہ سیدھا کیا اور بیڈ کے پیچھے لگا دیا پھر اطمینان سے ٹیک لگاے ہوئے مودی کے مزے کے ساتھ ساتھ وہ کافی بھی انجوائے کرنے لگی۔ جب اچانک اُسے محسوس ہوا کمرے کا لاک کسی نے آہستہ سے گھمایا ہے منابل چونک اٹھی کیونکہ ٹی وی کی تیز آواز میں بھی اُسے لاک گھومنے کی واضح آواز سنائی دی تھی۔

اُس نے پلٹ کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا تو حیران رہ گئی۔ دروازہ تھوڑا سا نیم وا تھا جیسے کسی نے کھول کر اندر جھانکا ہو۔

”میں نے تو دروازہ لاک کیا تھا پھر یہ کیسے کھل گیا۔“

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تاکہ دیکھے دروازہ کیسے کھلا ہے اب ٹی وی کی آواز بند کر کے وہ جیسے ہی دروازے کی جانب بڑھی تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا یہ دیکھ کر کہ دروازہ نہ صرف بند ہے بلکہ لاک بھی لگا ہوا ہے۔ دو تین دفعہ اُس نے دروازے کی ٹاب کو گھما کر دیکھا دروازہ لاک ہی تھا ایک سکون بھرا سانس لیتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اُس دی۔

”واہ منابل بی بی اب یہ وقت بھی آنا تھا کہ ڈراؤنی فلمیں دیکھ کر تم ڈرنے لگو حد ہوگئی۔“ خود کو سرزنش کرتے جیسے ہی وہ واپس بیڈ کی جانب پلٹی ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ پورا کھل گیا بالکل ایسے جیسے کسی نے اُسے دکھا دیا ہو ساتھ ہی تیز ہوا کا جھونکا اس طرح کمرے میں داخل ہوا کہ ایک سیکنڈ میں منابل کے سارے وجود پر کچھ سی طاری ہوگئی زندگی میں پہلی دفعہ وہ اتنی خوف زدہ ہوئی کہ اُس کے قدم جیسے زمین میں جکڑ گئے وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتی تھی اور نہ ہی مارے خوف کے اُس کے حلق

سے کوئی آواز نکلی وہ اسی حالت میں ساکت کھڑی تھی۔

جب اُس کے کمرے میں جبہ داخل ہوئی وہ بھی منابل کی طرح ہوشل میں ہی تھی کیونکہ اس کی فیملی سعودیہ عرب میں رہتی تھی۔ منابل کو اس طرح اپنی جگہ جم کھڑا دیکھ کر وہ حیرت سے بولی۔

”کیا ہوا منابل سب ٹھیک تو ہے نا اور یہ کمرے کا دروازہ ایسے کیوں کھولا ہے تم تو دروازہ اور لائٹ بند کر کے سونے کی عادی ہو پھر..... سب خیریت تو ہے۔“ منابل کی خاموشی کو محسوس کر کے جبہ نے اُس کا کندھا ہلاتے ہوئے سوال کیا اور منابل جیسے چوک اٹھی اور خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

”پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے میں ابھی ابھی کوئی اور بھی تھا۔“

”وہم ہے تمہارا اور یہ ڈراؤنی فلمیں دیکھنا بند کرو ایسا نہ ہو رات اکیلے کمرے میں تمہیں کچھ ہو جائے۔“

جبہ نے آگے بڑھ کر اُس کے کمرے کا ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔

”میرا وہم نہیں تھا جبہ.....“ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اُس نے جبہ کی جانب دیکھا اور پھر سے بولی۔

”تمہیں پتہ ہے میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اچھی طرح لاک کیا تھا لیکن یہ دیکھو.....“

ایک بار پھر پلٹ کر اُس نے دروازے کی جانب دیکھا اور بولی۔

”نہ صرف لاک کھلا ہے بلکہ کسی نے پورا دروازہ بھی کھول دیا۔“ ساتھ ہی اُس نے پوری بات جبہ کو بتادی۔ جسے سن کر کچھ دیر تو وہ خاموش رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”شاید ٹاب گھماتے ہوئے تم نے خود لاک

کھول دیا ہو ویسے بھی باہر بارش ہو رہی ہے جس کے ساتھ کچھ دیر قبل تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ شاید اُسی سبب تمہارے کمرے کا دروازہ کھل گیا ہو بہر حال اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو میرے کمرے میں آ جاؤ کیونکہ میں تو یہاں بھی نہیں ڈری۔“

جبہ نہ صرف اُس سے سینئر تھی بلکہ پچھلے دو سالوں سے اس ہوشل میں قیام پذیر تھی۔

”نہیں اُس اوکے یار ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو شاید فلم کی وجہ سے میں ڈر گئی تھی۔“

اپنا کمرہ چھوڑ کر جبہ کے ساتھ جانا اُسے اچھا نہیں لگا اس لیے فوراً انکار میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔

”چلو میں جاری ہوں تم اپنا دروازہ اچھی طرح لاک کرو۔“ منابل کو ہدایات دیتی جبہ واپس اپنے کمرے کی جانب چلی گئی ٹی وی اور کمرے کا دروازہ دونوں بند کر کے منابل اپنے بستر پر آ گئی پھر شاید وہ انہی طرح سوئی بھی نہ تھی کہ کمرے میں پھیلنے والی کسی آواز سے اچانک ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔

پہلے پہل تو منابل کو کچھ ہی نہ آیا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے پھر جیسے ہی وہ مکمل طور پر اپنے حواسوں میں واپس آئی تو یہ دیکھ کر گنگ ہوگئی کہ اُس کے کمرے میں موجود ٹی وی چل رہا ہے جس کی اسکرین پر سامنے ہی رات والی فلم موجود تھی وہ ایک دم خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھی دل چاہا بھاگ کر جبہ کے کمرے میں چلی جائے مگر ہمت نہ ہوئی کہ تنہا کمرے سے نکل کر کارڈیڈور کے آخری سرے پر موجود جبہ کے کمرے تک جائے یہ ہی سوچ کر اُس نے اپنے کپکپاتے قدموں کے ساتھ آگے بھگ کر سب سے پہلے کمرے کی لائٹ آن کی اور پھر ریموٹ کی مدد سے ٹی وی بند کیا اور یہ منابل کی زندگی میں آنے والا پہلا دن تھا جس جبہ اُس نے اپنے

بستر پر بیٹھ کر لرزتے ہوئے مسلسل دعا کی کہ جلدی سے اذان ہو جائے تاکہ فجر کی نماز کی ادائیگی کے لیے ہوسٹل میں کچھ چھل پھل ہو تو وہ بھی اُس کمرے سے نکل کر جبہ کے کمرے تک جا سکے۔

☆.....☆.....☆

انسان کی تخلیق میرے مالک نے کچھ اسی طرح کی ہے کہ وہ بہت جلد بھول جاتا ہے اور شاید یہ ہی اُس کے حق میں بہتر ہے ورنہ زندگی کی تلخیوں کے ساتھ جینا کس قدر مشکل ہوتا یہ وہ لوگ جان سکتے ہیں جو ان تلخیوں سے گزرتے ہیں، بھول جانے کی اس خصوصی صفت کے ساتھ منابل نے اگلا پورا دن بہت سکون سے گزارا وہ جبہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے قریبی مارکیٹ گئی پھر دونوں فوڈ اسٹریٹ گئیں جہاں پہنچ کر کتنی دیر تک وہ تاریخ کے جھروکوں میں گم وہاں کی حالیہ رنگینیوں سے لطف اندوز ہو کر جب رات گیارہ بجے واپس آئیں تو پورا ہوسٹل تاریک اندھیرے میں ڈوبا ایک بھوت بنگلہ دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ وہاں کے زیادہ تر کمرے لڑکیوں کی غیر حاضری کی بدولت خالی تھے۔

اس لیے اُن میں اندھیرا اچھا ہوا تھا۔ اکا دکا آباد کروں کی روشنیاں بھی گل جھیں شاید وہاں کے ککین یا تو سوچے تھے یا پھر ان ہی کی طرح کہیں باہر نکلے ہوئے تھے۔

گیٹ پر موجود مردہ سے زرد بلب کی روشنی میں چوکیدار نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا دونوں اندر داخل ہو گئیں چونکہ ان کے کمرے سیکنڈ فلور پر تھے اس لیے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہی سامنے والے پہلے کمرے کے دروازے پر جبہ ک گئی کیونکہ یہ اُس کا کمرہ تھا جبہ نے دروازے کے لاک میں چابی گھماتے ہوئے منابل کو مخاطب کیا۔

”میرا خیال ہے آج تم یہاں ہی سو جاؤ میرے کمرے میں۔“

”نہیں یار مجھے جگہ کی تبدیلی کے باعث نیند نہیں آتی۔“ منائل نے جواب دیا اور تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی جبکہ پیچھے کھڑی حبہ اُس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ اپنے کمرے کے دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل نہیں ہوئی۔ جب نے اُسے ہدایت کی تھی کہ جب اپنے کمرے میں داخل ہو تو آیت الکرسی کا ورد تین سے چار بار ضرور کر لے مگر یہ بھی اُس کی روٹین لائف کا حصہ نہ تھا اس لیے حسبِ عادت وہ بھول گئی اور اندر داخل ہو کر اُس نے اپنے کمرے کا لاک بند کیا کپڑے پہنچ کیے اور چونکہ وہ صبح سے تھکی ماندی واپس آئی تھی لہذا لائٹ آف کر کے فوراً ہی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

اور بہت جلد نیند کی وادیوں میں اتر گئی اور وہ گہری نیند کے زیرِ اثر ہی تھی جب اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی منائل نے ہنسنے کی بجائے اپنی مونڈھی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھا تو اسے احساس ہوا رات کے اس سے اُس کی آنکھ کھلنے کی وجہ کمرے میں جلنے والے زیرو پاور کے بلب کی مخصوص روشنی تھی جو ہمیشہ ہی اُس کی نیند ڈسرب کرنے کا باعث بنتی اُسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ یہ بلب رات اُس نے جلایا تھا کیونکہ وہ تو ہمیشہ سے مکمل اندھیرے میں سونے کی عادی تھی پھر یہ بلب کیسے جلا؟

یہ سوال ذہن میں آتے ہی اُس کی گہری نیند ایک سیکنڈ میں ہی اڑن چھو ہو گئی اُس نے لیٹے لیٹے ہی کروٹ بدل کر پورے کمرے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا ہاتھ روم کا دروازہ اور لائٹ بھی آن ہے جس سے یہ اندازہ لگا مشکل نہ تھا کہ ہاتھ روم میں کوئی ہے جبکہ کمرے کی چابی اُس کے علاوہ صرف علشہ کے ساتھ تھی تو کیا علشہ واپس آ گئی ہے یہ خیال دماغ

میں آتے ہی وہ قدرے مطمئن ہو گئی اور بھول گئی کہ علشہ کے واپس آنے میں ابھی پورے دو دن باقی تھے وہ ان ہی سوچوں میں گہری تھی جب ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی منائل نے گہری نیند میں ڈوبے اپنے حواس برقرار رکھتے ہوئے دیکھا نماز کے مخصوص دوپٹے میں بلبس وہ یقیناً علشہ ہی تھی اور اس احساس کے ساتھ ہی علشہ واپس آ گئی ہے ایک اطمینان سا اُس کے دل میں اتر گیا تو آنکھوں تک چادر اوڑھ کر وہ دوبارہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆.....☆.....☆
صبح اتوار تھا اور وہ جانے کتنی دیر تک سوئی جب جب نے آ کر اُسے جگایا کیونکہ وہ منائل کے ساتھ ناشتہ کرنے کہیں باہر جانا چاہ رہی تھی۔
”اٹھ جاؤ یا کرنا سونا ہے بارہ بجتے والے ہیں۔“ اُس کی آواز سن کر منائل نے اپنی منڈھی ہوئی آنکھیں کھولیں۔

”اور یہ تم نے رات دروازہ لاک نہیں کیا تھا؟“ منائل کو جاگتا دیکھ کر جب نے فوراً سوال کیا۔
”دروازہ کھلا.....“ منائل چونکی پھر جیسے اچانک اُسے کچھ یاد آ گیا تو اپنے بال سینٹے ہوئے بولی۔
”میں نے تو لاک کیا تھا لیکن رات چونکہ علشہ واپس آئی ہے تو شاید اُس نے کھلا چھوڑ دیا ہو۔“
”علشہ.....“ منائل کی بات سن کر جب نے پورے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور دوبارہ لیا۔
”علشہ نے تو سنڈے کو واپس آنا ہے تم شاید بھول گئی ہو۔“

”ہاں لیکن وہ رات یہاں تھی میں نے اُسے خود دیکھا تھا نماز پڑھتے ہوئے اور زیرو پاور کا بلب بھی اُسی نے آن کیا تھا۔“ جب نے دیکھا کمرے میں نیلے بلب کی مدد روشنی ابھی بھی پھیلی ہوئی تھی۔
”مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی وہم ہوا ہے کیونکہ علشہ

ابھی نہیں آئی اور اب تم اٹھ کر جلدی سے ریڈی ہو جاؤ تو آج اتار کھلی ناشتہ کرنے چلتے ہیں۔“ اپنی بات ختم کر کے جب دروازے کی سمت بڑھی تھی کہ اُسے منائل نے آواز دے کر روک لیا۔

”مجھے وہم نہیں ہوا رات اس کمرے میں میں نے اُسے خود دیکھا تھا وہ دیکھو سامنے کرسی پر جائے نماز بھی رکھی ہے جبکہ میں صبح صبح اٹھ کر نماز نہیں پڑھتی۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے وہ دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہو گئی جب نے پلٹ کر اُسے دیکھا منائل کے چہرے پر چھائی اُجھڑن اور پریشانی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ سچ کہہ رہی ہے اور پھر اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور بولی۔

”ایسا کرو تم میرے کمرے میں آؤ ہم دونوں مل کر وارڈن کے پاس جاتے ہیں تاکہ انہیں بتایا جائے کہ رات کوئی تمہیں تنگ کر رہا ہے اور یقیناً اس کمرے کی ایک تیسری چابی بھی ہوگی جو اس ہاسٹل کی وارڈن یعنی انٹی صفیہ کے پاس ہونی چاہیے۔“
”اوہ.....“ منائل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مجھے جان بوجھ کر تنگ کر رہا ہے۔“
جب کی بات سمجھتے ہوئے وہ جلدی سے بولی۔

”ہاں.....“ جب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے منائل کی جانب دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے اس ہاسٹل میں موجود کوئی لڑکی یا ملازمہ تمہیں ستا رہی ہے جس کا مقصد تمہیں خوفزدہ کر کے انجوائے کرنا ہے۔“
”تو پھر ٹھیک ہے اگر ایسا ہے تو ہمیں انٹی صفیہ سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آج رات تم میرے کمرے میں سو جاؤ تو ہم دونوں مل کر اُس کو پکڑے ہیں جو یہ فضول کرتی کر رہا ہے۔“
”میرا خیال ہے کہ میں اپنے کمرے میں ہی

رہوں تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ تم محتاط ہو گئی ہو البتہ جب تم اپنے کمرے میں کوئی غیر ضروری بات محسوس کرو تو موبائل سے مجھے مس کال دے دینا میں فوراً پہنچ جاؤں گی اور پھر مل کر ہم دونوں اُس چیز کو انٹی صفیہ کے پاس لے جائیں گے۔“ جب ہنستے ہوئے بولی اور یہ فیصلہ ہی شاید اُن دونوں کی ایک بہت بڑی غلطی تھا جس کا احساس اُس رات اُن دونوں کو بہت شدت سے ہوا۔

☆.....☆.....☆
آج رات منائل بہت مطمئن تھی سب سے پہلے اُس نے اچھی طرح دروازہ لاک کیا اور پھر ٹی وی پر اپنی پسندیدہ ڈراما کی فلم لگائی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اُسے احساس ہوا کہ آج سووی اسے پہلے جیسا مزہ نہیں دے رہی شاید ایک ہی فلم کو بار بار دیکھنے سے اُس میں دلچسپی کا عنصر یکسر غائب ہو گیا تھا یہ ہی سوچتے ہوئے منائل نے اپنے قریب رکھے ریسیٹ کی مدد سے ٹی وی آف کر دیا اور لائٹ بند کر کے سونے لیٹ گئی اور چونکہ اس سے وہ پچھلے کئی دنوں کی ٹینشن سے آزاد ہو چکی تھی۔ اس لیے جلد ہی بے فکر ہو کر نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔ جب اچانک کسی نے اُس کے پاؤں کے انگوٹھے کو پکڑ کر زور سے ہلایا۔

یکدم ہی منائل کی آنکھ کھل گئی اس نے دیکھا کمرے میں پھیلی تاریکی میں کوئی بھی نہ تھا کہ وہ بالکل خالی پڑا تھا چونکہ ابھی بھی وہ نیند ہی کے زیرِ اثر تھا لہذا چاہا کہ آنکھیں بند کر کے دوبارہ سو جائے جب اچانک اُس کے حواس بحال ہو گئے اُسے محسوس ہوا کمرے میں کسی کے سانس لینے کی آواز آرہی ہے ایک تو کمرے میں پھیلی گہری تاریکی اور اُس پر سانس لینے کی زوردار آواز منائل بری طرح گھبرا گئی اور جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

”کون ہے یہاں.....“ حلق کے بل چلاتے ہوئے وہ بھول گئی کہ اسے جبہ کو کس کال دینا ہے اس بل تو اسے اپنی سانس بھی سینے میں کھپتی محسوس ہو رہی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بیڈ سے نیچے نہ اتر پارہی تھی اور یہ ہی وہ وقت تھا جب اُس نے اندھیرے میں اُسے اپنے سامنے کھڑے دیکھا مین اُس کے سامنے بیڈ کے پائنتی کی جانب اپنے بال کھولے کھڑی اجنبی لڑکی یقیناً علشہ نہ تھی۔ سفید کپڑوں میں بالکل خاموش کھڑی وہ اُسے گھور رہی تھی منابل نے چاہا بیڈ سے چھلانگ لگا کر دروازے کی سمت بھاگ جائے مگر اُس کا وجود جیسے کسی نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا یہ ہی وجہ تھی جو اُس کے جسم نے ہلنے جلنے سے قطعی انکار کر دیا منابل کو اپنی موت اپنے بالکل سامنے کھڑی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

جب کسی سے ٹکرا کر منہ کے بل زمین پر آن پڑی اور اندھیرے میں اُس کا سوا بل بھی اُس کے ہاتھ سے گر کر جانے کہاں گم ہو گیا۔ اُس نے بشکل گردن اٹھا کر دیکھا سامنے کوئی بھی نہ تھا جبکہ ایک سینڈ پہلے وہ کسی سخت وجود سے ٹکرا کر زمین پر آن پڑی تھی۔

اُسی دم اُس کے کمرے میں موجود زبرد پاور کا بلب جل اٹھا۔ ساتھ ہی ٹی وی کی اسکرین بھی آن ہو گئی جس پر چلنے والی مووی کی آواز خود بخود تیز ہو گئی کہ مناہل کو اپنے کان کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے اُس کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے خوف سے اُس کا پورا وجود لرز رہا تھا اُسے کوئی ایسی دعا یاد نہ تھی جو وہ اس لمحے پڑھ سکتی جب یکدم ہی تاریکی میں گم ہونے والی وہ لڑکی اچانک اُس کے سامنے ایک بار پھر سے کچھ اس طرح نمودار ہوئی کہ باوجود کشش کے مناہل اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔

البتہ کمرے میں پھیلی خنکی میں قدرے اضافہ ہو گیا اور کچھ روشنی نے بھی اُسے ہمت دی اور اپنے وجود کو بمشکل گھنٹے ہوئے اُس نے اٹھنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس لڑکی کا چہرہ دیکھ سکے جو بالوں میں چھپا ہوا تھا اور یہی منال کی بہت بڑی غلطی تھی کہ جیسے ہی اُس نے بالوں کے اندر چھپا چہرہ دیکھنا چاہا تو اسے احساس ہوا کہ اُس لڑکی کے پاس کوئی چہرہ نہ تھا بلکہ سر پر صرف بال ہی بال تھے جو اس قدر خوفناک لگ رہے تھے کہ بے ساختہ ہی منال کے حلق سے تیز چیخ برآمد ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی زمین پر دوبارہ گر کے بے ہوش ہوتے ہوئے قریبی مسجد سے ابھرنے والی اذان فجر کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”حی الفلاح..... آؤ بھلائی کی جانب.....“
اور پھر اُسے کچھ یاد نہ رہا اُسے لگا وہ شاید مر گئی ہے
کیونکہ اُس کا وجود آہستہ آہستہ بالکل بے جان ہو گیا

تھا۔

☆.....☆.....☆
اس کے سواکت پڑے وجود میں ہلکی سی جنبش
محسوس کرتے ہی ملائکہ کے تن مردہ میں گویا جان
پڑ گئی آج جانے کتنے دنوں بعد انہیں احساس ہوا کہ
منابل زندہ ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی مارے
خوشی ایک ہلکی سی جھج اُن کے حلق سے برآمد ہوئی اور
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر منابل کے سر ہانے آن کھڑی
ہوئیں۔
”پانی.....“ منابل نے سوکھے لبوں پر زبان
پھیرتے ہوئے کہا۔

اور پھر نرس کی مدد سے ملائکہ نے فطرہ قطرہ بانی
 اُس کے حلق میں اتارا وہ جو اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی
 سے تقریباً پانسو ہونچکی تھی آج ایک بار پھر سے اللہ
 کی عطا کی قابل ہوگئی بے شک وہ جسے چاہے زندگی
 دے اور جس سے چاہے اپنی دی ہوئی یہ امانت
 واپس لے لے وہ قادر ہے اور یہ احساس کچھلے پندرہ
 دنوں میں ملائکہ کو کئی بار ہوا اور یہ شاید اُس کی چالیس
 سالہ زندگی کے واحد پندرہ دن تھے جن میں اُس نے
 خدا کو بے شمار دفعہ پکارا اور یاد کیا۔

کئی سالوں بعد نماز بھی پڑھی اور رو کر اپنے رب کے حضور بیٹی کی زندگی کے لیے دعا بھی کی جو شاید بارگاہ الہی میں قبول ہوئی تھی ورنہ ڈاکٹر نے تو اسے یہ کہہ کر بالکل مایوس کر دیا تھا کہ کسی انجانے خوف نے منابل کے دماغ کو مفلوج کر دیا ہے اور شاید اب وہ کبھی کوما کی کیفیت سے باہر نہ نکلے گی۔

اس حالت میں زندہ اُسے کئی سال بھی لگ سکتے ہیں اور کچھ ماہ بھی اور یہ واحد اللہ کی ذات تھی جس نے محض چند دنوں میں منامثال کو واپس زندگی کی طرف لوٹا دیا اور ارج جب جہ اور علہ کے ساتھ صفیہ آنٹی اس سے ملنے آئیں تو منامثال کو پتہ چلا اِن دن اُس

کی چیخ کی آواز سن کر جب جبہ بھاگی ہوئی اُس کے روم میں آئی تھی تو وہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی جبکہ اُس کے کمرے کا دروازہ چوہے کھلا ہوا تھا مانی دی چل رہا تھا اور کمرے میں پھیلی خنکی باہر کے ماحول سے بالکل مختلف تھی ایسے میں تیز آواز سے آیت لکری پڑی جب نیچے دوڑی اور پھر آئی صفیہ کی مدد سے اُسے ہسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ پورے پندرہ دن بعد ہوش میں آئی اور یہ پندرہ دن اُس کی ممانے جیسے کسی سولی پر لٹک کر گزارے لیکن ہوش میں آنے کے بعد اُسے اپنی ماقدرے بدلی ہوئی محسوس ہوئیں اور پہلے دن ہی اپنے سر ہانسنے موجود ماں کی تلاوت قرآن پاک سن کر اُسے بہت سکون محسوس ہوا تھا اور آج صفیہ آنٹی کی زبانی وہ یہ سن کر حیران رہ گئی کہ ہوش کے جس کمرے میں وہ رہائش پذیر تھی وہاں کچھ سال قبل رہنے والی ایک لڑکی نے خودکشی کی تھی۔ جس کی وجوہات تو آج تک کسی کو معلوم نہ ہو سکیں البتہ وہاں میٹیم لڑکیاں اکثر ڈر جایا کرتیں جبکہ پچھلے دو سالوں سے علشہ اُس کمرے میں رہائش پذیر تھی اور اس دوران وہ کبھی نہ ڈری اور نہ ہی خوف زدہ ہوئی جبکہ اُس کے کمرے سے جاتے ہی منابل اُس خوف کے شےبے میں اس بری طرح بھنسی کہ ہسپتال آن پہنچی اور پھر واپس جاتے جاتے صفیہ آنٹی کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اور وہ بولیں۔

”ارے ہاں اُس لڑکی کا نام بھی منابل ہی تھا جس نے اُس کمرے میں خودکشی کی تھی۔“

جو بھی تھا اس حادثے نے منابل کی فیملی کو مکمل طور پر تہہ بل کر دیا اور جب بالکل صحت یاب منابل واپس ہوش پہنچی تو فجر کے وقت چلنے والے زیر و پاور کے بلب نے اُسے ڈسٹرب نہ کیا کیونکہ وہ بھی اب نماز و شگاندہ کی باندہ ہو چکی تھی۔

ناقابل شناخت

ہر بچے کی کلائی میں ایک بریسلٹ تھا اب اسے فقط اس بچے کو تلاش کرنا تھا جس کے بریسلٹ پر بن نوڑ لکھا ہو۔ کچھ ایسا ہی سوچتا وہ قدرے مضطرب اس نے قریب ترین پالنے میں چھوٹے سے ننھے اور گداز ہاتھ کو اٹھا کر، بریسلٹ پر لکھے اعداد اور حروف کو.....

نجیب عمر

ایلیٹ بنڈر نے اپنے ہاتھ میں تھا مے مضبوط دسے اور طوطے کی چوچ نما نوکیلے خنجر کے تیز دھار کو دوسرے ہاتھ سے جانتے خود کو سپلائی روم کے تاریک گوشے میں سالیا۔

باہر مین کوریڈور میں، اسپتال میں ابھرنے والی آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔ پکارنے والے لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں، اسٹرپچر کے پیہوں کی آوازیں۔ میڈیکل اسٹوڈنٹ اور نرسوں کے دبے دبے قہقہے اور سپلائی روم کے دروازے کے قریب کسی کے قدموں کی چاپ۔

جلدی جلدی میں زیب تن کیے، اسپتال کے کارندوں کے عام لباس میں، بنڈر اس وقت بڑے اسپتال کے ایک سرجن کے روپ میں، میڈیالائزیشن آپریشن کیپ اس کے سر پر اور اس سے بچ کرنا ہوا اور لوہے جس نے اس کے کپڑوں کو مکمل طریقے سے چھپا لیا تھا۔ سرجن کے منہ اور ناک کو چھپانے والے ماسک نے اس کے سخت

اور حقیقتاً وہ ایک ہارڈ ویئر کلرک تھا۔

اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے اس کا ذہن ماضی میں..... منسلک ہونے والے واقعات کی جانب چل پڑا جنہوں نے اسے آج یہاں اس ماحول میں ایک ذہنی کرب کی حالت میں پہنچا دیا تھا۔ جس کی ابتدا بنفورڈ ہارڈ ویئر سے ہوئی تھی۔

جہاں اس نے تقریباً بیس برس خدمات انجام دی تھیں۔ بیس سال سے یہ اسٹور لیو جے بنفورڈ کی ملکیت تھا۔ ایک ہمدرد بوڑھا، شریف آدمی جو ایک دیانت دار ملازم اور اس کی وفاداری کو سمجھتا اور اس کی قدر کرتا تھا۔ ایلیٹ اپنے بوڑھے مالک کے سامنے اس کے ابتدائی دنوں سے کام کیا تھا اور مالک کو روزانہ کی بنیاد پر اطمینان بخش کارکردگی کی

رپورٹ پیش کیا کرتا تھا۔ دن خوش اسلوبی سے گزرتے گئے۔ دس سال بعد ایلیٹ کو بنفورڈ ہارڈ ویئر کا فیصلہ بنا دیا گیا۔ اچھی تنخواہ۔ مالک اپنے بنگلو پر ہر ماہ باقاعدگی سے ادا کیا کرتا۔ سینئر بنفورڈ اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ حتیٰ کہ مالک نے اسے قرض بھی دیا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے سے مکان کی ادائیگی کر سکے۔ ایلیٹ بنڈر ایک قانع اور خوش خرم رہنے والا شخص تھا۔

یہ سب کچھ یوں ہی چلتا رہا کہ مالک کے بیٹے لیو جے بنفورڈ جو نیئر نے اسکول کے بعد اور ہفتے والے دن اسٹور آنا شروع کیا تاکہ اسے کاروبار کی سوجھ بوجھ ہو سکے۔ ابھی وہ نوخیز تھا لیکن اپنی شخصیت میں سختی کا پہلو نمایاں رکھتا تھا۔ اس کی



آنکھوں میں حاسدانہ چمک صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ وہ ایک گدھ کی مانند تھا جو مردے پر بچھنے کے لیے اس کی آخری سانپوں کے پورے ہونے کا منتظر ہوتا ہے اور بار بار پلٹنے کے لیے تیار۔ ایلینٹ اچھی طرح سے جان چکا تھا کہ وہ مالک کے بیٹے پر ہرگز بھروسہ نہیں کر سکتا۔

وقت گزرتا رہا۔ لیو جو نیر گریبوں میں کالج سے گھر کے بجائے سیدھے ہارڈ ویئر اسٹور آنے لگا۔ وہ اسٹور کے تمام ملازمین کے لیے پریشانی اور اشتعال میں اضافے کا سبب بننے لگا۔ خصوصاً ایلینٹ ہنڈر کے لیے خواہ اس کا رویہ مالک کے بیٹے کے ساتھ کیسا ہی مصلحانہ اور خوش کن ہو۔ اس کی فطرت کی کچی میں اصلاح کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا اور جو نیر کا رویہ اس کے ساتھ تضحیک آمیز ہوتا اس کے مشوروں کو خاطر میں نہیں لاتا اور روزمرہ کے کاموں میں اس کی ہر درخواست کو رد کرتا۔

لیکن ایلینٹ ایک صابر شخص تھا اور اسے امید تھی کہ ابھی اس کی کسبی، سخت مزاجی کا سبب ہے اور اپنی اہمیت جتانے کا شوگر بھی ہے لیکن مزید سوچ بوجھ کی صلاحیت جلد اسے ایک معتدل اور مصالحت پسند شخص میں بدل دے گی۔ اسی بنا پر اس نے اسٹور کے مالک اور اس کے والد سے بات کرنا مناسب نہیں جانا اور ان مسائل کا ذکر کرنا جو اس کے بیٹے کی وجہ سے اسے برداشت کرنا پڑتا ہے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ والد یعنی مالک سے کچھ بولے یا نہیں لیکن وہ خاموش ہی رہا اور حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ نتیجتاً ایلینٹ اور لیو جو نیر کے درمیان نفرت بڑھتی گئی اور دوسرے ملازموں پر بھی آشکار ہوتی گئی لیکن بد قسمتی سے ہنڈر ڈسینٹر ان بگڑتے حالات

سے بے خبر رہے جو اپنا زیادہ تر وقت گرین ہاؤس میں گزارتے اور کاروبار میں کم سے کم۔

حقیقت میں صرف ایک امید نے ایلینٹ کو ہوشمند بنائے رکھا کہ مالک کئی مرتبہ اظہار کر چکا تھا کہ وہ قریبی ٹاؤن میں اپنے اسٹور کی ایک برانچ کھولنے کا خواہش مند ہے اور ایلینٹ کو اپنا شریک کاروبار بنانا چاہتا ہے۔ ظاہر تھا کہ یہ شراکت بیٹے کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ بوڑھے نے اسے بتایا کہ اس کا وکیل تمام کاغذات تیار کر رہا ہے تاکہ قانونی تقاضے پورے کر کے اسے باقاعدہ پارٹنر بنایا جائے اور یہ کام وکیل کے ہاں اس سے واپسی کے فوراً بعد کر لیا جائے گا۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے لیو جو نیر نے کالج سے گریجویشن کیا۔ اس کی شادی ہوئی اور وہ اپنی حاملہ بیوی کے ساتھ دیکھا جانے لگا جو ہنڈر کی آئندہ نسل کو اپنے رحم میں سنبھالے ہوئی تھی۔ ایلینٹ کو امید ہو چلی تھی کہ اس نئی ذمہ داری اور شراکت کے عمل کے بعد لیو جو نیر کے ساتھ اس کے تعلقات میں موجود تناؤ کا خاتمہ ہو جائے گا۔

لیکن ایک خوش آئند خیال سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اسی ہفتے کے اختتام پر جب ایلینٹ نے اپنی بیوی کو بڑے ہنڈر کے شراکت داری کے منصوبے کے متعلق بتایا اسے بڑے ہنڈر کی پیگم کی جانب سے ایک کال موصول ہوئی۔ وہ قطعی ہسٹریائی انداز میں اسے بتا رہی تھی کہ ایک گھنٹہ قبل کار کے حادثے میں ان کے شو ہمارے گئے ہیں۔

ایلینٹ سکتے کی کیفیت میں تھا۔ یہ حادثہ اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے اس کے والد کی جان گئی ہو۔ اس نقصان کے دکھ کے احساس نے اس کے پورے

وجود کو جکڑ لیا تھا۔ وہ صرف اس قدر سوچنے کے قابل تھا کہ اب وہ اس مہربان اور مشفق بوڑھے کو دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا اس بے وقت اور اس کے تقدیر سے روٹنے والی اس موت کے کیا عواقب ہوں گے۔ اس کے متعلق وہ سوچ نہیں پا رہا تھا۔

ایلینٹ نے تدفین تک اسٹور کو بند رکھا۔ اس دوران وہ مالک کے بیٹے سے رابطے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے تدفین کے دوران لیو جو نیر کو دیکھا جو اسے بری طرح نظر انداز کرتا رہا۔

لیکن جس دن کاروبار کا آغاز ہوا وہ نو جوان ایلینٹ سے بات کرنے کا حریص نظر آیا۔ ایلینٹ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی جب اس نے جو نیر کو اپنے ڈیسک کی پشت پر بیٹھے اس فیصلے کی صبح کو دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایلینٹ کو بھی خوش گمانی نہیں تھی اور اس کے خدو خال سے بھی کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن لیو جو نیر نے اسے مزید حیرت میں ڈال دیا۔ جسے اس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

”صبح بخیر مجھے تمہارا انتظار تھا۔“ بیٹے نے کہا۔

”کیا واقعی؟“

”جی ہاں تمہارے لیے میرے پاس کچھ بری خبریں ہیں“ نو جوان بیٹا تضحیک آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ وہ اس خوشی کو چھپا نہیں سکا جو اس لمحے اس پر طاری تھی۔

”کس قسم کی بری خبریں؟“ ایلینٹ نے استفسار کیا۔

”مکمل بدترین۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے گلابی دن پورے ہو گئے۔ تم اپنی ساری زندگی یہاں سے فوری سمیٹ لو۔ سب کچھ ختم۔ میں تمہارا چہرہ اس اطراف میں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا۔“



نازیہ بتول رضا کی شاعری کی کتاب
’میری تکمیل تم سے ہے‘ شائع ہو گئی ہے۔

قیمت = 200/-

”کیا؟“ اس کی آواز میں بے یقینی، دکھ اور تمام درد سمٹ آیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہونے والا ہے۔“

”آپ مجھے درخواست کر رہے ہیں۔ آپ مجھے یہاں سے نکال رہے ہیں۔“

”ارے ہاں، واقعی۔“

لیو جوئیر اس موقع پر مسکرایا۔

غالباً یہ وہ مسکراہٹ تھی، وہ اظہار یہ تھا جو اس بیٹے نے پیش کیا۔ یا وہ برسوں کی ناراضگی اور نفرت اور حقارت بھی جو اب پر ہلبلوں کی صورت ظاہر ہوئے۔ ایلین یقین سے اس بارے میں نہیں جانتا تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ اب وہ اپنا انتقام اس نطفہ ناقصیت سے ضرور لے گا جو اس کے سامنے بیٹھا، ہلبوں پر طنز پر مسکراہٹ سجائے دانتوں کی نمائش کر رہا ہے۔ اس لمحے اس شخص سے اسے جتنی نفرت تھی۔ اتنی اس نے ساری زندگی میں کسی سے نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے لیے اب ایک بڑی آزمائش کی ابتدا تھی۔

ایلین نے ہنفرڈ کے حوالے سے جہاں کہیں بھی ملازمت کی درخواست دی اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک ہمدرد آج نے اسے رضا کارانہ طور پر بتایا کہ اسے لیو جوئیر کی جانب سے اس کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں جس سے ظاہر تھا کہ لیو جوئیر نہ صرف اسے نوکری سے درخواست کر کے، بے عزت کر کے مطمئن نہیں ہوا بلکہ اسے مکمل تباہ کرنے کا عزم کیے ہوئے تھا۔

ایلین ایک لکڑی کے کندے کاٹنے کے کارخانے میں ماضی کے مقابلے میں نصف مشاہرے پر کام کرنے لگا۔ وہ ہتدرتج بے شمار بلبوں اور ادائیگیوں کے نوٹس کے تحت دہتا چلا گیا اس پر معاشی دباؤ بڑھتا گیا۔ سب سے پہلے اسے

اپنے بیٹے کو پرائیویٹ اسکول سے نکالنا پڑا۔ دوسرے مرحلے میں اسے اپنے مکان کے عوض قرض لینا پڑا۔ گاڑی بک گئی۔ فون منقطع ہو گیا۔ اس کی بیوی بری طرح بیمار ہو گئی۔ بالآخر اس کی ناکامی پر چراغ پار بننے لگی کہ وہ گھر کے اخراجات مناسب طریقے سے پورا کرنے کا اہل نہیں رہا۔ معاشی خلیج اس پر شدید تر ہوتا گیا۔ اسے لگا کہ وہ حواس کھو دے گا اگر اس نے دل کی بھڑاس نکالنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔

وہ تو جہنم رسید ہو رہا تھا کیوں نہ کسی اور کو بھی اپنے ساتھ لیتا جائے۔

اسے انتقام لینا ہو گا لیو جوئیر کو اپنی نا انصافی کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ اور اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا جیسا کسی نے آج تک نہیں بھگتا ہو گا۔ اس طرح ایلین ایک متشدد گرداب میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ یہ اس کے روحانی اضطراب اور ذہنی تناؤ کی بنا پر تھا اور اسے یہ بھی احساس ہو چکا تھا کہ اب وہ اس گرداب سے کبھی باہر نہیں آ سکے گا۔

نکلے جوڑ جوڑ کر تصویر مکمل کرنے والے کھیل میں آخری کلزا جو اس کے ہاتھ میں رہ گیا تھا وہ عملی قدم تھا جسے اٹھا کر وہ پاگل پن کی اس تصویر کو مکمل کر سکتا تھا۔ یہ بات اس کے ذہن میں خود آ گئی جب اس کی بیوی نے بتایا کہ ایک روز قبل لیو جوئیر کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ خاموش قوت ارادی سے ایلین اپنے تہہ خانے میں گیا اور ایک خاص آلے کا انتخاب کیا۔ طوطے کی چونچ کی طرح نوکدار مضبوط دستانے والا خنجر جو ہنفرڈ ہارڈ ویئر ہی کا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا یہ خالص لوہے کا ہے، اپنا کام نہایت صفائی سے کرے گا۔

وہ گاڑی لے کر شہر کے مضافات میں موجود

ہسپتال تک پہنچ گیا۔

لنٹ کے ذریعے میٹرنی وارڈ تک آیا۔ ہال کی جانب لپکتے ہوئے قدموں سے، جیسے ایک باپ نومولود کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین۔ ایک لمحے کو رک کر اس نے اندازہ لگا لیا۔ وہ کسی کی توجہ کا مرکز نہیں تھا۔ وہ چلتا ہوا سپلائی روم کے دروازے تک آیا۔ چپکے سے اندر داخل ہو گیا۔ جلدی جلدی اس نے الماری سے لینن اور گون کا انتخاب کیا۔ وہ چیزی سے اپنا حلیہ بدل چکا تھا۔

”اب وقت آ گیا ہے۔“

اس چھوٹے سے ڈارک روم کے باہر چہل پہل میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایلین تیزی سے اٹھا۔ خنجر کو سرجن کے کون کے اندر چھپا کر۔ اس نے دروازہ کھولا اور خاموشی سے، چپتے پھرتے سفید لباس میں ملبوس نرسوں اور دوسرے کارندوں میں گوریڈروں میں شامل ہو گیا۔

ہاں یہ مناسب ترین وقت ہے۔

وہ ہال سے گزرتا گیا۔ اس کے اطراف زچاؤں کے کمرے تھے اور آگے نشیے کی کھڑکیوں سے مزین نرسری تھی۔ اس کا دل اس کے سینے میں جبکہ ہمیر کی طرح آواز نکال رہا تھا۔ لیکن یہ کسی خوف کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی فتح کے قریب پہنچنے کی سرشاری کی بنا پر۔ مجھے کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ یہ خیال، آگہی کا تیش اسے پراعتماد بنا کر کامیابی کی منزل کی جانب لے جا رہا تھا۔

اپنے مقصد کو پانے کے لیے، لمبے ڈگ بھرتا، اعتماد کے ساتھ اس نے نرسری کے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ ڈیوٹی پر موجود ایک نرس ایک چھوٹے سے ڈیسک کی پشت پر بیٹھی، فیشن میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی۔

”ایک منٹ ڈاکٹر، کیا میں آپ کی مدد کر سکتی

ہوں۔“

اس نے اطمینان سے مڑتے ہوئے نرس کے جڑے پر ایک گھونسا سید کیا۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر نیچے ڈھیر ہو گئی۔ اس پر سے گزرتے وہ روشن روشن گرم کمرے میں تھا جہاں دو قطاروں میں چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے پالنے ترتیب وار رکھے تھے جس میں کم از کم بیس نومولود بچے تھے۔ ایلین جانتا تھا کہ اسے سب کچھ بہت جلد کرنا ہے۔ ہر بچے کی کلاکی میں ایک بریسٹ تھا اب اسے فقط اس بچے کو تلاش کرنا تھا جس کے بریسٹ پر بن فورڈ لکھا ہو۔ کچھ ایسا ہی سوچتا وہ قدرے مضطرب اس نے قریب ترین پالنے میں چھوٹے سے ننھے اور گداز ہاتھ کو اٹھا کر، بریسٹ پر لکھے اعداد اور حروف کو سمجھنے کی کوشش کی۔

”یا میرے خدایا۔ یہ کس قسم کا کوڑ ہے۔ نام تو لکھا نہیں۔“

اسے دروازے کے باہر کوئی تیز قدموں سے چلتا محسوس ہوا۔ وقت زیادہ نہیں تھا۔ مجھے جلد کچھ نہ کچھ کر لینا ہے۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں اور اپنا عکس نرسری کے شیشوں پر دیکھا اور شیشوں کے پرے اسٹاف کے کئی لوگوں کا سایہ متحرک نظر آیا جو اسے خوف سے دیکھ جا رہے تھے چونکہ وہ خنجر لیے ہوئے تھا۔ متزلزل ہونے کی ضرورت نہیں۔ سوچو، جلدی سوچو کیا کرنا ہے؟“

ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس نے سامنے پالوں پر نظر ڈالی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ یقینی کامیابی کا ایک ہی طریقہ ہے۔

اس نے سوچا۔ وہ جیسے ہی پالنے پر چکا اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

☆☆☆☆☆☆

کراچی سے ارسال کردہ انتہائی عجیب اور مزاحیہ تحریر

ڈاکے سے سیاست تک

ہم سب مختلف مقامات پر اتر جائیگے، میں ایک لمبا چکر کاٹ کر لوٹی ہوئی رقم کے ساتھ اپنے فلیٹ کی

طرف آؤں گا اور ساری رقم چھپا کر رکھ دوں گا۔ دو تین ماہ بعد سب جمع ہو گئے اور.....

کرن شیر

مجھے اس وقت کالے خان پر غصہ آ رہا تھا، بہت

شدید غصہ! کم بخت نے نہ جانے کس قسم کا ناکارہ لوگ میرے پاس لا کر میرے پاس جمع کر دیے تھے۔ ان میں سے ایک فضل دین تھا، جس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کی بیٹائی بھی کمزور معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہی ہو گیا تھا جب میں نے مصافحہ کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ اپنا ہاتھ دوسری طرف کر کے زور زور سے ہلا ہلا کر ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی“ بولتا جا رہا تھا۔ میں کالے خان کا ہاتھ تھام کر اسے ایک طرف لے آیا۔

”سبے وقوف! یہ تم کس کو لے کر آ گئے ہو؟ یہ بندہ میرے کس کام کا؟“

”ہاں یہ بہت زبردست ڈائیور ہے۔“ کالے خان نے بتایا۔ ”آندھی طوفان کی رفتار سے گاڑی چلاتا ہے۔“

”اور آندھی طوفان کی طرح گاڑی کو ٹکرا بھی دیتا

مارتے ہیں۔ بس ایک کمزوری ہے کہ زرا اونچا سنتا ہے۔“

”کتنا اونچا؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

زیادہ نہیں ہاں۔ بس تھوڑا چنچنا پڑے گا۔“ کالے خان نے مجھے تسلی دی۔ ”دیکھنے میں خواخوہار لگتا ہے مگر اندر سے اتنا ہی نرم ہے۔ گولیاں مار کر مرنے والے کی مغفرت کی دعائیں مانگتا رہتا ہے۔“

”اور وہ تیسرا؟“ میں نے تیسرے کے بارے میں پوچھا جس کی صورت ڈاکٹر فوٹو مینجیسی تھی معلوم ہو رہی تھی۔ لمبی سی ڈاڑھی جیسے گہری کی دم لٹک رہی ہو۔

”یہ کس کام کا ہے؟“ میں نے اس کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

”اس کا نام بالم ہے ہاں۔ یہ بہت زبردست کارنگر ہے۔ تالے کھولنے میں اس کا جواب ہی نہیں۔ بڑے سے بڑے تالے اور تجوریاں ایک اشارے میں کھول دیتا ہے۔ آٹھ بار جیل جا چکا ہے۔“

”واہ کیا ٹیم جمع کی ہے تم نے۔“ میں نے طنز کیا۔

”آپ ان سے کام تو لیں ہاں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ تینوں بہت ہی صابر اور شاکر قسم کے بندے ہیں۔ آپ ان کے حصے کے نام پر انہیں کچھ بھی دے دیں گے تو یہ ہنسی خوشی لے لیں گے۔“

”ان کو بتا دیا ہے ناکہ کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ہاں ہاں۔ انہیں معلوم ہے کہ ہمیں بینک لوٹنا ہے۔“ کالے خان نے کہا۔

یہ میری ہی پلاننگ تھی، ایک بینک کو لوٹنے کی۔ یہ بینک ہمارے فلیٹ کے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ اس میں لوگوں کی آمد و رفت ابھی کم ہی تھی کیونکہ وہ ایک نئے بینک کی نئی شاخ تھی۔ اس کے دروازے پر ایک چوکیدار بیٹھا رہتا تھا۔ جس کے ہاتھ میں نہ جانے کس زمانے کی بندوق تھی۔ اس کے علاوہ بینک کا نمبر بہت مختصر تھا۔



صرف پانچ آدمی تھے۔ اس میں سے بھی دو عورتیں تھیں۔ اس عمل کو بہت آسانی سے قابو میں کیا جاسکتا تھا۔ پلاننگ یہ تھی کہ کالے خان اپنی گاڑی لے آئے گا۔ ہم سب کی چہروں پر نقائیں ہوں گی۔ گاڑی بینک سے کچھ فاصلے پر رک جائے گی۔ سب سے پہلے میں آگے جاؤں گا اور اس چوکیدار سے کچھ پوچھوں گا، اس کے بعد ہلاکو پیچھے سے آکر اسے قابو کر لے گا۔ ہم اسکو ریٹائل بنا کر بینک میں داخل ہوں گے۔ پھر کالے خان، ہلاکو اور بلم بھی بینک میں داخل ہو جائیں گے۔

ہم میں سے کسی کے پاس بھی اصلی اسلحہ نہیں ہوگا۔ ڈرانے کے لیے کھلونا پستولوں سے کام لیا جائے گا تاکہ کیس سرسین نہ ہو پائے۔ پھر اس کے بعد وہی سب کچھ ہونا تھا جو فلموں وغیرہ میں دکھایا جاتا ہے۔ ہم بینک لوٹ کر فضل دین کے ساتھ بیٹھ جائیں گے۔ اور دو گاڑی لے کر نکل چلے گا۔

ہم سب مختلف مقامات پر اتر جائیں گے۔ صرف میں ایک لمبا چکر کاٹ کر لوٹی ہوئی رقم کے ساتھ اپنے فلیٹ کی طرف آؤں گا۔ اور ساری رقم چھپا کر رکھ دوں گا۔ دو تین ماہ بعد سب جمع ہوں گے اور رقم کی تقسیم ہو جائے گی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کم از کم دو ہیٹوں تک اس میں سے کوئی رقم خرچ نہیں کرے گا۔

میری پلاننگ پرفیکٹ تھی۔ ہم نے منگل کا دن مقرر کیا تھا۔ کیونکہ ایک نجومی نے بتایا تھا کہ اس قسم کے کاموں کے لیے منگل کا دن بہت مبارک ہوا کرتا ہے۔

ہم منگل دن کے ایک جگہ جمع ہوئے۔ یہ جگہ میرے فلیٹ کے علاوہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں اس وقت خود کو باس نہیں بلکہ بگ باس ہی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے سب ہی ساتھیوں میں نقائیں

تقسیم کرتے ہوئے کہا۔

وقت ہونے والا ہے، سب لوگ اپنی اپنی نقائیں پہن لو۔ ہم یہاں سے پیدل ہی جائیں گے کیونکہ بینک زیادہ دور نہیں ہے۔

”وہ تو ٹھیک ہے باس لیکن جب ہم نقائیں پہن کر ایک ساتھ باہر نکلیں گے تو جمع ہمارے پیچھے پڑ جائے گا۔ بچے تالیاں بجاتے ہوئے، نعرے لگاتے ہمارے پیچھے آجائیں گے۔ لوگ الگ شک کریں گے۔“ کالے خان نے کہا۔

”ہاں یہ تو صحیح کہہ رہے ہو تم۔“ میں اس کی بات سمجھ گیا۔ ”تو پھر کیا کیا جائے؟ نقابوں کا استعمال بھی تو ضروری ہے۔ ورنہ ہماری شکلیں سی سی ٹی وی کیمروں میں آجائیں گی اور ہم پکڑے جائیں گے۔“

”باس چونکہ تم نے پہلے کبھی بینک نہیں لوٹا اس لیے تمہیں طریقہ نہیں معلوم۔“ بلم نے کہا۔ ”طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کے دروازے پر نقائیں لگاتے ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے گردن ہلائی پھر ہلاکو کی طرف دیکھا۔ ”ہلاکو تم تیار ہونا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں باس میں بالکل بیمار نہیں ہوں۔ بس پرسوں تک کھانسی تھی، اب بالکل ٹھیک ہے۔“ ہلاکو نے کہا۔

”لعنت ہو۔ اے میں بیمار نہیں، تیار ہوں پوچھ رہا ہوں۔ تیار۔ تیار۔“ میں چلایا۔

”نہیں بس اتنی بڑی ہم ہے۔ اتنا جوش ہے پھر بے زاری کس بات کی؟ میں بالکل بے زار نہیں ہوں۔“

”اے یہ کس قسم کے بندے کو اٹھا کر لے آئے ہو؟ یہ بندہ تو میرا دماغ ہی خراب کر دے گا۔“ میں

نے کالے خان کی طرف دیکھا۔

”باس میں نے بتایا تھا نا کہ یہ آدمی زرا اونچا نبتا ہے۔“ کالے خان نے وضاحت دی۔

”اے اور کتنا اونچا ہے گا؟ کیا میں پہاڑ پر پڑھ کر آواز دوں اسکو؟“ مجھے غصہ آیا۔

”فکر نہ کریں باس۔ اس کا علاج میرے پاس ہے۔“ کالے خان بولا۔

”کیا ہے علاج؟“

”بھونپو۔“

”کیا بھونپو؟“

”ویسا ہی جیسا منجن بیچنے والے استعمال کرتے ہیں۔ ہلاکو کے لیے میں نے یہ پہلے سے ہی خرید کر رکھا ہے۔ ہم وہ ساتھ لے کر جائیں گے۔“ کالے خان نے حل نکالا۔

میں نے دل ہی دل میں کالے خان کو گالیاں دیتے ہوئے نقاب کی تقسیم شروع کر دی۔ پہلی نقاب کالے خان کو اور دوسری فضل دین کو دینے لگا تو اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر شروع کر دیا۔

”اسکو کیا ہو گیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں باس۔ اس کا موٹیا تنگ کر رہا ہوگا۔ اس لیے آپکا ہاتھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“ کالے خان نے بتایا۔

”کالے خان خداتم سے سمجھ، اس شخص کو میرا ہاتھ تنگ نہیں دکھائی دے رہا۔ یہ تو ہم سب کو گاڑی سیت جنم میں پہنچا دے گا۔“

”کچھ نہیں ہوگا باس۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس کی ساری حسیں کام کرنے لگتی ہیں۔ اس وقت یہ دوسروں سے زیادہ ہی دیکھنے لگتا ہے۔“

مجھے اپنی اس ہم کے آثار اچھے نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو میں شخص ہی چکا تھا۔

”چلو اب تم بلم کی خوبی بتا دو۔“ میں نے کالے خان سے پوچھا۔

”یہ تو بالکل ٹھیک ہے باس۔ دنیا بھر کے تالے منہوں میں کھول دیتا ہے۔ بڑی بڑی تجوریاں اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ بس صرف اتنا مسئلہ ہے کہ اس کو کاندھوں پر اٹھا کر چلنا پڑے گا۔“

”کاندھوں پر اٹھا کر؟“ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

”کاندھوں پر کیوں؟“

”کیونکہ یہ بے چارہ چل نہیں سکتا۔“ کالے خان نے دکھ سے بتایا۔

اس بار میرا دل چاہا کہ اس کم بخت کالے خان کا گلا ہی دھا دوں۔

”کالے خان!“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ہم بینک لوٹنے جا رہے ہیں یا معذوروں کا اسکول کھولنے؟“

”ارے آپ فکر نہ کریں باس۔ اس میں سے کوئی بھی ہمارے لیے بوجھ نہیں بنے گا۔ سوائے بلم کے۔ کیونکہ بلم کو آپ ہی کے کاندھوں پر سوار ہونا ہے۔“

”کیا پاگل ہو گئے ہو؟“ اس بار میں پھٹ ہی پڑا تھا۔ ”میں اس شخص کو اپنے کاندھوں پر بٹھا کر ڈاکہ ڈالنے جاؤں گا؟“

”یہ تو مجبوری ہے باس۔ کیونکہ اس کی ناک بہت اونچی ہے۔ یہ باس سے کم کے درجے والے انسان کے کاندھوں پر سوار نہیں ہوتا۔“

”دیکھو کالے خان! ہمیں بینک لوٹنا ہے۔ کوئی سرکس کا کھیل نہیں دکھانا۔“ میں نے تپ کر کہا۔ ”تم مجھے کن چکروں میں پھنسا رہے ہو؟ مجھے ایسی ہی نہیں چاہئے۔ لے جاؤ ان لوگوں کو۔“

”باس اب تو سب کچھ ہو چکا ہے۔“ کالے خان گڑبڑا کر بولا۔ ”اب ہم پیچھے ہٹے تو ڈاکوؤں کی

آنے والی نسلیں ہمارا مذاق اڑائیں گی۔“
”اور اگر ہم اسی حال میں ڈاکہ ڈالنے پہنچے تو
موجودہ نسل مذاق اڑے گی۔“
”ایسا کچھ نہیں ہوگا باس۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ
ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔“ کالے خان نے یقین
دلایا۔

اب میں بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ کم بخت
بہت بری پتھویشن ہوئی تھی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے
ماندن والا معاملہ تھا۔ بہر حال ہوا یہ اس چکر میں
بینک کھلنے کا وقت آگیا۔

ہماری پلاننگ کی مطابق ہمیں ٹھیک گیارہ بجے
بینک میں داخل ہونا تھا لیکن کھلنے کے دو گھنٹے بعد۔
میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بینک میں گیارہ سے ایک
بجے تک لوگوں کی آمد و رفت کم ہوا کرتی تھی۔ البتہ
شام کے وقت تھوڑا ارش ہو جاتا تھا۔

ایک بار میں نے دوبارہ پلاننگ دہرائی۔ ہمیں
کیا کیا کرنا ہے، کس طرح کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس
وقت فضل دین کی چیخ سنا دی۔ جو کچھ دکھانے کے
لیے ہمیں کھڑکی سے پاس بلا رہا تھا۔ ہم سب جلدی
سے کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔

پچھلے سڑک پر ایک حیرت انگیز منظر ہمارے
سامنے تھا۔ سینکڑوں لوگ اپنے ہاتھوں میں پلے
کارڈز اٹھاے چل رہے تھے۔ جن پر طرح طرح
کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ اور ایک بینر آل
پاکستان کرس ایسوسی ایشن کا تھا۔

یعنی کلکوں نے اپنے مطالبات منوانے کے
لیے جلوس نکالا تھا۔ اور اس جلوس کی سب سے حیرت
انگیز بات یہ تھی کہ زیادہ تر لوگ نقاب پوش تھے۔

ایک بینر پر لکھا ہوا تھا۔
”ہم سفید پوش لوگ شرمندگی سے اپنا چہرہ نہیں
دکھا سکتے۔ ہم نے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے اور اپنے دکھ

سامنے کردئے ہیں۔“
یہ بینر پڑھ کر مجھے سمجھ آگیا کہ ان سب
نقاب کیوں لگا رکھے ہیں۔
”باس یہ بہت اچھا موقع ہے۔“ کالے خان
نے کہا۔
”کس بات کا موقع؟“

”ہم بھی نقابیں باندھ کر ان میں شامل ہو جائے
ہیں۔ اور بینک کے قریب آتے ہی بینک میں داخل
ہو جائیں گے۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ ہم نے
نقابیں کیوں پہن رکھی ہیں۔“ کالے خان نے مشورہ
دیا۔

”گڈ! یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔“
”تو پھر اٹھاؤ ڈاکو! اپنے کاندھوں پر۔“
”یار کالے خان کیوں ناس کم بخت کو یہ نہیں
چھوڑ دیا جائے۔“

”نہیں باس پھر بینک میں داخل ہونے کا کیا
فائدہ ہوگا؟ ہم وہاں تفریح کے لیے تو
نہیں جا رہے۔“ کالے خان کی بات درست تھی۔
مرتا کیا نہ کرتا مجھے اس بالم کو اپنے کاندھوں پر
اٹھانا پڑا۔ میرے ہاتھ ہی میں بھونپو بھی تھا۔

سب سے آگے میں تھا۔ میرے کاندھوں پر بالم
تھا، اس کے بعد کالے خان پھر وہ دونوں۔ ہم سب
ہی نقاب میں تھے۔ کالے خان کی بات بہت
درست تھی کہ چونکہ پورا مجمع ہی نقاب پوشوں کا ہے
اس لیے کوئی خاص طور پر ہماری طرف دھیان نہیں
دے گا۔ اور واقعی کوئی بھی دھیان نہیں دے رہا تھا۔
ہم احتجاج کرنے والوں کا ہی ایک حصہ بن گئے
تھے۔

لیکن یہ صورتحال زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی
کیونکہ کچھ لوگ اس کم بخت بالم کی وجہ سے ہماری
طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ واحد آدمی تھا جو کسی کے

کاندھوں پر سوار تھا، یعنی ایک نقاب پوش کے اوپر
ایک اور نقاب پوش۔
اچانک ایک نقاب پوش نے ہماری طرف
اشارہ کیا۔
”دیکھا یہ ہے جذبہ! ہمارا ایک کلرک بھائی اپنے
ایک معذور بھائی کو اپنے کاندھوں پر بٹھا کر لایا
ہے۔“

پھر ایک نے نعرہ لگایا۔ ”کلرکوں کا اتحاد!“
دوسرے نے زندہ باد کہا۔ پھر ایک نے میری
طرف اشارہ کیا۔

”بھائیوں ہمارا یہ جاں نثار کلرک بھائی اپنے
ہاتھ ایک بھونپو بھی لے کر آیا ہے۔ شاید یہ ہم سے
بڑھ کر بھونپو ہے۔“

آس پاس کے نقاب پوش کلرک زور زور سے
تالیاں بجانے لگے۔ میں اس صورتحال پر ہلکا کر رہ
گیا۔ لوگوں نے شاید مجھے کلرک کرس ایسوسی ایشن کا کوئی
اہم امیدوار ہی سمجھ لیا تھا۔ اس لیے وہ سب کے سب
میرے گرد جمع ہو گئے۔ عجیب مضحکہ خیز صورتحال تھی۔
میرے چاروں طرف نقاب پوش تھے۔ اور اس بھیڑ
میں پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ میرے اپنے ساتھی
کہاں ہیں۔

ہمیں جس بینک میں ڈاکہ ڈالنا تھا وہ بھی
سامنے ہی تھا۔ لیکن میں بری طرح بھٹس چکا تھا۔
بہر حال میں نے بھونپو ہاتھ میں لے کر تفریر شروع
کر دی۔ وہ مفلوج بالم بدستور میرے کاندھوں
پر سوار تھا، میرا خیال ہے کہ کسی لیڈر نے ایسی حماقت
انگیز پتھویشن میں کبھی تقریر نہیں کی ہوگی۔

بہر حال میں نے بولنا شروع کر دیا۔
”میرے مظلوم کلرک بھائیوں میں جانتا ہوں
کہ تمہارے ساتھ کیا گزر رہی ہے۔ تم لوگ کتنے
برے حال میں ہو۔ تمہارے گھر میں کھانے کو کچھ

نہیں ہے، چوبیس گھنٹے بڑبچکے ہیں، تمہاری
بیویاں تمہاری مفلسی کی وجہ سے گھروں سے بھاگنے کو
تیار ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا لیکن ظالم، بے رحم اور
بے درد حکمرانوں کو تمہاری حالت پر رحم تک نہیں آتا،
شرم نہیں آتی۔ ان لوگوں کو میرے کلرک بھائیوں یہ
تمہیں مار دینا چاہتے ہیں۔“

زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔ اس وقت میں
نے محسوس کیا کہ شاید میرے لیے یہ فیلڈ بہت
مناسب ہے، میں بہت اچھا سیاست دان بن سکتا
ہوں۔ میرے اندر واحد صلاحیت اس وقت سامنے
آ رہی تھی۔ میں نے پورے جھوم پر جوش کر دیا تھا۔
لوگوں کو یہ تو نہیں معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور
میرا نام کیا ہے۔ اس لیے وہ کچھ اس قسم کے نعرے لگا
رہے تھے۔

ہمارا نقاب پوش بھائی زندہ باد! ہمارا گم نام بھائی
زندہ باد! زندہ باد! زندہ باد!

میری سرشاری شاید کچھ اور دیر جاری رہتی لیکن
ہوا یہ کہ اس وقت پولیس نے ہم پر دھاوا بول دیا۔
پولیس والے لالٹیاں برساتے ہوئے ہم پر حملہ آور
ہو گئے۔

بدقسمتی یہ تھی کہ ہمارے ارد گرد جو لوگ جمع تھے وہ
پولیس کو دیکھ کر فوراً ادھر ادھر ہو گئے۔ میرے
کاندھوں پر سوار بالم نے مجھے دو تھڑ مارنا شروع
کر دیے تھے۔

”ارے باس بھاگو! بھاگو! ورنہ ہم پھنس
جائیں گے۔“

میں نے سوچا کہ کم بخت بالم کو نیچے گرا کر وہاں
سے بھاگ جاؤں۔ لیکن میں بھاگ نہیں سکا، پولیس
نے مجھے پکڑ لیا۔ صرف مجھے ہی نہیں بلکہ میرے
ساتھ وہ بالم بھی پکڑا گیا۔

عجیب صورتحال تھی، پورے مجمع سے صرف میں

”سچی کہانیاں“ اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے

ادارہ ”سچی کہانیاں“ اپنے قارئین کی سہولت کے لیے دفتر میں ایک ڈیسک قائم کر رہا ہے۔ آپ کو اگر ”سچی کہانیاں“ ملنے میں دشواری ہے تو بذریعہ فون یا میسج ہمیں مطلع کریں آپ کہیں بھی رہتے ہیں ادارہ آپ کے گھر کے پتے پر بذریعہ وی پی ”سچی کہانیاں“ ارسال کرے گا اس طرح آپ اور آپ کے پیارے ”سچی کہانیاں“ کے درمیان جو دوریاں پیدا کر دی جاتی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ ”سچی کہانیاں“ اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے۔

فوری رابطہ 021-35893121-22-23

موبائل نمبر 0304-3168708

کے پاس لے آیا۔ باس سے اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ اس کے علاوہ ہلاک اور فضل دین بھی اس میں شامل تھے غرض اس نے ساری پلاننگ بتادی۔ ”لیکن تم لوگ ڈاکہ ڈالنے کے بجائے کلرکوں کے جلوس میں پھنس گئے۔“ ایس ایچ او نے تبصرہ کیا۔ ”یہ ہماری بد قسمتی ہے جناب۔ یہ باس کا آئیڈیال تھا کہ سب کے چہروں پر نقائیں ہوں گی۔ اور کلرکوں میں شامل ہوں گے۔“

”اب تو بتا باس! تو وہاں تقریر کیوں کرنے لگا تھا؟“ ایس ایچ او نے میری طرف دیکھا۔

”قسمت کی خرابی اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرے پاس بھوپو تھا اور یہ کم بخت باس میرے کانڈھوں پر لوگوں نے مجھے تقریر کے لیے کہا اور میں مرتا کیا کرتا، اپنی جان چھڑانے کے لیے مجھے تقریر کرنی پڑی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میری تقریر کچھ زیادہ ہوئی پر جوش ہوئی جس کے نتیجے میں پولیس نے ہلا بول دیا اور میں یہاں تھا نے میں۔ اس کو کہتے ہیں کہ کھایا پیا گلاس تو ڈابارہ آئے۔“

یہ احوال سن کر ایس ایچ او کے ساتھ ساتھ اس کمرے میں موجود سارے پولیس والے بھی زور سے ہنسنے لگے۔

کسی بھی ڈاکہ کی ایسی کہانی ان پولیس والوں نے کبھی نہیں سنی ہوگی۔ مگر قصہ مختصر یہ کہ کیونکہ ہم بلیک لوٹنے کی پلاننگ کی تھی۔ ایک بڑا جرم کرنے کی کوشش کی تھی اسی بنیاد پر ہمیں عدالت نے ایک ایک سال کی سزا سنائی۔ کالے خان اور فضل دین کو گرفتار کر لیا گیا۔

اور اب میں اس ایک سال جیل میں بیٹھ کر نئی فیلڈ کے بارے میں سوچوں گا۔ جی ہاں آپ سمجھے۔ سیاست کے بارے میں پلاننگ۔

☆☆☆☆☆

اور باس ہی تھے۔ باس کو میرے کانڈھوں سے اتار کر موبائل میں بٹھا دیا گیا۔

تمنا شاید تھا کہ گرفتار ہونے والا صرف میں تھا۔ شاید پولیس نے یہی مناسب سمجھا کہ مجمع میں سے کسی اور کو پکڑنے کے بجائے مجمع کے لیڈر کو ہی پکڑ لیا جائے۔ اور بد قسمتی اس وقت تقریر جھاڑتا شخص میں ہی تھا جس پر لیڈر کا گمان ہوتا تھا۔

بہر حال ہم دونوں موبائل کے ذریعے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ اگر معاملہ صرف کلرکوں کے جلوس کا ہی ہوتا تو کوئی بات ہی نہیں تھی مگر وہاں پینچنے پر صورتحال کچھ اور ہو گئی۔

پولیس کے خوف سے باس نے شور مچانا شروع کر دیا۔

”خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔ ہمارا کلرکوں اور ان کے جلوس وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”اگر تعلق نہیں ہے تو پھر تم دونوں نے یہ نقائیں کیوں لگا رہی تھی؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”جناب ہم دونوں تو بینک لوٹنے کے چکر میں نکلے تھے۔“ باس نے اگل دیا۔

”کیا؟ بینک لوٹنے۔“ ایس ایچ او سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ ”یہ بکواس نہیں جناب۔ سچ ہے۔“

”خاموش رہو۔“ میں نے باس کو ڈانٹا۔

”نہیں باس بتانے دو مجھے۔ میں اب اگلے سیدھے چکروں میں نہیں پڑوں گا۔ میں تو کسی اور کام سے تمہارے پاس آیا تھا یہ تم نے مجھے کہاں پھنسا دیا۔“

”بتا کس کام سے گیا تھا؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

پھر باس کم بخت نے واقعی کم بختی کا ثبوت دیا اور پوری کہانی سنائی کہ کس طرح کالے خان اسے باس

دینی سے ارسال کردہ

مسلم خواتین



میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غم ناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدہ مشکل کی کشود

اسلام نے خواتین کو وہ عزت اور مرتبہ دیا جس کی وہ حق دار تھیں ایک

بہترین تحقیقی مضمون سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے.....

تہینہ جلیل عقیبی

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”دنیا کی چیزوں میں
مجھے خوشبو اور عورت پسند ہے اور نماز میری آنکھوں کی
ٹھنڈک ہے۔“

عورت فضائے عالم کی وہ خوبصورت قوس قزح
ہے جس کے ایک ایک رنگ سے زندگی کے سوسو
سوتے پھوٹتے ہیں۔ جس کی سانس کار کمرہ کائنات
کے سینے میں چلتی ہے۔ تو پھر صنف نازک پر یہ ظلم
کیسا؟

مذہبی حلقہ کہتا ہے کہ عورت کو مرد کی اداسی کم
کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہزاروں سال زمین پر
صرف مرد کی حاکمیت ہے عورت کو صنف نازک بھی کہا
جاتا ہے یعنی اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ عورت وہ
کام نہیں کر سکتی جو ایک مرد کر سکتا ہے۔ عورت کو
”ناقص العقل“ بھی کہا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ
ہزاروں سال سے عورت کا تسلط قائم نہیں ہو سکا اگر
چہ زندگی کے تمام شعبوں میں عورت نے آگے بڑھنے

مٹی۔ لڑکپن میں والدین کی، جوانی میں اپنے شوهر کی
... کی میں فرزندوں کی۔

روم میں مرد کی حکومت عورت پر انتہائی جاہلانہ
مٹی عورت محض ایک لونڈی تھی اسے کسی قسم کا حق
مامل نہیں تھا وراثت میں کوئی حصہ نہیں تھا مرد جب
ماہتا بیوی سے رشتہ توڑ لیتا اور اس کو مارتا پیٹتا، ایران
میں عورت کو میرکار، عیار اور بدچلن سمجھا جاتا اور حالت
انٹی شرم ناک تھی کہ باپ اور بھائی اپنی بیٹی اور بہن کو
اجبت میں لے لیتے۔ وہاں جتنی بیویوں کو چاہتے
مادی کرتے اور طلاق دیتے۔ داشہ عورتوں کو رکھنے کا
واج عام تھا۔

ہندو مذہب میں بھی عورت کی قابل نہیں سمجھی
جاتی تھی اور نہ ہی اس کی زندگی خود مختار تھی، بدھ مت
میں بھی عورت کو خوب برا سمجھا گیا تھا۔
586 میں نبی کریم ﷺ کی پیدائش کہ 10 برس

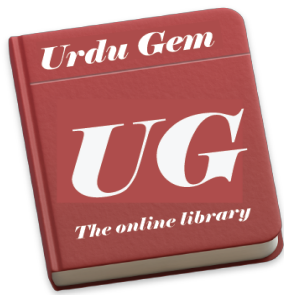
تک یہ عالم تھا کہ یہ بات زیر بحث تھی کہ کیا عورت
انسان ہے؟؟ بڑے مہاجے کے بعد یہ بات طے ہوئی
کہ یہ مان لیا جائے کہ وہ کوئی نجس حیوان نہیں ہے بلکہ
مردوں کی خدمات کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

عرب معاشرے میں تو عورت کو ملکیت تصور کیا
جاتا رہا مردان کا کوئی پاس ہی نہ رکھتا تھا لڑکی کو پیدا
ہوتے ہی دُش کر دیا جاتا تھا قرآن پاک میں ان
لوگوں کے جذبات کی یوں منظر کشی کی گئی۔

ترجمہ: اور جب ان میں سے کسی کی بیٹی ہونے
کی خوشخبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ ”کالا
رہتا ہے اور وہ غصہ کھاتا ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا
ہے اس بشارت کی برائی کے سبب کیا اسے کیا ذلت
کہ ساتھ رکھے گا یا اسے مٹی میں دبا دیگا۔ خبردار بہت
ہی برا حکم لگاتے ہیں“

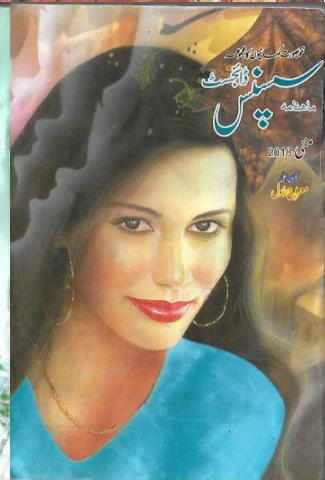
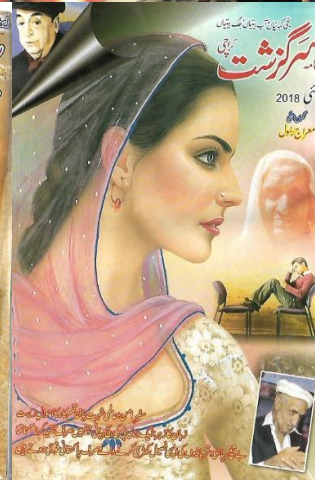
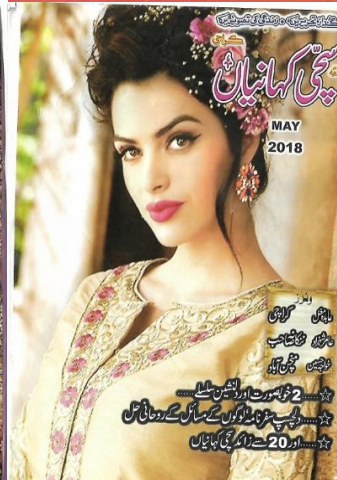
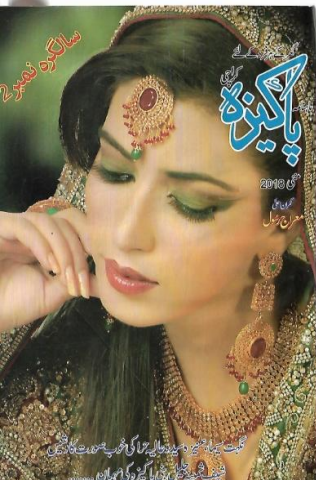
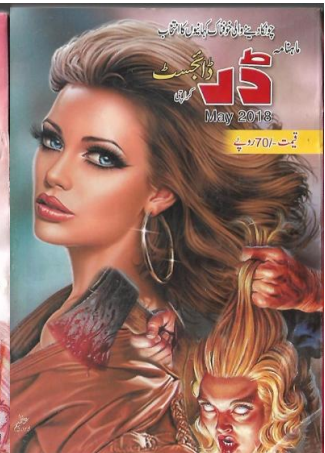
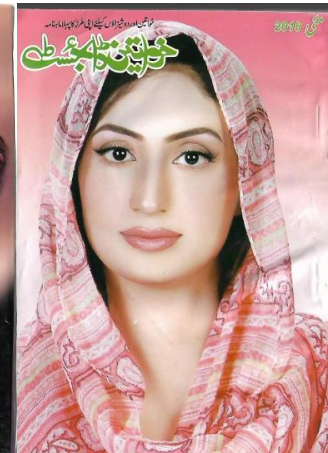
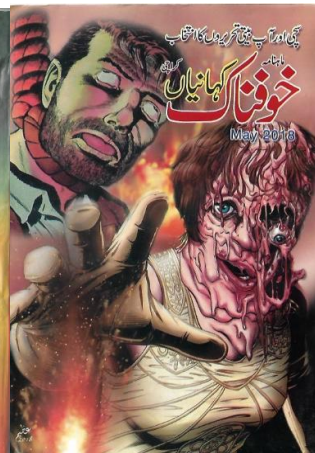
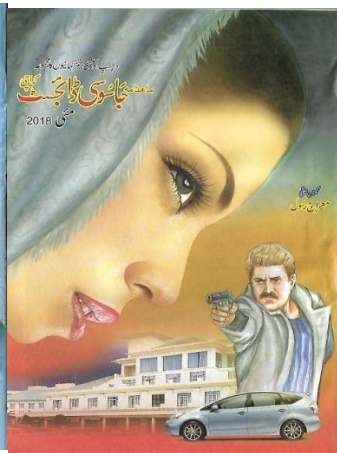
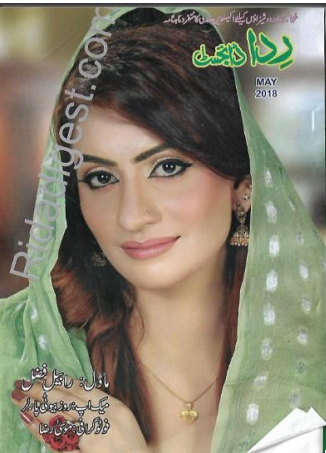
یہودی مذہب میں عورت کو بدنیت اور مکار سمجھا





UrduGem.com

URDU KA KHAZAANA



جاتا تھا عیسائیت میں بھی عورت کہ ساتھ یہودیت جیسی روش اختیار بھی بلکہ اور زیادہ ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔

مذہب اسلام میں عورت کو بہترین مقام پر فائز کیا گیا اس کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔
اللہ کے نظام میں برابر کا درجہ دیا گیا

”تھن لباس لکم وانتم لباس لھن“
یعنی وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

ایک اور جگہ فرمایا۔
”دنیا ایک نفع کا سامان ہے اور دنیا کا بہترین سامان نیک اور صالح بیوی۔“

اسلام نے عورت کی عزت اور عظمت کا قائل کیا اور بتایا کہ اس کو کم حیثیت ماننا نوع انسانی کے لیے خطرہ اور نقصان ہے۔

آج ہم یہاں اُن چند مرتبت خواتین کا ذکر کریں گے جو نہ صرف خواتین بلکہ انسانوں کے لیے بھی باعث احترام اور فخر ہیں۔

حضرت مریم علیہ سلام:
حضرت مریم علیہ سلام، حضرت عمران علیہ سلام کی بیوی اور حضرت عیسیٰ علیہ سلام کی والدہ تھیں۔

آپ ایک انتہائی شریف، عقیقہ اور پارسا خاتون تھیں اور ہر وقت عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔
قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت مریم کے پاس

حضرت جبریل تشریف لائے اور اللہ کے حکم سے ان میں ایک نئی روح پھونک دی اور وہ حاملہ ہو گئیں اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ سلام پیدا ہوئے۔

آخری الہامی کتاب اور تمام آسمانی کتابوں میں اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت جبرائیل نے انہیں بیٹے کی خبر دی۔

قرآن حکیم کی پوری سورۃ حضرت مریم سے منسوب ہے
اگر قرآن حکیم کے نزدیک عورت کا مقام مرد سے کمتر ہوتا اور اس کی عظمت اور بزرگی مرد کو مساوی نہ ہوتی تو قرآن پاک میں سورۃ مریم حضرت مریم کے

بجائے حضرت عیسیٰ کے نام سے منسوب کی جاتی۔
کے علاوہ بیس مقامات پر قرآن کریم میں حضرت کا ذکر کیا گیا ہے

اللہ کی طرف سے بھیجے گئے فرشتے نے حضرت مریم سے طویل گفتگو کی اور قرآن میں اس کی وحی شہادت بھی موجود ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔
انہوں نے کہا۔ ”بھلا میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے نہ مجھے کسی مرد نے چھوا اور نہ میں بد چل ہوں۔“

فرشتے نے جواب دیا تمہارے پروردگار کا کہا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے اور ایسا ہی ہوگا کہ ہم لوگوں کے لیے اس کو نشانی بنا دیں۔ یہ بات طے شدہ ہے۔ پھر مریم کو حمل قرار پایا پھر وہ اسے لیے کہیں دور چلی گئیں۔ ان کو درد نہ ہوا۔ وہ اس درد کے سبب ایک مجبور کے درخت کے نیچے چلی گئیں۔

کہنے لگیں کاش میں پہلے مرگئی ہوتی اور لوگ مجھے بھلا چکے ہوتے۔ پھر فرشتے نے مریم کو پکارا اور کہا۔ تم مت گرو تمہارے پروردگار نے تمہارے قریب ہی ایک نہر جاری کر دی ہے تم اس مجبور کے تنے کو پلاؤ

اس سے تم پر تازہ مجبور گریں گی تم انہیں کھاؤ اور اگر کوئی شخص تم سے بات کرے تو کہہ دینا۔ میں نے خدائے رحمن کے لیے روزے کی نذر مان رکھی ہے ان سے کہہ دینا آج میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔“

حضرت آسیہ علیہ السلام:
حضرت آسیہ بنت مزاحم مصر کے بادشاہ فرعون کی بیوی تھیں۔ بہت پارسا اور ہمدرد خاتون تھیں۔ جب

موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی والدہ صاحبہ انہیں ایک صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں بہا دیا۔ تاکہ فرعون کو پتہ نہ لگ جائے اور وہ انہیں مل نہ دے۔ جب یہ صندوق فرعون کے گھر کے قریب پہنچا

آسیہ نے صندوق کو دیکھ کر اسے دریائے نیل پر ڈال دیا۔ پھر انہیں نظر آیا تو بڑی محبت سے اس کی پرورش کی۔ آسیہ فرعون سے اپنا ایمان مخفی رکھتی تھی اور

میں اسے اس کے متعلق علم ہو گیا تھا۔
1- فرمان باری تعالیٰ ہے:

”اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے فرعون کی دیوی کی مثال بیان کی ہے کہ جب اس نے کہا اے میرے رب میرے لیے اپنے پاس جنت میں گھر بنا، اور فرعون اور اس کے عمل سے نجات نصیب فرما اور مجھے غلاموں کی قوم سے بھی نجات عطا فرما۔“

2- ابو موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مردوں میں سے تو بہت سے درجہ کمال تک پہنچے لیکن عورتوں میں سے سوائے فرعون کی بیوی آسیہ اور مریم بنت عمران کے کوئی اور عورت درجہ کمال تک نہیں پہنچی، اور عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باقی سب عورتوں پر فضیلت ایسی طرح ہے کہ جس طرح شریہ

باقی سب گھانوں پر افضل ہے۔
3- ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین پر چار لکیریں لگائیں اور فرمانے لگے:

”کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟“ صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زیادہ علم ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جنتی عورتوں میں سب سے افضل خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم اور مریم بنت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہا جعین ہیں۔

4- اس بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

آپ کو (کمال کے اعتبار سے) دنیا کی سب عورتوں سے مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور فرعون کی بیوی آسیہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کافی ہیں۔ امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

5- حافظ ابن حجر کا کہنا ہے:

فرعون کی بیوی آسیہ علیہ السلام کے فضائل میں سے ہے کہ انہوں نے دنیا کی ان نعمتوں کے بدلے میں جس میں وہ تھیں دنیا کے عذاب و تکالیف اور بادشاہی کے بدلے میں قنوت اختیار کر لیا اور ان

کی موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فراست سچی تھی جب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں (ان کو دریا سے نکالتے ہوئے) یہ کہا یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

اسی طرح سورۃ القصص اور سورۃ تحریم میں حضرت آسیہ کا ذکر موجود ہے۔

حلیہ سعدیہ
حلیہ بنت ابی ذؤبیب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی والدہ ہیں، بی بی ثویبہ کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ نے ہی آخر تک دودھ پلایا، اس وقت آپ کے ساتھ عبد اللہ ابن حارث کو بھی دودھ پلایا، آپ کی بڑی بیٹی شہما حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دودھ میں کھلائی لوریاں دیتی تھیں۔ چار پانچ سال

حلیہ کے پاس باہر بنو سعد میں مقیم رہے۔
حضرت خدیجہ کو یہ منقبت حاصل ہے کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہوئیں یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت اسلام تمام انسانوں سے پہلے انہوں نے قبول کی۔ ان سے پہلے نہ کوئی مرد اسلام لایا نہ عورت نہ

بوڑھا نہ بچہ۔۔۔ مشکوٰۃ
ایک مرتبہ حضرت خدیجہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کھانا اور سالن لے کر جا رہی تھیں ابھی پہنچنے ہی نہ پائی تھیں کہ حضرت جبریل آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ خدیجہ آ رہی ہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچ جائیں تو ان کو اللہ کا اور میرا سلام پہنچا دیجئے اور ان کو جنت کا ایسا مکان مل جائے کی خوشخبری سنا دیجئے جو موتیوں کا ہوگا جس میں نہ ذرا شور و شغب ہوگا نہ ذرا تکلیف ہوگی۔

جنت میں خلاف طبع آواز تو کسی کے کان میں بھی نہ آئے گی مگر خصوصیت کے ساتھ حضرت خدیجہ کو جو ایسے مکان کی بشارت دی گئی یہ غالباً اس لیے کہ دشمنان اسلام، اسلام اور داعی اسلام کے خلاف جو طرح طرح کی باتیں کرتے تھے وہ ان کے کانوں

پر نہ تھیں ان کی وجہ سے جو سخت کوفت ہوتی تھی اس کی وجہ سے سلی دینے کیلئے یہ خصوصی بشارت دی گئی۔
جب تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے کسی اور عورت سے نکاح نہیں کیا۔
حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا:
فاطمہ ہے۔ بہت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کا
معروف نام فاطمہ الزہرا
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خدیجہ بنت
خویلد کی بیٹی تھیں۔
حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ابتدائی
تر بیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت
خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کی۔ اس کے علاوہ ان کی
تر بیت میں اولین مسلمان خواتین شامل رہیں۔
بچپن میں ہی ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی
اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے اسلام کا ابتدائی
زمانہ دیکھا اور وہ تمام شکی برداشت کی جو رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدائی زمانہ میں قریش کے
ہاتھوں برداشت کی۔
ایک روایت کے مطابق ایک دفعہ حضرت محمد صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ میں حالت سجدہ میں تھے جب
ابو جہل اور اس کے ساتھیوں نے ان پر اوٹ کی
اوبھری ڈال دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خبر
ملی تو آپ نے آکر ان کی کمر پائی سے دھولی حالانکہ
آپ اس وقت کم سن تھیں۔
اس وقت آپ روتی تھیں تو حضرت محمد صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم ان کو کہتے جاتے تھے کہ اے جان پدرو
نہیں اللہ تیرے باپ کی مدد کرے گا حضرت حذیفہ
رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
آلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک فرشتہ جو اس رات سے پہلے
کبھی زمین پر نہ اتر ا تھا اس نے اپنے پروردگار سے
اجازت مانگی کہ مجھے سلام کرنے حاضر ہو اور یہ
خوفخیزی دے کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا اہل جنت کی تمام
عورتوں کی سردار ہے اور حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی
اللہ عنہ جنت کے تمام جوانوں کے سردار ہیں۔
حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ
میری جان کا حصہ ہے پس جس نے اسے ناراض کیا
اس نے مجھے ناراض کیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بیان
فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے
فرمایا: بے شک فاطمہ سلام اللہ علیہا میری جان کا حصہ
ہے۔ اسے تکلیف دینے والی چیز مجھے تکلیف دیتی
ہے اور اسے مشقت میں ڈالنے والا مجھے مشقت میں
ڈالتا ہے۔
حضرت ابو حظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے شک
فاطمہ سلام اللہ علیہا میری جان کا حصہ ہے۔ جس نے
اسے ستایا اس نے مجھے ستایا۔
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام
حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنے اہل و
عیال میں سے سب کے بعد جس سے گفتگو فرما کر سفر
پر روانہ ہوتے وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا
ہوتیں اور سفر سے واپسی پر سب سے پہلے جس کے
پاس تشریف لاتے وہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ
عنہا ہوتیں۔
ایک اور مشہور حدیث (جو حدیث کساء کے
نام سے معروف ہے) کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ
آلہ وسلم نے ایک بچی چادر کے نیچے حضرت فاطمہ
حضرت علی رضی اللہ عنہ و حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی
اللہ عنہ کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ بے شک اللہ چاہتا ہے
کہ اسے میرے اہل بیت تجھ سے جس کو دور کرے
اور ایسے پاک کرے جیسا پاک کرنے کا حق ہے۔
ایک دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت
فاطمہ کو طلب فرمایا اور اپنے پاس بٹھا کر کان میں چند
باتیں فرمائیں۔ حضرت فاطمہ رونے لگیں اور بہت
ممکن ہوئیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے
کان میں دوبارہ ایک بات کہی۔
حضرت فاطمہ روتے روتے جب ہو گئیں اور
مسکرانے لگیں۔ حضرت عائشہ نے بی بی فاطمہ سے
جب استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ پہلی مرتبہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کان میں کہا تھا کہ
جبرائیل سال میں ایک مرتبہ مجھ سے قرآن سناتا

ہیں۔ لیکن جبرائیل نے اس سال دو بار مجھ سے
قرآن سنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سال
رخصت ہو جاؤں گا۔ یہ سن کر میں رونے لگی۔
پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرگوشی میں فرمایا۔ اہل
بیت میں سے تم سب سے پہلے مجھ سے ملاقات
کرو گی۔ یہ سن کر میں مسکرا دی۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ ماہ بعد
حضرت فاطمہ اپنے والد گرامی کے پاس تشریف لے
گئیں۔
خولہ بنت الازور:
خولہ بنت الازور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
زمانے کی ایک نمایاں خاتون تھیں حضرت ضرار کی
بہن تھیں۔
آپ ایک عرب خاتون تھیں
آپ کو تیر اندازی میں مہارت حاصل تھی آپ
اور آپ کے بھائی خالد بن ولید کی قیادت میں رہے۔
خولہ بنت ازور عورت تھیں لیکن ان کی شمشیر خار
اشکاف بڑے بڑے چالوں کا پتہ پانی کی دہلی تھے۔
خولہ بنت الازور بھی بہت دلیر مجاہدہ تھیں، جنگ
اجنادین نقاب اوڑھ کر میدان میں مجاہدین کے ہمراہ
برسرِ کار ہوئیں تو عیسائی ان کی خداداد جنگی صلاحیتیں
دیکھ کر گھمبے کہ یہ خالد بن ولید ہیں۔ ان بہن بھائی نے
لازوال داستانیں رقم کیں۔
پاکستان آری کے مایہ ناز نیک کا نام ضرار
ہے، عراق کے عورتوں کی سب سے بڑی یونٹ خولہ
بنت الازور ہے، سعودی عرب کے خواتین کی ٹریننگ
کے سرکاری کالج کا نام بھی خولہ بنت الازور ہے۔
رفیدہ ال اسلامیہ:
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی ایک
صحابیہ حضرت رفیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں جو کہ
اسلامی تاریخ کی سب سے پہلی نرس خاتون تھیں۔
حضرت رفیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا پورا نام حضرت
رفیدہ بنت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھا جن کا تعلق بنو
اسلم سے تھا جو کہ مدینہ کے خضر قبیلہ کا حصہ تھا۔
حضرت ام رفیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مدینہ میں

قتل کیا تھا، اُحد کے بعد بیعت الرضوان، خیبر اور فتح مکہ میں بھی شرکت کی۔ ابوبکر کے عہد میں یمامہ کی جنگ پیش آئی، مسیلہ کذاب مدعی نبوت سے مقابلہ تھا۔ اُمّ عمارہ اپنے ایک لڑکے (حبیب) کو لے کر خالد کے ساتھ روانہ ہوئیں اور جب مسیلہ نے ان کے لڑکے کو قتل کر دیا تو انہوں نے منت مانی کہ ”یا مسیلہ! ہوگا یا وہ خود جان دے دیں گی۔“ یہ کہہ کر تلوار تلخ لی اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئی اور اس پامردی سے مقابلہ کیا کہ 12 زخم کھائے اور ایک ہاتھ کٹ گیا، اس جنگ میں مسیلہ بھی مارا گیا کھاجاتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ خوفزدہ رہتی ہیں۔ ان میں بہادری کم ہوتی ہے۔

سودہ بنت عمارہ نے ابوسفیان سے بھرے دربار میں بے خوفی کے ساتھ بحث کی اور ایسے مسائل زیر بحث لائیں کہ شام کا حاکم جواب نہ دے سکا۔ انصاف نہ کرنے پر انہوں نے مقابلے کی دھمکی بھی دی۔ آخر کار ابوسفیان نے مجبور ہو کر سودہ بنت عمارہ کا مطالبہ پورا کیا۔ (العقد العزیز: جلد اول)۔

رابعہ بصری:
قرن اولیٰ کی معروف صوفی شخصیت رابعہ بصری کی پیدائش عراق کے شہر بصرہ میں ہوئی۔ اسلامی ادب میں رابعہ بصری سے جڑی بے شمار روحانی کرامات کے واقعات ملتے ہیں، اولیاء اللہ خواتین میں آپ کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ آپ قلندرانہ اوصاف رکھتی تھیں اور مرتبہ ولایت نہایت بلند تھا۔

اولیاء اللہ میں حضرت رابعہ بصری پیدا ہوئیں اور بے شمار خواتین پیدا ہوئیں بے شمار قلندر ہوئیں۔

نفس الذین صاحب فرماتے ہیں ”یہ آدھا قلندر کیا ہوتا ہے؟ ایک عورت نے اگر ایم۔ اے کیا ہے تو وہ آدھی ایم۔ اے ہے؟ ایک عورت اگر پی۔ ایچ۔ ڈی ہے تو وہ آدھی پی۔ ایچ۔ ڈی ہے؟ فرد نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی تو وہ پورا پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟ عورت ہو یا مرد۔۔۔۔۔ ہے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اس طرح قلندر، قلندر ہے۔۔۔۔۔ چاہے وہ

عورت ہو یا مرد، وہ اور تاریخ پر چونکہ مردوں کا تصور رہا، اقتدار بھی مردوں کے ہاتھ میں رہا، بادشاہیں مردوں کے ہاتھ میں رہیں نتیجہ یہ نکلا کہ اولیاء اللہ خواتین کے نام بھی گئے چنے رہ گئے۔

قلندریت ایک صفت ہے جس میں بندے کی طرز فکر غیر جانبدار ہوتی ہے۔ ”قلندر“ ایسے ”صوفی“ کہ کہتے ہیں جس کی چشم حقیقت کے سامنے ہر شے کی سچائی نظر بن گئی ہو۔ اور وہ مراتب اعلیٰ کو سمجھ کر ان میں عروج کرتا رہے۔ ”قلندر“ وہ ہے ”میں غرق ہو کر“ ”مرتبہ احدیت“ کا مشاہدہ برقرار ہے۔ مشاہدے کے بعد انسانی مرتبے پر واپس پہنچ کر ”عبدیت“ کا مقام حاصل کرے۔ جزو میں کل اور کل میں جزو کو دیکھے۔

یہ ایک روحانیت کا درجہ ہے جس کے لیے مرد اور عورت ہونا ضروری نہیں۔

رابعہ بصری کے والد کو خواب میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی اور انہوں نے رابعہ کے والد کو بشارت دی کہ ”تمہاری نو مولود بیٹی، خدا کی برگزیدہ بندی بنے گی اور مسلمانوں کو کوچ راہ پر لے کر آئے گی۔“

کچھ عرصے بعد رابعہ بصری کے والد انتقال کر گئے۔ اس اثناء میں بصرہ کو سخت قحط نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قحط کے دوران آپ (رابعہ بصری) اپنی بہنوں سے پھر گئیں۔ ایک بار رابعہ بصری ایک قافلے میں جاری تھیں کہ قافلے کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور ڈاکوؤں کے سرغنہ نے رابعہ بصری کو اپنی تحویل میں لے لیا اور آپ کو لوٹ کے مال کی طرح بازار میں لوٹائی بنا کر بیچ دیا۔ آپ کا آقا آپ سے انتہائی سخت محنت و مشقت کا کام لیتا تھا۔

اس کے باوجود آپ دن بھر میں کام کرتیں اور رات بھر عبادت کرتی رہیں اور دن میں بھی زیادہ تر روزے رکھتیں۔ اتفاقاً ایک دفعہ رابعہ بصری کا آقا آدھی رات کو جاگ گیا اور کسی کی گریہ و زاری کی آواز سن کر دیکھنے چلا کہ رات کے اس پہر کون اس طرح گریہ و زاری کر رہا ہے! وہ یہ دیکھ کر حیران رہ

گیا کہ رابعہ بصری اللہ کے حضور سجدہ میں اور نہایت عاجزی کے ساتھ کہہ رہی ہیں۔

”اے اللہ! تو میری مجبور یوں سے خوب واقف ہے۔ گھر کا کام کاج مجھے تیری طرف آنے سے روکتا ہے۔ تو مجھے اپنی عبادت کے لیے پکارتا ہے مگر میں جب تک تیری بارگاہ میں حاضر ہوتی ہوں، نمازوں کا وقت گزر جاتا ہے۔ اس لیے میری معذرت قبول فرما لے اور میرے گناہوں کو معاف کر دے۔“

اپنی کثیر کا کلام اور عبادت کا یہ منظر دیکھ کر رابعہ بصری کا مالک خوف خدا سے لرز گیا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسی اللہ والی کنیز سے اپنی خدمت کرانے کی بجائے بہتر یہ ہوگا کہ خود اس کی خدمت کی جائے۔ صبح ہوتے ہی وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کیا۔ اس نے کہا کہ آج سے آپ میری طرف سے آزاد ہیں۔ اگر آپ اسی گھر میں قیام کریں تو میری خوش نصیبی ہوگی مگر نہ آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں، تاہم اگر آپ یہاں سے کوچ کر جانے کا فیصلہ کرتی ہیں تو میری جس ایک درخواست ہے کہ میری طرف سے کی جانے والی تمام زیادتیوں کو اس ذات کے صدقے معاف کر دیں، جس کی آپ راتوں کو جاگ جاگ کر عبادت کرتی ہیں۔

بی بی رابعہ کو کسی نے بازار حسن میں فروخت کر دیا۔ خدا داد حسن کی وجہ سے لوگوں کا جھوم رہنے لگا۔ جو شخص نانکے سے معاملہ طے کر کے رات کو جاتا وہ تھوڑی دیر بعد کمرے سے عجیب کیفیت کے ساتھ باہر چلا جاتا۔ کافی دن گزر گئے تو نانکے نے محسوس کیا جو شخص ایک بار آتا ہے وہ واپس نہیں آتا۔

ایک رات اس نے چھپ کر کمرے میں جھانکا تو حیران رہ گئی کہ اندھیرے میں بی بی صاحبہ کا جسم نور کے جسے کی طرح روشن ہے۔ اس نظارے سے اس کی کیفیت غیر ہوئی۔ صبح سویرے بی بی صاحبہ کے پاس آئی اور قدموں میں کر کر معافی طلب کی۔ کہا، ”خدا را میرا قصور معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ آج سے آپ آزاد ہیں۔“

بی بی صاحبہ نے فرمایا۔ ”اری امتی! تو نے مجھے

آزاد کر کے جاری فیض کو ختم کر دیا۔“ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ایک بار نماز کے بعد میں بی بی رابعہ بصری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بی بی صاحبہ نے کھانا پکانے کے لیے گوشت ہانڈی میں ڈال کر جو پلے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ ہم سے گفتگو میں مشغول ہو گئیں۔ نماز مغرب کے بعد بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ رات کے وقت آپ کھانے کے لیے روئی اور پانی لے کر بیٹھیں تو اچانک ہانڈی کا خیال آیا کہ اس میں بہت دیر سے ساکن پک رہا ہے اور خیال آیا کہ جل گیا ہوگا۔ دیکھا تو نہایت عمدہ گوشت پکا ہوا موجود ہے۔ بی بی صاحبہ نے وہ گوشت ہمیں بھی کھلایا۔ ایسا لذیذ ساکن ہم نے بھی نہ کھایا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصری جذب کی حالت بصرہ کی گلیوں میں ایک ہاتھ میں شعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی لیے جا رہی تھیں۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ کیا کرنے جا رہی ہیں؟ تو رابعہ بصری نے جواب دیا کہ میں اس آگ سے جنت کو جلانے اور اس پانی سے دوزخ کی آگ بجھانے جا رہی ہوں، تاکہ لوگ اپنے معبود حقیقی کی پرستش جنت کی لالچ یا دوزخ کے خوف سے نہ کریں، بلکہ لوگوں کی عبادت کا مقصد محض اللہ کی محبت بن جائے۔

حضرت رابعہ بصری دن رات کا اکثر حصہ نماز میں گزارتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ بخدا اتنی نماز کے قیام سے میری غرض ثواب حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ یہ چند گنتیں اس لیے ادا کرتی ہوں کہ قیامت کے دن دوسرے انبیائے کرام کے سامنے سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرما کر سرخرو ہوں کہ یہ نماز میری امت میں سے ایک عورت کی ہے۔

حضرت رابعہ بصری سے کسی نے سوال کیا آپ نے شادی نہیں کی کیا آپ کو شیطان سے ڈر نہیں لگتا؟ حضرت صاحبہ نے فرمایا، ”مجھے رحمان سے ہی فرصت نہیں۔“ جب رحمان سے ہی فرصت نہیں تو شیطان کا خیال ہی نہیں آتا۔

☆☆☆☆☆

یا کولڈ فیئر؟

آں..... چھوڑو میرا بازو، نہیں جانا میں نے، مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا، ڈر لگتا ہے، یہ کہہ کر وہ اندر بھاگی تو بھائی وکی نے کہا بیٹا، جو ادھیک کہہ رہا ہے، تمہیں ساتھ جانا ہوگا، اور ڈرنے کی ضرورت نہیں، ہم سب ساتھ ہی تو ہیں، یہ کہہ کر وہ.....

(آخری قسط)

شبیمہ منظر را، نجھا

کیا تو بہت کچھ ہے ایویں تو میری بہن، بچاری کا دماغ خراب نہیں ہوا ناں، لاہور جاتا ہے تو پلٹ کے خبر تک نہیں لیتا، خرچہ نہیں بھیجتا، بچے بچارے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں، امی تو شروع ہو گئیں لیکن میں نے ٹوک کے پھر سوال داغا، لیکن یہ یہاں کیوں نہیں رہتے؟ ان کو چاہئے کہ اپنے بیوی بچوں کے پاس رہیں، ارے وہی تو بتا رہی ہوں ناں، یہاں لوگوں سے قرضہ لے کر بھاگا ہوا ہے، لاکھوں روپے ہمارے بھائیوں کے نام پہ لوگوں سے قرضے کے نام پہ پھوڑے ہوئے ہیں، پٹھانوں کے پیسے دینے ہیں شہر میں سب کے سامنے داخل ہوتا گیا تو پکڑا جائے گا، کتنے لاکھ تو بھائی غفور نے اس کا قرضہ اتارا ہے یہ پھر چڑھا لیتا ہے، اور نویدہ کو اندر سے وہی غصہ ہے اس کھٹو پہ، آں۔۔۔ پھر تو خالہ بچی ہے بھی، ہانڈی چڑھاتے ہوئے میں نے خالہ سے ہمدردی کی، لیکن کان اوپر سے آنے والی آوازوں پہ لگے ہوئے تھے، کافی شور و غوغا

کیونکہ کھانا بنانا تھا، میں نے روٹی تو بے پڑا لی اور دوسرا بیڑا اہانے لگی اسی اثناء میں پھر حمزہ بھاگتا ہوا آیا، آئی آئی خالہ نے اوپر آگ لگا دی ہے، ہائے میرے اللہ، خالو عنایت کو آگ لگا دی کیا؟ جی خالو کو کپڑوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ حمزہ پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا لیکن میں ساس کو آوازیں دینے لگی وہ کمرے میں جا چکی تھیں، میں پیچھے بھاگی امی امی اوپر جانیں فوراً، حمزہ کہہ کر گیا ہے کہ خالہ نویدہ نے خالو عنایت کو آگ

لگا دی ہے، خالہ ساجدہ اپنے گھر کپڑے لینے گئی ہوئی تھیں، امی اور میں اوپر بھاگیں کیونکہ واقعتاً جلنے کی بو آ رہی تھی۔ جب اوپر پہنچی تو میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، خالہ نے سچ سچ آگ لگا لی ہوئی تھی اور اس قدر زیادہ آگ تھی کہ شعلے لپک کر



کو جلایا ہے، آپ اور امی کمال کرتی ہیں، وہ زندہ سلامت اندر بیٹھا ہوا ہے، علی بھی ہمارا شور سن کر پاس آ گئے، ہم دونوں حیران ہو گئیں، پھر خجالت سی محسوس ہونے لگی کہ بچے کی بات کو لے کر اتنا شور مچایا وہ واپس پلٹ گیا تو ہم دونوں بھی مطمئن ہو گئیں، جو اد نے علی کو ہمارا بلنڈر سنایا تو وہ ہنسنے لگے، او یا خالو کو اندر بٹھایا ہوا ہے۔ میں نے بات کاٹ کر پوچھا تو پھر یہ کیا جل رہا ہے؟ میں خالو کو خود دیکھنا چاہتی ہوں، ارے نہیں نہیں ابھی ان سے تم نہیں مل سکتی، نیچے چلو میں آ کر سب بتاتا ہوں، کہتے ساتھ ہی مجھے سیڑھیوں کی طرف موڑ دیا مجبوراً میں ڈھیلے قدموں سے پھر واپس آ گئی

☆.....☆.....☆

بعد کے واقعات کے مطابق علی نے بتایا کہ خالو عنایت کو جب خالو نویدہ پتھر اور اینٹیں مار مار کر تھک گئی تو پار پھر بھی نہیں مانی، دائیں سائیڈ کی دیوار کی بڑھی ہوئی اینٹوں سے اوپر چڑھنے لگی اس کوشش میں کتنی ہی بار گری کبھی بالائی اور کبھی جھٹکے پھلا گئی، ہم سب منع کرتے تو ہمیں چھڑی لے کر پڑ جاتی، آخر وہ کی بھائی نے کہا خالو ہم خالو کو نیچے لے آتے ہیں لیکن ایک شرط پر؟ کیا شرط ہے تیری نکلو؟ خالو نے وہی بھائی کے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کیا، ہم پھپھسی ہنسی ہنس پڑے تو انھوں نے شرمندہ ہو کر کہا خالو کو اس شرط پر نیچے لایا جائے گا کہ تم اسے کچھ نہیں کہو گی، منظور ہے؟ میں اسے جلا دوں گی، یہ بہت برا ہے، اس نے شدید غصے سے جواب دیا، تب بلال نے کہا تو پھر ٹھیک ہے خالو کو ہم چھت کے اوپر سے بھگا دیتے ہیں، خالو کسی شعلے کی طرح اس کی طرف لپکی ہی تھی کہ خالو علیم نے خالو نویدہ کو ڈانٹا، اپنی حد میں رہو اور اس بات کی گارنٹی دو کہ عنایت

کو کچھ نہیں کہو گی پھر وہ نیچے آئے گا اور ہم اسے کوئی اور سزا دیں گے، خالو نے سر نیچے کر کے خاموشی اختیار کی جس کا مطلب تھا کہ وہ ہماری بات مان رہی ہے، جیسے ہی خالو عنایت کو نیچے اتارا گیا خالو نے اچانک اس پر جھٹکا مارا اور سیدھا اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا ہم سارے ہونٹوں کی طرح یہ سب ہوتا دیکھ رہے تھے، کہ خالو نے اس کا گریبان چاک کر ڈالا، وہ خالو کو ایسے بھنبھوڑ رہی تھی کہ گویا مار ہی ڈالے گی بازوؤں سے بھی لمبیں تار تار ہو گئی اور ساتھ ہی اس نے خالو کی شلوار کے پانچے بھی ادھیڑ ڈالے، ہم لوگ حیران تھے کہ بظاہر تو خالو ہاتھوں سے حملہ کر رہی ہے لیکن یوں کپڑے پھٹنے لگتا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں چھریاں لگی ہیں، خالو جب شلوار کے پیچھے پڑی تو خالو عنایت آگے بھاگ پڑا، خالو پیچھے پیچھے، اور ہم سب کا ہنس کر برا حال تھا، اوہ وہ تو اس کی عزت کی دھن بن گئی، آپ نے روکا نہیں خالو کو؟ میں نے غصے سے کہا تو علی کہنے لگے ہم کیا روکتے اسے، یوں لگتا تھا کہ خالو کے ہاتھ میں کوئی نادیہ چھری ہے جو کسی کا سینہ بھی چاک کر دے گی، اس لیے ہم نے خالو کو ایک بھیا تک مشورہ دیا، کیا؟ میں نے ہولناک انداز سے پوچھا، وہ یہ کہ خالو اپنے کپڑے خالو کو اتار کے دے دیں، جی جی، اتنے گندے مشورے؟ ضرور آپ نے ہی دیے ہونگے، میں نے شک بھری نظروں سے علی کو دیکھا تو وہ تملتا ہی گئے، بیوی صاحبہ، ہم سب نے یہ فیصلہ خالو کی نفسیات کے پیش نظر کیا تھا، اس لیے کہ وہ بار بار کہہ رہی تھی میں عنایت کو جلا دوں گی، اور جب وہ اس کے کپڑوں کو جلانے لگی جو کہ پہلے ہی پھٹ چکے تھے تو خود بخود اسے سکون آ جائے گا، اس

لیے اور والے کمرے میں خالو کو گھسا کے اسے دکی کے کپڑے دیے اور خالو کے کپڑوں کے سارے ٹکڑے خالو نویدہ کے حوالے کر دیے اس نے فناف کا م والے میلے کپڑوں کو آگ دکھائی اور ساتھ ہی خوشی سے نعرے مارنے شروع کر دیے کہ میں نے عنایت کو جلا ڈالا ہے، اسی اثناء میں تم اور امی اوپر آ گئے اور باقی کہانی وہی ہے یہ سب سن کر مجھے تو خالو نویدہ سے شدید خوف محسوس ہوا کیونکہ وہ تو کسی کو بھی آرام سے مار ڈالے اور لمبیں بھی نہ ہو، جبر جبری آتے ہی میں اپنے آپ میں سمٹ کر سونے لگی کیونکہ صبح بھی ناٹم سے اٹھنا تھا

☆.....☆.....☆

زندگی جب ڈھنگ پھٹی، نہ کوئی سکون تھا اور نہ ہی خوشی تھی، گھر میں پریشانیوں کا ڈیرا تھا، خالو ساری رات بین کرتی تھی، نہ خود سوتی تھی اور نہ ہمیں سونے دیتی، اونچا اونچا روتی رہتی، خالو عنایت کو اب بھی بہت اذیت دیتی تھی، کبھی کہتی کھڑے ہو جاؤ اور کبھی کہتی بیٹھے رہو، ایک دن تو اس نے حد کر دی، دوانی کھانے لگی تو خالو عنایت نے پانی کا گلاس پکڑا یا، بس بیٹھے بٹھائے خالو کا دماغ گھوما اور اس کو سمیٹنے سے پکڑ کر پاس بٹھا لیا، ہاں اوئے تو مجھے دوانی کھلاتا ہے؟ تیرے کہنے سے میں دوانی کھا لوں گی؟ نہیں بھی نہیں، میں یہ دوانی آج تیرے سنبھے (حلق) میں اتاروں گی، اس پر وحشت طاری ہوئی اور خالو کو چار پائی یہ بٹھا کے خود کھڑی ہو گئی، پڑیا پہلے سے کھلی ہوئی تھی اس نے سر کے پیچھے ہاتھ رکھ کے خالو کو رعب سے کہا عنایت منہ کھول، خالو جی تھوڑا جھجکے تو خالو نے دوسرے ہاتھ سے جبڑے پکڑ کے خود کھولے اور دوانی حلق سے پار ہو گئی خالو

تڑپنے لگے۔ عنایت ہوش کر، ساری دوا کی کھا، ابھی تو ایک خوراک رہتی ہے، اٹھ جا شربت لی، لیکن خالو دنیا فینہا سے بے خبر ہو گئے، ان کی گردن ڈھلک گئی اور آنکھیں بند ہو گئیں، ہائیں اسے کیا ہوا؟ سو بھی گیا، اس دوا کی میں اتنا سکون ہے تو پہلے ہی لے لیتا ایک خوراک، جاہل آدمی۔۔۔۔۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر کی طرف چل دی۔

☆.....☆.....☆

تقریباً ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا، آرام آ کے نہیں دے رہا تھا، ہم روحانی علاج کروا رہے تھے لیکن پیر فقیر بھی ہمیں تو لوٹنے والے ہی ملے، کوئی کہتا کہ انھیں پھل پیری چڑیل ہے کوئی کہتا کہ خالو نویدہ کے ساتھ پوری سولا لاکھ جنوں کی پھسی ہے، کسی نے کہا کہ خالو کسی کچی جگہ (جہاں جنوں چڑیلوں کے ڈیرے ہوتے ہیں) سے گزری ہے یا اس سے کوئی بے ادبی ہوئی ہے، غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور جتنی بیماریاں اتنے علاج بتائے جاتے، ہم لوگ اکتا گئے لیکن خالو کے جوش جذبے میں ابھی تک فرق نہیں آیا تھا، جس گھر میں خالو رہتی تھی وہاں کسی بزرگ کے زمانے سے پرانا پتیل لگا ہوا ہے، سنا ہے ایک کھمستان نامی بزرگ نے وہ درخت لگایا تھا، وہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک بار اس درخت والی جگہ پر وہ بابا جی بیٹھے ہوئے غالباً اپنے موشیوں کے لیے کلمہ گاڑ رہے تھے ان کا یہ روٹھن کا کام تھا، پاس سے کچھ ہندو عورتیں گزریں اور مذاق سے کہا بابا جی آپ تو ادھر کلمہ اس طرح روز گاڑتے ہیں جیسے یہاں کلمہ نہیں پتیل کا درخت اگے گا، یہ کہہ کر وہ ہنسی کھٹھول کرتی آ گئے چلی گئیں لیکن بابا جی نے لوگوں کے سامنے جلال میں آ کر کہا کہ اگے تے

نہیں پرہن کڑیے اتھے پتیل ای اگے گا، وہ بانی
بھر کر واپس آئیں تو ٹھیک اسی جگہ ہرا بھرا گھٹا
پتیل کا درخت اُگا کھڑا تھا، تب لوگوں کے
سامنے بابا جی کا پردہ ظاہر ہوا، زمانے بیٹے لیکن
اس درخت کو وہاں سے کوئی بھی اکھاڑ نہ سکا بلکہ
اس کی چھال کو پانی میں بھگو کر رکھیں اور وہ پانی بعد
از کچھ وقت پی لیں تو دائمی بخار سے آرام آ جاتا
کرتے کرتے وہ گھر خالہ نویدہ کے والد نے خریدا
اور وہی پتیل کا درخت آج خالہ نویدہ کے گھر میں
تھا، سنا ہے کہ وہاں متعدد بار کسی بزرگ کو دیکھا گیا
ہے چھت پہ اس پتیل کی چھاؤں میں بھی
بیزھیوں میں، بھی درخت کے اوپر، کئی دفعہ بچوں
کو اس بزرگ نے کھانے کی چیزیں بھی
دیں، ایک بار کی تو میں خود گواہ بھی ہوں، خالہ
نویدہ کے گھر میلاد پہ ہم لوگ گئے تھے راولپنڈی
سے مہمان آئے ہوئے تھے انکے بچے چھت پہ
کھیل رہے تھے میلاد ختم ہونے والا تھا ابھی کھانا
کسی کو بھی نہیں ملا تھا، بچے چھت سے نیچے آئے تو
ان کے ہاتھوں میں بہت سی کھانے کی چیزیں
تھیں، ان کی ماں کی نظر پڑی تو اس نے ڈانٹا خاور
یہ کس نے چیز لے کر دی ہے؟ تم نے پھر کسی سے
پیسے لے کر چیز لی ہے؟ نہیں امی مجھے تو بابا جی نے
چیز لے کر دی ہے۔ ہائیں، کون سے بابا جی؟ امی وہ
چھت پہ بیٹھے ہیں ان کی بہت سفید داڑھی ہے
آئیں میں آپ کو دکھاتا ہوں، اس کی امی ساتھ گئی
کہ دیکھوں تو سہی کون سے بابا جی اس پہ مہربان ہو
گئے ہیں، جا کر دیکھا تو چھت خالی تھا کوئی بابا جی
کہیں پہ بھی نہ تھے، جب انھوں نے نیچے آ کر یہ
واقعہ سنایا تو خالہ نویدہ کے گھر والوں کے ساتھ
ساتھ محلے والوں نے بھی گواہی دی کہ یہ بابا
گھمستان ہیں کیونکہ وہ متعدد لوگوں کو بے خبری

دیکھا تو ہنسنے لگے، جواد میاں تم ڈراؤنے کم اور
مزاحیہ زیادہ لگ رہے ہو اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تم
سے خالہ نویدہ کے جن ڈر جائیں گے تو یہ تمہاری
بھول ہے بچے، چل خالہ کی ویسے ہی منت ساجت
کریں علی نے ناسحانہ انداز سے کہا اور اٹھ
کھڑے ہوئے، ان کی باتیں سن کر جواد کے
چہرے پہ مایوسی پھیل گئی، چپ چاپ دونوں خالہ
والے کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں انکے داخل
ہوتے ہی بھونچال آ گیا، خالہ نے بہت عجیب
حرکت کی، پٹنی پہ بیٹھے بیٹھے نیچے فرش پہ چھلانگ
لگائی اور سیدھا جواد کے قدموں میں جاگری
، مرشد مرشد میرے مرشد میں آپ کو ہی یاد کر رہی تھی
، آپ کہاں چلے گئے تھے؟ ان لوگوں نے مجھے
بہت ستایا ہے، میں آپ کی ہر بات مانوں گی میرے
بچے چھت پہ لٹکے ہوئے ہیں آپ ان کو قید سے
چھڑائیں میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گی
، میرے تن بھاگ میرے مرشد، میرے تن بھاگ
میرے سائیں۔۔۔۔۔ مجھے یہاں سے دور لے
جائیں میں آپ کی باندی ہوں میں آپ کی داسی ہوں
میرے آقا چلو چلیں یہاں سے دور چلیں، آ آپ
مجھے لینے آئے ہیں ناں، اس کی تو حالت سمجھ سے
باہر تھی، جواد اور علی بھونچکے کھڑے تھے سارے گھر
والے یہ تماشا دیکھ کے ششدر ہو گئے، وہ آہ و
زاری کرتی رہی، ہاڑے ڈالتی رہی۔ اور تبھی علی
نے جواد کے کان میں کہا یا تم نے کیا ڈرامہ کرنا تھا
ادھر تو نیا سین شروع ہو گیا ہے، تجھے تو بیٹھے
بٹھائے فقیر مل گئی ہے، بڑے ٹکڑے مرید ملے
ہیں، او بھائی علی یا رکیا آئیڈیا دیا ہے، بس آپ
چپ رہنا، جواد نے نظر بھر کر خالہ کی طرف دیکھا
جو کہ اس کے پاؤں میں لوٹ رہی تھی، اور بھی اس
کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا، وہ دیوانہ دار اوپر ہو کر اپنے

مرشد کا ہاتھ چومنے لگی، میں صدقے میں واری
میں قربان میرے پیر پہ میں ان سب کی جان
قربان کر دوں اس نے ہم سب کی طرف اشارہ
کیا تو ڈر کر ہم چند قدم پیچھے ہو گئے، بھلا ہماری
جان کیوں قربان کر دے گی، اپنی کرے ناں،
اب جواد پہ سب کی نظریں گڑی ہوئی تھیں کہ پتہ
نہیں اس نے کیا سوچا ہوا تھا جو یہ واقعی پیر بن گیا
تھا، اس نے ایسے ہی جیسی کالی چادر اوڑھ رکھی
تھی اور اس میں سے ذرا سامنے نکال کر دیکھ رہا تھا
، اے نویدہ بی بی چل اٹھ کھڑی ہو جا، بڑے نانک
کر لیے ہیں تم نے، اس نے موٹی آواز نکال کر کہا
تو ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی لیکن حیرت کی بات تھی
کہ اب کی بار خالہ نویدہ نے ہماری ہنسی کو نوٹس
نہیں کیا تھا۔ اچھا سارکاری میں کھڑی ہو گئی ساتھ
ہی خالہ تن کرو فیوں کی طرح کھڑی ہوئی، ان کی
یہ حرکتیں دیکھ کر ہم ہنسنے ہنسنے پاگل ہو رہے تھے
، میں نے غور کیا کہ جواد بھی اندر سے مسکرا رہا تھا
، اسی لیے اس نے منہ پہ شال کر رکھی تھی، نویدہ
میں تجھے جو حکم دوں گا تو مانے گی؟ جواد نے بھاری
آواز سے پوچھا۔ جی مرشد آپ کہو نویدہ کنوئیں
میں چھلانگ لگا تو نویدہ ذرا بھی دیر نہیں کرے گی
، چلو پھر ایک جگہ جانا ہے تیاری کرو ہمارے پاس
وقت کم ہے، یہ کہہ کر جواد کمرے سے نکلا بمشکل
ہنسی روکتے ہوئے جدھر ہم سب تھے ادھر آ کے
شال اتاری اور پرے پھینک دی، ہم سب اس پہ
جھپٹ پڑے، جواد تم نے تو کمال کر دیا اتنی بڑی
بلا کو چھوٹے سے نانک سے قابو کر لیا، اور پتہ ہے
تم تو ایکٹنگ بھی خوب کر رہے تھے میں نے داد
کے ڈونگرے برسائے تو خالہ کہتی واہ جواد
اداکاری تو کوئی تم سے سیکھے، امی کو تو تم نے اپنا
دیوانہ بنا لیا ہے۔ ہنن، ہے جو سودا کا ڈرامے

ہے، کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا، آخر رعب دار آواز میں بولا، اے نویدہ۔۔۔ چل نیچے سے اٹھ ادھر کرسی پہ بیٹھ کے غور سے میری بات سن، نہیں سرکار نہیں، پہلے اس کو واپس بھیجیں، جواد کو غصہ آگیا، تیرا یہ دل ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی یہاں سے چلا جاؤں؟ جواد کے اس طرح مصنوعی غصہ کرنے سے ہم لوگوں کا ہنستہ ہنستہ برا حال ہو رہا تھا، نہیں نہیں، سرکار آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے، میں آپ کی بات مانوں گی، وہ سرعت سے کرسی پہ جا بیٹھی اور برداشت کرتے کرتے ہمارے منہ سے ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑے، کان کھول کر میری بات سنو، اس بندے نے تجھے کچھ بھی نہیں کہا، یہ میرے ساتھ ہی ہوتا ہے اور جو پڑھ رہا ہے ہم نے ہی کہا ہے کہ پڑھ کے تجھ پہ دم کرے، اس دوران اگر تجھے کوئی پریشانی آئی ہے تو اس میں تیرا ہی فائدہ ہے چھلپے، آخری بات کہتے کہتے جواد نے لہجہ دھیمہ کر لیا اور خالہ نویدہ کے کان کے ساتھ منہ لگا کے نہ جانے آہستہ آہستہ کیا کہا کہ وہ ناصر ف رام ہوگئی بلکہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے نیم دراز ہوگئی، مرشد پاک! آپ بھی میرے پاس بیٹھ جائیں مجھے اس کالے منہ والے پہ یقین نہیں ہے یہ کچھ الناسید حانہ پڑھے آپ میرے پاس ہی بیٹھ جائیں خالہ نے بیچارے اصلی پیر صاحب کی اچھی خاصی بے عزتی کی لیکن وہ خاموشی سے اپنے کام میں مگن تھے، جواد بھی مجبوراً ہانیہ کا فون آف کر کے خالہ کے پاس بیٹھ گیا، ہم لوگ صحن میں بیٹھے آہستہ آواز میں گپ شپ کر رہے تھے، جواد پیروں تک شال اوڑھے دوسری کرسی پہ بیٹھا باہر ہم لوگوں کو دیکھنے لگا تھوڑی دیر بعد بور ہوا تو فیس بک کھول کے بیٹھ گیا، پیر صاحب نے دم کر کے پانی خالہ کے منہ کو

لگا دیا وہ اب شور نہیں کر رہی تھی، بلکہ جب چاب ان کی باتوں کو مان رہی تھی، اب شاید کوئی حصار کھینچا جا رہا تھا، خالہ پر سکون کرسی پہ آنکھیں موندے لپٹی تھی، جواد نے دیکھا کہ اب خالہ حصار سے باہر نہیں نکل سکتی تو وہ آہستہ آہستہ اٹھا کمرے سے غیر محسوس طریقے سے باہر نکلا اور ہم لوگوں کے پاس سے تیزی سے گزر کر باہر چلا گیا، علی نے آواز دی، اوئے جواد کدھر جا رہے ہو، وہ پیچھے دیکھے بغیر تیزی سے آگے بڑھتا گیا، علی بھی اس کے تعاقب میں چلے گئے، جواد۔۔۔ جواد یار رکو تو سہی، کہاں جا رہے ہو؟ اس کے نزدیک پہنچ کر علی نے اکھڑی سانسون میں بات کی، نہیں علی بھائی میں نہیں رک سکتا عجیب ڈرامہ ہے میں ہانپا کو وقت نہیں دے پار ہا مجھے گھر جا کر اسے بھی منانا ہے، یہ مسئلہ تو پتہ نہیں کب ختم ہوگا، بات کرتے کرتے وہ ست روی سے چلنے لگا، ٹھیک ہے یار، مجھے تو خود نیند آئی ہوئی ہے، چل میں بھی گھر چلتا ہوں، علی اور جواد واپس گھر چلے گئے، بہت سکون آور ماحول تھا کیونکہ سارے ادھر چھوٹے گھر گئے ہوئے تھے اور پہلی بار یہ خاموشی دونوں بھائیوں کو بہت بھائی، علی جاتے ہی سو گئے اور جواد ہانپا کے ساتھ بات کرنے لگا تقریباً ایک گھنٹہ اس کے ساتھ بات کی اور تب جا کر اس کی ناراضگی ختم ہوئی، وہ چونکہ باہر رہتی تھی اس لیے وقت کا فرق تھا ادھر رات بھیک رہی تھی دس بجے عمو سب سونے چلے جاتے اور وہ ڈیوٹی آف کر کے اس وقت ٹرام پکڑ کے گھر جانے والی ہوتی، کچھ دیر بعد بات کرنے کے وعدے کے ساتھ دونوں نے فون آف کر دیا، اپنے کمرے میں شال لپیٹے جواد فیس بک چلا رہا تھا کیونکہ اسے ہانیہ کے فون کا انتظار ہو کر نا تھا، کچھ دیر بعد علی نے

اس کے دروازے کو ناک کیا، جواد جواد، یار دروازہ کھولو تمہارے لیے فون ہے، کس کا فون ہے؟ ہانیہ سے ابھی تو بات ہوئی ہے بڑ بڑاتے ہوئے اس نے بے دلی سے دروازہ کھولا تو علی جلدی سے اندر چلے گئے یار ہم ادھر سے آتے گئے ہیں لیکن خالہ نویدہ پھر قابو سے باہر ہوگئی ہے، ان پیر صاحب نے کہا ہے کہ انھیں کھانا کھلاؤ وہ کھانا نہیں کھا رہی بس مرشد مرشد کہہ کے روتی جا رہی ہے، اب وکی بھائی نے فون کیا ہے کہ ایک دفعہ جواد کو بولو آ کے خالہ کو کھانا کھلا جائے، سنتے ہی اس نے تو بات کرنے سے انکار کر دیا علی نے کافی منت سماجت کی لیکن وہ وہاں جانے سے انکاری رہا، آخر وکی نے کہا کہ تم نہ آؤ لیکن خالہ سے فون یہ تو بات کر لو، کیا پتہ وہ مان ہی جائے اس تجویز سے جواد نے اتفاق کیا اور فون کان سے لگا لیا، اے نویدہ بی بی سنا ہے تو کھانا نہیں کھاتی؟ جواد کی اتنی موٹی آواز سن کر علی ہنستے ہنستے بیڈ پہ لیٹ گئے اور منہ پہ تکیہ رکھ لیا، جی سرکار جی جی آپ کہاں چلے گئے ہیں آپ کے بغیر میں کیا کھاؤں پیوں، آپ آ جائیں اور اس کالے منہ والے سے میری جان چھڑائیں، آپ آئیں گے تو روٹی کھاؤں گی، اے پاگل عورت ہمیں اور کام بھی ہوتے ہیں، ضروری کالیں کرنا ہوتی ہیں، لوگوں سے رابطہ رکھنے ہوتے ہیں، ساری دنیا پہ نظر رکھی پڑتی ہے، ساتھ ساتھ ہانپاں ہاتھ سے وہ تیزی سے فیس بک کے کسی گروپ چیٹ میں کمٹ ٹائپ کر رہا تھا، اب ہم صرف تیرے لیے تو اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے، دیکھ کچھ کیبنے لوگوں کو جواب دینا بے حد ضروری ہوتا ہے، تو روٹی کھا اور میں دشمنوں کے منہ بند کر کے انھی آتا ہوں، جی مرشد پاک میں ابھی کھانا کھاتی ہوں آپ

جلدی سے آ کے مجھے۔۔۔ لائین کاٹ کے جواد اور علی کا ہنس ہنس کر برا حال ہونے لگا، دونوں بیڈ پہ گرے یوں دھاڑ دھاڑ کے ہنس رہے تھے کہ کمرہ جی دہلنے لگا

☆.....☆.....☆

خالہ کو رات کی نسبت کچھ آرام تھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ رات کو کھانا کھا کے وہ فوراً سو گئی تھی، اور دن کے دس بج رہے تھے ابھی تک نہیں جاگی تھی، ہم لوگ خوش تھے کہ چلو آرام کر لے خالہ، ہم بھی اتنے میں اپنے کام نبٹا لیں، علی کی پھوپھو بھی ان دنوں ملنے آئی ہوئی تھیں وہ گاؤں سے تھیں اس لیے حقہ پیتی تھیں، چھت پہ ایک سائیڈ پہ آگ جلا کر وہ حقہ بنا رہی تھیں، میں نے جلدی جلدی صفائی سہرائی کر لی کیونکہ لوگ خالہ نویدہ کی خیریت پوچھنے صبح صبح آ جاتے تھے، میں فرش صاف کر رہی تھی کہ کمرے سے اوپچی آواز میں کچھ پڑھنے کی آواز آئی، یوں جیسے سبق پڑھا جا رہا ہو، یہ کون پڑھ رہا ہے؟ میں اندر جھانک کر دیکھ ہی رہی تھی کہ خالہ نویدہ کی گر جدار آواز گونجی اے کون ہے تو؟ میں ڈر کے پیچھے ہٹ گئی تو بجلی کے کوندے سے بھی تیزی سے خالہ میرے پیچھے ہال میں آگئی میں نے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی اس کے ہاتھ میں مجزوں والی وہ کتاب تھی جو میری ساس جھرات کو پڑھا کرتی تھیں، ایک ہاتھ میں وہ مجزہ پکڑے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ میں جوتا پکڑ کے مجھے ڈرانے لکھ رہی تھی، یہ دیکھ کے مجھے اس سے ڈر کیا لگتا اللہ پاک سے ڈر لگنے لگا کہ وہ ہمیں بھی اور اسے بھی معاف کریں، جو بھی تھا مجزے کی کتاب میں پاک ہستیوں کے نام تھے، لیکن وہ ہوش سے بیگانہ پاکی ناپاکی میں فرق نہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھی، اے

کڑیے، میری کتاب تو پڑھ میں بیٹھ کے سنوں گی، جب تک میرے مرشدوں کا اور دس بیسیوں کا ظہور نہ ہو جائے اسکو پڑھتے جانا ہے پڑھتے جانا ہے پڑھتے تے تے تے۔۔۔ جانا ہے، اور یاد رکھ، جس وقت تو رک گئی میں تجھے جلا دوں گی۔ کسی صورت بھی رکنا نہیں ہے، میری تو کھٹکی بندھ گئی، مجرہ پکڑ کر میں تھر تھر کا پٹنے لگی، خالہ نے دوبارہ مجھے زور سے ڈانٹا تو میں التاسید حایر ہنا شروع ہو گئی، مجال ہے کہ وہ مجھے خالو سانس بھی لینے دے رہی ہو، نہ بیٹھنے دے رہی تھی نہ رکنے دے رہی تھی، میں سب کو کوس رہی تھی کہ کہاں چلے گئے ہیں میری جان ہی نہیں چھٹ رہی تھی، مجرے بھی پڑھ پڑھ کر ختم ہو گئے تھے میں نے بتانا چاہا۔۔۔ خ۔۔۔ خالہ، مجرے پڑھ لیے ہیں، کیا کہا؟ تو پھر رک گئی؟ بولا ہے زور سے اس کو پڑھ۔۔۔ جب خالہ پھر دھاڑی تو میں نے روتے ہوئے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا، اتنے میں باہر کا گیٹ زور سے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی، تھوڑی دیر بعد ہال میں انکل علیم اور بلال بھائی داخل ہوئے انکل نے آکر میرا حال دیکھا تو خالہ کو ڈانٹنے لگے کہ لڑکی کو کس چیز کی سزا دے رہی ہو؟ خالہ جوابا کہتی ہے یہ پڑھے گی تو میرے مرشد آجائیں گے، اے اے اے۔۔۔ تو پھر رک گئی؟ چل پڑھ مجرہ، میں جلدی جلدی پڑھنے لگی، چھت کی سیڑھیوں سے پھو پھو جلا ڈال کر نیچے اتر رہی تھی، خالہ نے جب اسے دیکھا تو شور مچا دیا وہ دیکھو میری بی بی آگئی ہیں، میری پاک بی بی (نعوذ باللہ) آپ کدھر تھی اوپر کہاں تھی تھیں آپ؟ دیکھو دیکھو سب، یہ میری پاک بی بی آگئی ہیں، علیم باء جی میں نے سچ کہا تھا کہ یہ لڑکی مجرہ پڑھے گی تو میرے سارے مجرے

ہوئے مجھ سے آن ملیں گے، یہ سن کر بھائی بلال سے تو ہنسی نہ روکی گئی وہ اونچے قہقہے لگانے لگا، میں نے بلال کو اشارہ کیا کہ میری جان چھڑاؤ، وہ اٹھا اور اس نے ایک غیر متوقع حرکت کر ڈالی دانتوں میں انگلی دا بے میں حیرت سے دیکھتی رہی، وہ خالہ نویدہ کے ارد گرد لڑیاں ڈالنے لگا، پتہ نہیں کیوں خالہ کوشید دورہ پڑ گیا ادھر بھائی بلال ناچ ناچ کے ناچتا رہا شاید اس لیے کہ اس وقت ہم سب خود کو بے بسی کی عجیب انتہا پہ محسوس کر رہے تھے، اسے اس عالم میں اور تو کچھ نہ سوچا اٹھ کے لڑی ڈانس شروع کر دیا جب بھائی بلال باز نہ آیا تو خالہ اس پہ حملہ کرنے کو دوڑی، وہ یقیناً اس صورتحال کے لیے تیار تھا، تیزی سے چھلانگ لگائی اور سیڑھیوں سے نیچے آئی سمارٹ سی پھوپھو کو حقے سمیت اٹھا کر واپس چھت پہ بھاگ گیا، خالہ پیچھے دوڑی تو انکل علیم نے ان کو پکڑ لیا، میں بھی اس سارے ڈرامے سے جکے سے نکل کے سامنے والے کمرے میں بھاگ گئی، خالہ تو بوڑھے سے انکل علیم سے قابو ہی نہ آئے، سوئے ہوئے سب جاگے اور پھر وہ ہاتھ پائی ہوئی کہہ رہے نام اللہ کا،

☆.....☆.....☆

کل خالہ نویدہ کے بھائی کا باہر سے فون آیا تھا، وہ اس کے لیے بہت پریشان تھے، چونکہ باہر (انگلینڈ) رہتے تھے اس لیے جن یا بھوت پریت یہ ان کا کوئی یقین نہیں تھا، ساری کیس ہسٹری سن کر انھوں نے فتویٰ دیا کہ میری بہن پاگل ہو گئی ہے اس لیے اسے راولپنڈی کے بڑے ہسپتال میں علاج کے لیے بھیجا جائے، کوئی پیر فقیر نہیں اور کوئی دم درو نہیں، بس آج ہی نویدہ کو راولپنڈی لے جاؤ، تم لوگوں نے بہت وقت ضائع کر دیا

ہے، میں بیٹھے بیٹھتا ہوں اور تم لوگ گاڑی کا اربنچ کر کے نکلنے کی تیاری کرو، یہ ساری باتیں سن کر خالو علیم نے کہا بھائی جان بات تو سچ کہتے ہیں، امی نے کہا جیسے بھائی کہتے ہیں ویسے ہی کر لیتے ہیں گھر پہ تو کافی علاج کر دئے ہیں، جن ٹکنا ہوتا تو اب تک نکل چکا ہوتا۔ اسے اب بجلی کے جھکے لگوانے کی ضرورت ہے، جو ادے نہ کہا امی بجلی کے جھکوں کے بعد خالہ ٹھیک ہو جائے گی؟ ہاں بیٹا میری بہن کے دماغ پہ جو بوجھ ہے وہ بجلی کے جھکوں کے بعد ختم ہو جائے گا، اس کا دماغ ہلکا پھلکا ہو جائے گا، امی اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑانے میں مگن تھیں، اوہ، شکر ہے، میری تو جان چھوٹ جائے گی، کیوں تیری جان کیوں چھوٹ جائے گی؟ جو ادے کے جواب پہ امی نے کھور کر سوال کیا، وہ ہر وقت مجھے جو اپنا مرشد کہتی رہتی ہے، مرشد پاک مرشد سائیں اور پتہ نہیں کیسی کیسی باتیں کرتی ہے سچ کہہ رہا ہوں امی میں اب اس سب سے تنگ آ گیا ہوں، خالہ کو جلدی ہسپتال بھیجیں، اس کے اس طرح کہنے پہ امی بھی خاموش ہو گئیں، کیونکہ وہ بھی توجہ ہی نہ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام تک خالہ کے کپڑوں کی ساری پیکنگ ہو گئی، خالو، سا جو نہیں جاری تھیں، انھیں ڈر لگتا تھا، ان کے علاوہ باقی سارے بڑے جا رہے تھے، امی کچھ دن خالہ کے پاس رہ کے آجائیں گی پھر دوسری خالہ جائیں گی، خالو عنایت ساتھ ہی جا رہے تھے، وہ دونوں بہنیں میرے پاس ہی رک گئیں، علی اور جو اد بھی گھر ہی تھے، جس دن یہ لوگ گئے تھے علی اس دن کوئی پڑھائی کرنے چھت پہ بیٹھے تاکہ خالہ نویدہ کے ساتھ اس کے اثرات بھی ہمارے گھر سے چلے جائیں (وظیفہ یا

چلے کرتے رہتے ہیں)، ہم سب نیچے میرے کمرے میں تھے، علی نے مجھے اوپر بلوا بھیجا، میں گئی تو وہ دیا جلائے کچھ پڑھ رہے تھے، میں نے تو کمرے میں جانے سے انکار کر دیا، وہ مجھے اشارہ کر رہے تھے کہ اندر آؤ لیکن میں سخت وحشت زدہ ہو رہی تھی، میں نے تو صاف انکار کر دیا، انھیں بھی شدید غصہ آیا اور دیا جلا کے جو حصار بنایا تھا اپنے اوپر لی ہوئی شال کا پلو ڈال کے وہ آدھی پڑھائی درمیان میں چھوڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے، حصار توڑ دیا تو میں اور ڈر گئی، تجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں بول نہیں سکتا تھا اشارے سے یہ بنانا چاہ رہا تھا کہ۔۔۔ اوہ کمرے کی چھت سے اینٹوں والے موٹے موٹے نکرے نیچے گرے تو لوہے کی بڑی چادر پہ گرنے کی وجہ سے بہت اونچی آواز پیدا ہوئی، میرا فو کس علی کی بات سے ہٹ گیا، اوہ یہ پڑوسیوں کے بچے رات کے وقت بھی آرام نہیں کرنے دیتے انچی کل ہی تو امی نے ان کی شکایت اٹکے گھر والوں سے کی تھی آپ رکیتے میں ان کو ڈانٹ کر آئی، میں اٹھنے ہی لگی کہ انھوں نے سرعت سے مجھے پکڑ کے اپنے ساتھ لگا لیا میں نے متوقع خطرے کے پیش نظر لرز کے پوچھا کیا ہوا؟ انھوں نے کہا کہ باہر گر نہیں ٹکنا جب تک میں نہ کہوں، باہر کون ہے؟ میں نے گھکھکاتے ہوئے پوچھا تو علی تجھ جلا گئے، جو حصار باندھ کے تمھاری وجہ سے توڑا ہے، وہ ہی اب حساب لینے آ گئے ہیں، میں نے جب یہ سنا تو میری ٹانگوں میں جان ختم ہو گئی، میں علی کے بازوؤں میں جھولنے لگی، میرے لیے تو یہ بات ہی جان لیوا تھی کہ جنات نے چھت سے پتھر پھینکے ہیں، ابھی وہ مجھے سنبھال ہی رہے تھے کہ دوبارہ ایک بوچھاڑ آئی، میں نے انھیں زور سے پکڑ لیا، لیکن اب کے وہ

مجھے خود سے الگ کر کے باہر جانے لگے میں نے روک لیا تو کہتے کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا میں نے پڑھائی کی ہوئی ہے صرف تمہاری فکر ہے، اور جب تک میں نہ کہوں باہر مت آنا، وہ چھت پہ سامنے کھلے میں چلے گئے اور میں دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپک کے کھڑی ہو گئی، پانچ منٹ گزر گئے لیکن علی کمرے میں نہیں آئے تھے، میں سخت بے چین تھی، کچھ ہمت پیدا کی اور باہر دیکھنے کے لیے تھوڑا آگے ہوئی، وہ چھڑی پکڑ کے کچھ پڑھ رہے تھے اور اس طرح چھڑی کو حرکت دے رہے تھے جیسے کسی کو ہانک رہے ہوں، یا راستہ صاف کر رہے ہوں کچھ دیر بعد کمرے میں آئے، مجھ پہ کچھ پڑھ کے پھونکا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کہا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ جگہ صاف ہے تم کنارے کنارے چلتی نیچے چلی جاؤ، میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجھے سیڑھیوں تک چھوڑا، میں نے بھیگی آنکھوں سے انھیں دیکھ کے کہا آپ بھی آجاؤ تو مسکرا کے کہتے پریشان مت ہو میں ٹھیک رہوں گا اور بس تھوڑی دیر میں نیچے آ رہا ہوں، ساتھ ہی مجھے ہلکا سا ایک سیڑھی نیچے ڈھیل دیا، میں نیچے آئی تو سارے خوش گپیوں میں مگن تھے، میرے آتے ہی سا جو کہتی بھابھی اور پر شور کیسا تھا، میں نے چونک کر پوچھا کیسا شور؟ وہ ہی، جیسے بہت زیادہ غنکر یا پتھر ایک ساتھ گرے ہوں۔۔۔۔۔ سب نے وہ آواز ہی سنیں؟ میرے احمقانہ سوال پہ جواد نے قہقہہ لگایا، بھابھی کیسی بات کرتی ہیں، اتنی زوردار آوازیں تھیں ظاہر ہے ہم سب نے ہی سنی ہیں، بلکہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ جاتے ہی آپ نے بھائی کے ساتھ پھنڈا ڈال دیا ہے۔ اس کی بات پہ خالو سا جو گلا پھاڑ کے ہنسنے لگیں، تب میں نے دھیرے دھیرے ساری بات ان لوگوں

پہ ہو گئیں اور جواد کو ساتھ صوفے پہ میں نے لٹا دیا، اس کا بہت آسرا تھا، یہ بتائی چلوں کہ علی سیڑھیوں کے پاس چار پانی بچھا کے سوئے تھے، ہم لوگ تقریباً ایک دو بجے تک جاگتے رہے پھر ایک ایک کر کے سب سو گئے، اس طرح کی نیند میں انسان تنہا سے چور ہوتا ہے نہ کوئی خواب آتا ہے اور نہ ہی آنکھ کھلتی ہے، اس لیے صبح سارے لیٹ جاگے، پہلے میری ہی آنکھ کھلی جلدی سے اٹھی، منہ دھویا اور پہن میں ٹھس گئی، ناشتہ بناتے بناتے میں نے سب کو آوازیں دے دے کر جگا دیا تھا۔ جب ہم لوگ ناشتے کی ٹیبل پہ بیٹھے تو ساجو کو ابھی بھی نیند کے جھٹکے لگ رہے تھے، جواد نے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے پیچھے کھڑے ہو کر لمبی لمبی جمائیاں لیتی ہوئی ساجو پہ پانی کا پورا جگ انڈیل دیا، فروری کے درمیانی دن تھے اور شند بھی آج کافی تھی، ساجو چیخیں مارنے لگی، جن جن جن۔۔۔۔۔ ہائے مجھ پہ چڑیل نے پیشاب کر دیا ہے، ہائے خالو میں مر گئی، وہ تو اٹھ کر کووندے لگی اور ہم سب کی آنکھوں سے ہنس ہنس کے مانی بہہ رہا تھا، پھر خالدہ کو خیال آیا اس نے اٹھ کر بہن کا چہرہ خشک کیا اور اندر لے جا کر خشک کپڑے دیے، جواد میرے بچے ایسی شرارتیں تھوڑی کرتے ہیں اگر اب اسے بخار ہو گیا تو۔۔؟ علی نے سرزنش کی تو جواد مسکرا کر کہنے لگا بھائی کچھ نہیں ہوتا اس کی نیند ایسے ہی ختم ہونا تھی، اب دیکھنا ڈٹ کر ناشتہ کرے گی، کیونکہ ایک تو پورے ہوش میں ہے دوسرے وہ پورے غصے میں ہے، ہم سب اس کی لالچک یہ مسکرا دیئے۔

☆.....☆.....☆

ساجو نے جواد کی پیشین گوئی کے مطابق

واقعی پوری طرح جاگ کے اور منہ پھلا کے فل غصے میں ٹکڑا ناشتہ کیا تھا، میں نے اچھی سی سڑاٹک جائے بنا کے دی تو اس کا غصہ پل میں ختم ہو گیا، بھانجھی رات کو علی بھائی جاگ رہے تھے؟ اس نے مجھ سے پوچھا، کیوں؟ وہ تو ہم سب سے پہلے سونے چلے گئے تھے، یاد نہیں ہے کیا؟ نہیں اس کے بعد جب ہم سو رہے تھے تو کمرے میں جب وہ آئے تھے، شاید آپ سے انھیں کچھ کام تھا؟ اور آپ سو رہی تھیں، یہ نہیں، مجھے واقعی علم نہیں ہے، ویسے تم کیوں اتنی میٹیشن لے رہی ہو؟ میں نے ازراہ مذاق پوچھا، بھابھی شاید تہجد کے بعد کا وقت تھا اور کمرے میں بھائی علی آئے ہیں انھوں نے لائٹ بھی جلائی تھی اور کافی دیر ہم سب کو گھور گھور کر دیکھتے رہے تھے، میں جاگ گئی تھی، جب میں نے دیکھا تو خاموشی سے باہر چلے گئے تھے، اس کی بات سن کر دل کو کچھ ہوا تو ضرور لیکن میں نے کہا وہ رات کو اکثر جاگ جاتے ہیں اور چکر وغیرہ لگاتے رہتے ہیں، پریشان مت ہو آتے ہیں تو میں ابھی پوچھ لیتی ہوں، ابھی ہم لوگ یہ بات کر رہی رہے تھے کہ علی بھی آفس جانے کے لیے کمرے سے باہر آئے، میں نے سب کے سامنے من و عن یہ سوال ان کے سامنے دھرا تو وہ حیرت سے میرا منہ نکلنے لگے، زہرا تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تھا کہ ہوا لیٹوں تو نہیں جاگتا اور پھر نین چار بجے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، خواجہ خواجہ کے وہم دل میں نہ پالا کہ اور پلیئر اب ریلیکس ہو جاؤ، رات والا واقعہ بھول جاؤ، دیکھئے لہجے میں اپنی بات کہہ کے جب وہ باہر چلے گئے تو ہم سب پھر سر پکڑ کر بیٹھ گئے، سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ وہ علی نہیں تھے تو پھر آخر ان کے روپ میں کون تھا جو ہم سوئے ہوؤں کو بغور دیکھ رہا

تھا، ساجدہ کہہ رہی تھی کہ کمرے کی جی بھی بند تھی اور ملحقہ باتھ روم کی جی آن تھی، دروازے میں کتنی دیر وہ کھڑا بھی رہا تھا، جسے وہ لیجھ رہی تھی، آخر وہ کون تھا جو ہمارے کمرے تک آ پہنچا تھا، خالد نویدہ یہ ہمارے علم کے مطابق جن تھے، لیکن ان کی بعض حرکتوں سے لگتا تھا کہ وہ محض ذہنی بیمار ہے، اسی لیے وہ ہسپتال بھیج دی گئی تھی، ہم چند گھنٹوں کے لیے ہی بریلیکس ہوئے تھے، نامعلوم یہ کون تھا جو خالد کے جاتے ہی ہمارے گھر ظاہر ہو گیا تھا، کیا واقعی یہ خالد نویدہ کے جنوں کی باقیات تھی جو اب ہمیں خوفزدہ کر رہی تھی؟ ساجو کی بات کے بعد ہم سب شدید متاثر ہوئے، مجھے تو اس حد تک خوف محسوس ہو رہا تھا کہ اگر علی جاب پہ ہوں اور ان کے روپ میں پھر کوئی اور میرے گھر آ گیا تو۔۔۔؟ خالدہ ساجدہ اپنے گھر چلی جائیں جو اب بھی گھر نہ ہو اور امی لوگ اتنی دور راولپنڈی گئے ہوئے ہوں، اس صورت میں وہی سب وقوع پذیر ہو تو کیا مجھے زندہ چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا مجھے اذیت نہیں دی جائے گی؟ ہال کے وسط میں کھڑی ہو کر میں گہری سوچوں میں گم تھی، کچن سارا سیٹنے والا تھا، باہر کا دروازہ بجاتا تو میں دوڑتی ہوئی گئی اور دروازہ کھول دیا، ساتھ والوں کا لڑکا باہر کھڑا تھا، بابی، بابی اگلے موڑ پہ علی بھائی کی کسی کی بایک کے ساتھ لکر ہوئی ہے اور وہ سڑک پہ گرے ہوئے ہیں مزل پہ کہہ کے بھاگ گیا اور میں جس حال میں تھی پریشانی کے مارے ایسے ہی اس کے پیچھے دوڑی، گھر میں کسی کو بھی بتانا ذہن میں نہ رہا، موڑ پہ پہنچی تو پانچ چھ لوگ اکٹھے ہوئے تھے، میں ان کو ہٹا کے درمیان میں پہنچی تو علی زخمی حالت میں زمین پہ گرے ہوئے تھے، میں نے نیچے بیٹھ کے ان کا سر گود میں رکھ لیا، کیا ہوا آپکو، صبح تو اچھے

بھلے گھر سے نکلے تھے، اور یہ آپکے کپڑے۔۔۔۔؟ علی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور میری کلائی پہ اپنا ہاتھ رکھ کے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، میں انکے ماتھے پہ آئی چوٹ کو پریشانی سے دیکھ رہی تھی، جان کیوں ہلکان کر رہی ہو میں ٹھیک ہوں، ادھر دیکھو میری طرف، میں نے جب علی کی آنکھوں میں دیکھا تو بڑی عجیب الجھن ہوئی، یوں جیسے یہ علی نہ ہوں، تبھی میں نے انکے کپڑے دیکھے تو اور پریشان ہو گئی کیونکہ صبح جب گھر سے گئے تھے تب تو کپڑے نیلے رنگ کے تھے اور اب براؤن رنگ کے تھے، آنکے کپ۔۔۔ کپڑے۔۔۔؟ میں ششدر تھی، یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپکے اپنے کپڑے کہاں ہیں؟ میں نے چلا کر پوچھا تو انھوں نے میری کلائی سے پکڑ کے مجھے کھینچا اور نزدیک کر کے سرگوشی کی، رات میں تمہارے کمرے میں آیا اور تم سوئی ہوئی تھی، جنھیں میرا انتظار کرنا چاہیے تھا، ساجدہ نہ جاگتی تو میں نے جنھیں آواز دینا تھی۔۔۔۔ وہ علی نہیں تھے، بلکہ یہ وہی سایہ تھا جو رات کو ساجو کو نظر آیا تھا اور اب جسم میرے سامنے میری کلائی پکڑے بات کر رہا تھا میں بت بنی اس کی باتیں سن رہی تھی اور بند دماغ کے باعث حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی، سنو آج میں پھر آؤں گا اور تم نہ جاگی تو ساجو سے ہی بات کر لوں گا، مجھے علی نے بہت تنگ کیا ہے کل، اس کا بدلہ مجھے تم دوگی۔۔۔ اس نے جب یہ بات کی تو میرا ذہن غصے کے مارے کام کرنے لگا، کیونکہ میرا ماننا ہے کہ غصے میں انسان کی طاقت عود کر آتی ہے، اس سے بازو چھڑایا اور پسینے سے شرابور میں اٹنے قدموں واپس بھاگی، اس کے بھیا تک قہقہے میرا تعاقب کر رہے تھے، سانس بری طرح پھول

گیا، بہ شکل تمام میں اپنے دروازے تک پہنچی تو جو اب مجھے ڈھونڈتا ہوا باہر کی طرف آ رہا تھا، بھابھی۔۔۔ بھابھی کہاں چلی گئی ہو آپ؟ مجھے اپنے براؤن کپڑے نہیں مل رہے ڈھونڈ کے پرلیں۔۔۔ وہ بول رہا تھا اور میں دروازے میں جا گری، کیا ہوا آپکو، کہاں سے آ رہی ہو آپ؟ چہرہ پسینے سے بیجا ہوا اور رنگ ہلدی کی طرح۔۔۔ اس نے مجھے دروازے کی چوکھٹ سے اٹھایا، جو اب ادھر۔۔۔ ادھر علی کے روپ میں۔۔۔ ساجو ٹھیک کہتی تھی، وہ علی کی شکل میں تمہارے کپڑے اس نے پہنے ہوئے۔۔۔ اسے آدمی ادھوری بات سمجھ آئی اور مجھے دروازے کے اندر دھکیل کر باہر کی طرف بھاگا۔۔۔ میں نے کمزور لیچے میں اسے پکارا۔۔۔ مت جاؤ جو اب۔۔۔ وہ جنھیں کچھ کہہ دے گا۔۔۔ میں خود کلائی کر رہی تھی لیکن اتنی سکت نہیں تھی کہ میں خود سے اٹھ سکوں اور جا کے دیکھوں وہ جو اب کوئی نقصان نہ پہنچا دے، ابھی تو خالو ساجو کو بھی پکارنے کی ہمت نہ تھی، جو اب ابھی قدموں سے بھاگتا ہوا واپس آیا بھابھی کمال کرتی ہو مجھے تو کوئی چیز بھی کہیں نظر نہیں آئی، سڑک ویران پڑی ہے، آپکو کسی نے بہکایا ہے، آں۔۔۔ ہاں ہاں جو اب یہ ساتھ والوں کا مزل بلانے آیا تھا، اس سے پوچھو ذرا، یہ گواہی دے گا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں، وہ پھر پلٹ کر ساتھ والوں کے گیٹ پہ پہنچ گیا، ناک کیا اندر سے کسی نے پوچھا کون ہے تو جو اب نے کہا آئی ذرا مزل کو بلا دیں اس سے کام ہے انھوں نے کہا بیٹا وہ تو کل سے اپنی خالہ کی طرف گیا ہوا ہے، یہ سننا تھا کہ جو اب چونک اٹھا، وہ بھاگتا ہوا گھر آیا اور مجھے اندر ہونے کا کہہ کر جلدی سے گیٹ بھر کر دیا، بھابھی

وہ کون تھا مجھے سچ بتائیں کہ واقعی بھائی علی کے روپ میں کوئی ہمارے گھر پہ نظر رکھے ہوئے ہے؟ میں نے ہال میں آکر جو اب کو خالو ساجو کے سامنے ساری بات بتائی، آخر وہ کون ہے، کیوں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے اور وہ چاہتا کیا ہے؟ ہم سر جوڑے اسی سوچ میں تھے کہ چھت پہ کسی کے چلنے کی آواز آئی، قدم گھٹ رہے تھے، سا۔۔۔ جو میں نے رات کو آنا تھا تو ابھی آ گیا، چھت کے درمیان میں جو روشن تھا اس کے قریب آواز آئی، خوف کے مارے ہم لوگ اندر بھاگے، اور جو اب چھت پہ بھاگ نکلا، میں پکارتی رہ گئی لیکن وہ ان سنی کرتے ہوئے جا چکا تھا۔۔۔ ہم تینوں چیخ رہی تھیں، قیامت پانچ گھنٹوں اور پرناسٹا طاری تھا ایسے لگ رہا تھا جیسے اوپر کوئی بھی موجود نہیں ہے، میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور روتے ہوئے سڑھیاں چڑھنے لگی، خالدہ مجھے پکڑنے کو پکلی۔

لیکن مجھے جو اب کی فکر تھی، میں نے اسے جھٹکا اور چھت پہ جا پہنچی، میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ دنیا کے آنکھوں تجو بے سم نہ تھا، گنگ ہو کر میں آنکھیں پھاڑے دیکھے جا رہی تھی۔۔۔۔ کاش میں جو اب کو اوپر نہ آنے دیتی، میرے سر میں دھواں جمع تھا اور جو میں دیکھ چکی تھی جگر پھٹ جاتا تو بھی عجب نہ تھا، میری زندگی کا شاید اختتام قریب تھا، سارے مناظر دیکھ دیکھ کے آخر میں نیچے گر پڑی لگ رہا تھا کہ آج ہم سب مارے جائیں گے، شاید میں بے ہوش ہو رہی تھی، سارے مناظر دھندلا رہے تھے، دھند گہری ہوئی تو اندر اچھا گیا اور۔۔۔ میرا وجود مکمل تاریکی کا حصہ بن گیا۔

☆☆☆☆

ڈیرہ اللہ یار سے ارسال کردہ پراسرار تحریر

جن کا انتقام

جن بھی انسانوں کی طرح انتقامی جذبات رکھتے ہیں

تبھی تو مولوی مقبول کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالا.....

سائل ابڑو

”کہو بیٹا کیسی طبیعت ہے؟“ میں کہہ کر اپنے بیٹے قیصر کے برابر بیٹھا۔ قیصر نے مجھے گھور کر دیکھا اور تلخ لہجے میں کہا۔

”آپ کی ہمت کیسے ہوئی میرے برابر میں بیٹھنے کی؟ انھیں اور سامنے بیٹھ کر بات کریں۔“ اس کے انداز اور زبان سے مجھے بھی شک ہوا کہ معاملہ کچھ خراب ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے قیصر پر ایک سچ کی سی کیفیت طاری ہوئی اور اس کے ہاتھ پاؤں اٹھنے لگے اور وہ لیٹتا چلا گیا۔

میں نے اور ناتھ نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ پاؤں سہلائے۔ تھوڑی دیر بعد قیصر ٹھیک ہو گیا۔ وہ رونے لگا اور اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ قیصر کی یہ عجیب و غریب بیماری میری بھی دماغی پریشانی کا باعث بن کر رہ گئی تھی۔

قیصر تین چار مہینے سے بیمار تھا۔ چند روز شدت کا بخار رہا اور پھر اس پر یہی کیفیت طاری

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ”ہاں بس قیصر کی طرف سے پریشان ہوں۔“

میں بھنگن سے زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ بولی۔

”بابو جی! اس کا علاج حکیموں کے پاس نہیں ہے۔ میری ماں تو اسے مولوی مقبول کے پاس لے جاؤ۔“

”مولوی مقبول جو دو گلی چھوڑ کر رہتے ہیں؟“ ”ہاں بابو جی وہی۔ وہ کالا علم کا توڑ جانتے ہیں، ان کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ ایسا تعویذ لکھ کر دیتے ہیں کہ کیسا ہی بیمار ہو، کیسا ہی مسئلہ ہو، اللہ کے حکم سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بڑی دور

سے لوگ آتے ہیں ان کے پاس اور اپنی مراد پاتے ہیں۔“

وہ اپنی ٹوکری پاس رکھ کر بولی۔ ”پھر تو واقعی کمال ہے ان کے ہاتھ میں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

بھنگن نے مجھے متاثر دیکھا تو کہا۔ ”کمال سا کمال بابو جی۔ وہ جو اپنے یاسر صاحب ہیں نا، ان کی بیوی کی اور ان کے پڑوس کے امین صاحب کی بیگم میں جھڑپ ہو گئی۔ یاسر صاحب کی بیوی امین صاحب کی بیگم کو بہت کوس رہی تھی کہ انہوں نے ان کا پلا پلا یا مرغنا کاٹ کے کھالیا۔ بہت گالم گلوچ ہوئی، بات اتنی بڑھ گئی کہ امین صاحب کی بیگم نے قسم کھائی کہ تو نے میری بے عزتی کی ہے،



اچھا نہیں کیا۔ تین مہینے کے اندر اندر تیرے بیٹے کو ختم نہ کروایا تو میں بھی اپنے باپ کی بیٹی نہیں۔ بابو جی مجھے سب حال معلوم ہے۔ قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ٹھیک تین مہینے بعد یاسر صاحب کا گھر وساپچہ لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ہائے ہائے۔“ بھنگن کانپ گئی۔

”ارے سچ سچ مر گیا بیچارہ؟ یہ تو بڑا ظلم ہو گیا۔ کیا زہر دلوادیا اسے؟“

”زہر نہیں بابو جی! کا لے علم کے زور سے۔ میں امین صاحب کی بیگم کے گھر بھی جاتی ہوں۔ وہ مجھے پان تبا کو کھلا دیتی ہے۔

جمہرات کی رونی میں کبھی ناغہ نہیں کرتی۔ میں دو گھڑی بیٹھ کر بات بھی کر لیتی ہوں، میں نے ایک دن انہیں یاسر صاحب کی بیوی والی لڑائی یاد دلائی تو وہ بولی کہ میں نہیں بھولنے والی ہوں۔ اللہ چاہے تو میرا کلیجہ جلد ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”بابو جی میں تو ڈرنے لگی کہ ہائے ہائے یہ کیا کر بیٹھے گی اب۔ اسی خیال سے ایک دن یاسر صاحب کے ہاں چلی گئی۔ ان کی بیوی بہت اداس تھی، اس نے مجھے بہت سا آنا اور پانچ سو روپے خیرات کے دیے۔ میں نے جاتے ہوئے جب ان کے بیٹے کو دیکھا تو سچ کہتی ہوں کہ وہ گول منول سا بچہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا تھا۔ تو بہ تو بہ کر کے کہتی ہوں کہ بالکل بے جان لگ رہا تھا۔ معصوم بچے کی یہ حالت دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ پھر دوبارہ بولی۔

”پھر یاسر صاحب کے بیٹے کی موت کے وقت جب وہاں تھی تو مولوی صاحب نے ان

کے بیٹے کی صورت دیکھ کر یہی کہا تھا کہ کسی نے بڑا سخت علم کروایا ہوا تھا۔ اگر یاسر صاحب ان سے بروقت رابطہ کر لیتے تو وہ یقیناً اس بچے کی جان بچا سکتے تھے۔

بعد میں مولوی صاحب نے بتایا کہ کالا علم بہت زور آور تھا، کسی نے بیٹنگن میں علم پڑھ کر اس میں کانٹے چھوئے تھے، جوں جوں وہ بیٹنگن سوکتا گیا، یاسر صاحب کے بیٹے کا جسم بھی سوکتا گیا۔ آخر سوکانے پورے ہونے پر اس کا انتقال ہو گیا۔ میرے جی میں آیا کہ سب کو ساری بات بتا دوں مگر پھر میں ڈر گئی کہ اگر امین صاحب کی بیگم کو پتہ چل گیا تو وہ میرے اوپر بھی کوئی جادو نو نہ نہ کر دے۔

بابو جی مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ اپنی کہہ کر بھنگن مجھے سلام کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس کی باتیں میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ مجھے اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ عورتیں ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ کیا پتہ کہ بھنگن نے مجھے متاثر کرنے کے لیے یہ بات خود ہی گھڑی ہو۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ ڈاکٹروں حکیموں کو بہت آزما چکے۔

چلو مولوی مقبول کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ اسی شام عصر و مغرب کے درمیان میں قیصر کو لے کر مولوی مقبول کے مکان پر پہنچ گیا۔ دستک دینے پر مولوی صاحب بہ نفس نفیس باہر تشریف لائے۔ ان کے سراپے پر نظر پڑتے ہی میں ان کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور بے اختیار میرے دل سے آواز اٹھی کہ یقیناً اللہ کا ان پر کوئی خاص کرم ہے۔

سفید شلوار امین میں ملبوس، پچاس کے قریب سن، عاجزی اور احترام بھرا انداز، چہرے پر نور

کا احاطہ تھا۔ میں نے سلام کر کے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

اور قیصر کو چار پائی پر لٹا دیا۔ وہ ایک لمحہ اسے غور سے دیکھتے رہے پھر میری طرف دیکھ کر دھتے لہجے میں بولے۔

”بہت دیر کر دی برخود دار۔ اس کا حال تو بہت برا ہو چکا ہے۔ اب خبر لی ہے تم نے؟“

”جی بہت عرصے سے علاج معالجہ ہو رہا تھا مگر آرام نہیں آ رہا تھا۔“

”آرام کیسے آتا۔ اس کی تو جان پکڑی ہوئی ہے۔ ایسے میں کوئی دوا کیسے اثر کرتی۔“

میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ ”کس نے جان پکڑی ہوئی ہے مولوی صاحب اور کیوں پکڑی ہوئی ہے؟“

”ابھی پتہ لگ جاتا ہے۔“ کہہ کر مولوی صاحب اندر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹی سے پیالی میں تھوڑا سا روغن لیے ہوئے باہر آئے۔

قیصر کے سر ہانے بیٹھ کر کتنی ہی دیر کچھ پڑھ کر دم کیا۔ پھر روغن قیصر کے کانوں اور ناک کے نتھوں میں لگایا۔ روغن کی خوشبودار ماغ میں پختہ ہی قیصر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مولوی صاحب نے جلدی جلدی پڑھ کر پھونکیں مارنی شروع کر دیں۔ قیصر کا جسم اینٹھتا رہا۔ سچ کی سی کیفیت ہوتی رہی۔ اور میں حیرت و استعجاب سے یہ رد عمل دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قیصر کا چہرہ ہنسمانے لگا۔ وہ ایک تڑپ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور چلائے لگا۔

”مجھے جانے دو۔“

مولوی صاحب کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔

وہ بڑے پروقار لہجے میں بولے۔

”ہرگز نہیں جانے دوں گا۔ بتاؤ تم کون ہو؟“

قیصر کا جیسے گلا گھٹ رہا تھا۔ اس کی رگیں تن گئی تھیں۔

جسم میں ایک زبردست کھنچاؤ تھا۔ وہ بڑی کشمکش کے بعد بولا۔

”میرا نام عمیر ہے۔“

”ہوں۔“ مولوی صاحب کرخت لہجے میں بولے۔ ”تم اس معصوم بچے کو کیوں پریشان کر رہے ہو؟“

”اس نے میرے بچے کی ٹانگ توڑ دی تھی۔“

”ٹانگ توڑ دی تھی؟ وہ کیسے؟“

”ان کے مکان کے قریب پرانے پینپل کی جڑ میں ہمارا ٹھکانہ ہے۔ ایک روز میرا بچہ وہاں کھیل رہا تھا کہ اس نے وہاں اسے ٹھوکر ماری۔ میرے بچے نے اس کی ٹانگ پکڑ لی تو اس نے پتھر اٹھا کر مارا۔ اپنے بچے کے بلبلانے پر میں آیا اور اسے پکڑ لیا۔“

”مگر تمہارا بچہ تو اس غریب کو دکھائی ہی نہیں دیا ہوگا۔ وہ اس کے راستے میں آیا ہی کیوں تھا۔ بہر صورت اب تو اسے کافی سزا مل چکی ہے۔ تمہارا بدلہ برابر ہو گیا۔ اب اس کی جان چھوڑ دو۔“

”نہیں ہرگز نہیں۔ میرے بچے کی حالت نازک ہے۔ اس وہ مر گیا تو میں اس کی بھی جان لے لوں گا۔“

مولوی صاحب یہ سن کر جوش میں آ گئے اور گرج کر بولے۔

”یہ نوبت نہیں آنے پائے گی۔ اس سے پہلے

میں تمہارا خاتمہ کر دوں گا۔ تم شاید مجھ سے واقف نہیں ہو۔ کان کھول کر سن لو یا تو ایک ہفتے کے اندر اس کا پچھا چھوڑ دو ورنہ میں تمہارا دل کر دوں گا۔
”یہ نہیں ہوگا۔“
”یہی ہوگا۔“

”اچھا ابھی مجھے جانے دو۔“
”جاؤ۔“ مولوی صاحب نے اسے آزاد کیا۔

میں خواب کی سی حالت میں ان کی صورتیں تک رہا تھا۔ آنکھیں دیکھ رہی تھی مگر دل اسے فریب نظر کھ رہا تھا۔

کان یہ عجیب و غریب مکالمہ سن رہے تھے مگر دماغ یقین کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مولوی صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ قیصر بے ہوش ہو گیا تھا، ہوش میں آکر منہ بسور رہا تھا۔ اس کے کزور سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

مولوی صاحب نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

”میں تعویذ لکھ کر دے دیتا ہوں۔ وہ بیچ کے گلے میں باندھ دینا، اول تو وہ نہیں آئے گا اگر پھر بھی آجائے تو فوراً بیچ کو میرے پاس لے آنا۔“

مولوی صاحب اندر تعویذ لکھنے چلے گئے تو قیصر سے میں نے بہت سوال کیے مگر وہ مکر ٹکر میری طرف دیکھنے لگا۔

مولوی صاحب نے تعویذ لا کر دیا اور ہم وہاں سے چلے آئے۔

گھر آکر میں نے تعویذ قیصر کے گلے میں باندھنا چاہا تو وہ تڑپنے لگا۔ میں نے زبردستی باندھ دیا تو اس نے کھینچ کھانچ کر دھاگہ توڑ دیا

اور تعویذ گلے سے نوح کر دوڑ پھینک دیا۔ میری بیوی ڈر گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔

”اس وقت زبردستی نہ کرو، بیچہ کزور ہے۔ جب سو جائے گا تو میں چپکے سے باندھ دوں گی۔“

جب قیصر گہری نیند سو گیا تو جونہی اس کے گلے میں تعویذ ڈالا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ پہلے کی طرح چیخنے لگا۔

ایسے موقع پر نہ جانے اس کی کزور ہڈیوں میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے کہ وہ ہم دونوں میاں بیوی کے قابو میں نہ آتا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں جا کر سارا ماجرا بیان کیا۔ وہ بولے۔

”بہت ضدی اور مغرور معلوم ہوتا ہے۔ اس کا علاج کرنا ہی پڑے گا۔ تم ایسا کرو کہ جمعرات کی رات کو ایک لمبا گھیا لے کر بیچ کے ساتھ لٹا دو اور صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ گھیا اور بیچ کو لے کر میرے پاس آجاؤ۔ انشاء اللہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں اس مشورے پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے لوٹ آیا۔ جمعرات آئی ور رات وہ گھیا جو اس مقصد کے لیے پہلے ہی لا کر رکھ دیا تھا، بے خبر سوئے ہوئے قیصر کے پہلو میں ڈال دیا لیکن وہ ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے ٹھیکے کو دھکیلتے لگا۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر گھیا چار پائی سے ہٹا لیا گیا۔ جب دوبارہ سو گیا تو آہستہ سے پھر گھیا اس کے پہلو میں لٹا دیا گیا۔ وہ پہلے کی طرح پھر اٹھ گیا اور وہی حرکتیں شروع کر دی۔ دونوں میاں بیوی بہت حیران تھے۔

اسی کشمکش میں رات بیت گئی۔ اسی طرح صبح

ہوتے ہی میں قیصر اور گھیا لے کر مولوی صاحب کے مکان پر جا پہنچا۔

انہوں نے مجھے اندر بلا لیا، مولانی کو چائے بنانے کے لیے کہا۔ اور ایک آنکھیں گرم کرائی، اس کے قریب وہ بوری بچھا کر ایک طرف وہ خود بیٹھ گئے اور سامنے مجھے بٹھالیا۔ آنکھیں میں دھکتے ہوئے کونٹے تھے۔

مولوی صاحب نے ایک پڑیا سے آگ پر عود لوہان چڑکا۔ ایک تیز خوشبو کا بھپکا اٹھا اور کمرے میں تحلیل ہو گیا۔ ماحول بہت پر اسرار سا ہو گیا۔ میں نے قیصر کی طرف دیکھا اور کسی لاشعوری احساس کے تحت اسے کیلچے سے لگا کر بھیج لیا۔

مولوی صاحب چھری ہلا کر سامنے رکھتے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے آنکھیں میں عودہ لوہان بھی چڑک دیتے، آخر انہوں نے چھری آگ میں ڈالی۔ قیصر کا جسم کاپٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت جھلکنے لگی۔

جوں جوں چھری سرخ ہوتی گئی، قیصر کا خوف و ہراس بڑھتا چلا گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ مجھ پر بھی خوف طاری ہو گیا۔ مولوی صاحب نے چھری کے دستے پر ہاتھ ڈالا تو قیصر چیخ مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔

مولوی صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ اسے مضبوطی سے پکڑ کر رکھوں۔ میں نے قیصر پر اپنی گرفت مضبوط کر لی مگر وہ اس قیدی کی طرح چلنے اور تڑپنے لگا جیسے جلاد پھانسی کے تختے پر لے جا رہے ہوں۔

مولوی صاحب کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ ایک ہی بار انہوں نے دھکتی ہوئی چھری کھیسے میں گھسا دی۔ قیصر نے ایک دلدوز

چیخ ماری کچھ دیر تک اس کا جسم میری آغوش میں ذبح ہوتے ہوئے دہنے کی طرح تڑپتا رہا اور پھر زور سے جھرجھری لے کر ساکن ہو گیا۔ قیصر کو اپنے ہاتھوں میں یوں بے دم اور نڈھال ہوتے دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔
”مولوی صاحب میرا بچہ۔“

مولوی صاحب مسکرائے، ایک نرم مسکراہٹ۔ ”تمہارا بچہ صحیح سلامت ہے، البتہ جو جن اس کے اوپر حاوی تھا وہ قتل کر دیا گیا ہے۔“
اس دن سے قیصر کو افاقہ ہونے لگا۔ اس کی خوراک معمول پر آگئی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چند دن بعد وہ بالکل تندرست ہو گیا۔

مولوی مقبول کے اس عجیب و غریب علاج نے مجھے الجھن میں ڈال دیا، مجھے خواہ خواہ دلچسپی ہونے لگی کہ مولوی صاحب سے مل کر جنات کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہئے۔

چنانچہ ایک اتوار کو فرصت ملنے ہی میں ان کے ہاں پہنچا، دستک دی تو مولانی صاحبہ دروازے پر آئیں۔

مجھے دیکھتے ہی رونے لگی۔ خدا خیر کرے، کیا ماجرا ہے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے جلدی سے مولوی صاحب کا حال پوچھا تو روتے ہوئے بولیں۔

”بھائی وہ تو اسی دن سے بستر پر پڑے ہیں جس روز تمہارے بچے کا علاج کیا تھا۔ ہر تیسرے چوتھے روز آپ سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو مارتے ہیں اور چلا کر کہتے ہیں کہ تو نے میرے بھائی کو مارا، میں تیری جان لیے بغیر نہیں ٹلوں گا۔“

دنیا جہاں کا علاج کرتے تھے اب ان کا علاج کون کرے گا۔ یہ کہہ کر مجھے اندر لے گئی۔

پاکستانی شوبز

شوبز سے جڑی تہلکہ خیز خبریں.....

اور نئی ریلیزز.....

ادارہ

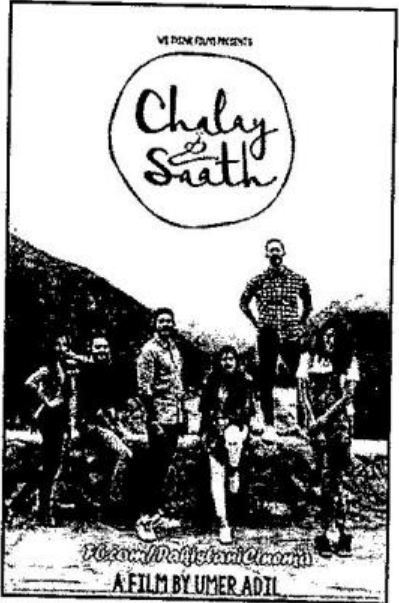
دکھائی جائے گی۔ فلم میں ہمارے پہاڑی علاقوں کی خوبصورتی کو نہایت بہترین انداز میں دکھایا گیا ہے فلم کی دیگر کاسٹ میں منشا پاشا، ژالے سرحدی اور غیر ملکی ہیرو وکیت ایس لی ہیں۔ ساڑھ شہروز بہت Excited ہیں کہ وہ انٹرنیشنل پلیٹ فارم پر پاکستان کی نامدگی کریں گی۔

طیقا ان ٹریل

مکو کہ پیشا شفیق نے پوری کوشش کر لی تھی کہ



چلے تھے ساتھ
ساڑھ شہروز کی فلم چلے تھے ساتھ جو پچھلے سال ریلیز ہوئی تھی SCO فلم فیسٹیول میں



بھیا نک طور پر پوری انسانیت کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

اس کے لیے وہ جو ہدیہ طلب کریں گے میں دینے کو تیار ہوں۔“

اس کے اس طرح مذاق اڑانے سے میں کھسیانا ہو گیا اور اسے قائل کرنے کے لیے کہا۔

”آخر تم جانتے ہو کہ میں ان باتوں ہر اعتقاد نہیں رکھتا تھا مگر آنکھوں دیکھے حال کو کیسے جھوٹ اور فریب مان لوں۔

بہر صورت میں تمہیں کسی زور مولوی صاحب سے ضرور ملو اؤں گا۔“

ایک روز شام کے وقت میں اور اختر ٹہلتے ہوئے مولوی صاحب کے گھر کی طرف نکل گئے۔

گلی میں دو چار آدمی ہمارے قریب سے باتیں کرتے ہوئے گزرے۔

”بھی عجیب بات ہے دیکھنے میں تو بڈیوں کا ڈھانچہ تھے۔ مگر افوہ۔۔۔ میت لکٹی وزنی تھی جیسے

دواؤ دیوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہو۔“ ایک نے کہا۔

دوسرا بولا۔ ”دوہی تھے، ایک وہ دوسرا وہ جن تھا جوان پر سوار تھا۔ قبر تک پہنچا نہیں چھوڑا اس نے بھی اور پھر جان کس مشکل سے نکلی ہے، تڑپ تڑپ کر اور سسک کر۔ تو بہ۔“

میں نے دیکھا۔ مولوی صاحب کے دروازے کے سامنے دری پچھی ہوئی تھی۔ چند بزرگ اور نوجوان بیٹھے تھے۔ وہ بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ایک نوجوان سے

پوچھا کہ۔ ”کس کی میت ہو گئی ہے۔“

اور یہ سن کر کہ مولوی مقبول کا انتقال ہو گیا اور میرے کان میں مولانی کے بین کی آواز گونجنے لگی۔

☆☆.....☆☆

مولوی صاحب بے ہوشی کی حالت میں پڑے تھے۔

ان کا کرتا پیٹھ پر سے ہٹا کر دیکھا تو جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی اور خون رس رہا تھا۔

مولانی پھر سے رونے لگی۔

”رات وہ جن ان کے سر پر سوار ہوا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر میری چیخیں نکل گئی۔ سارے محلہ جمع ہو گیا۔

یا سرمیاں کا اللہ بھلا کرے، اسی وقت بڑی مسجد کے امام صاحب کو بلالائے۔ انہوں نے کچھ دم کیا تو ہوش میں آئے ورنہ شاید خود کو جان سے

مار دیتے۔“

اس ماجرے نے میری حیرت میں حد درجہ اضافہ کر دیا۔

عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی۔ کیا جنات بھی انسانوں کی طرح اشتقامی جذبات کے مالک ہوتے ہیں۔

میرا ذہن فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ کئی دن گزر گئے اسی اثنا میں میری ملاقات اختر سے ہو گئی۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ ایک مدت کے بعد میں اسے دیکھ کر بے تحاشا خوش ہوا اور اس سے لپٹ گیا۔ کافی دیر تک ایک دوسرے کے

حالات سنتے رہے۔ باتوں باتوں میں مولوی صاحب کا بھی ذکر آیا۔ تمام حالات سن کر اختر

خوب ہنسا۔

اور کہنے لگا۔

”بھئی مجھے اس مولوی سے ملو اؤ اگر واقعی

عملیات کے ذریعے ان میں کسی کی جان لینے کی طاقت ہے تو وہ ایک عمل ان امن دشمن شخصیتوں کے لیے بھی پڑھ دیں۔

جنہوں نے آج جنوں بھوتوں سے زیادہ

طیقا ان ٹریل فلاب ہو جائے۔

مگر علی ظفر کی قسمت بہت اچھی ہے فلم کو ضرورت سے زیادہ پذیرائی ملی۔ شائقین سنیما کا کہنا ہے کہ طیقا ان ٹریل بے انتہا دلچسپ فلم ثابت ہوئی اور آئندہ بھی ایسی فلمیں بنی جائیں۔ علی ظفر کے ہمراہ مایا علی ہیں اور اس جوڑی کو دیکھنے والوں نے بہت سراہا۔ ویسے کہنے والے تو کہتے ہیں میٹھا شفیع نے اپنے دوست کی خاطر اتنا بڑا قدم اٹھایا اور ہراساں کرنے کے لیے الزامات لگا کر فلم کو بہت روٹی بخشی۔

Load Wedding

کہا جا رہا ہے کہ لوڈ ویڈنگ عید الاضحیٰ پر ریلیز ہونے والی سب سے بڑی ہٹ فلم ثابت ہوگی۔



اس فلم میں فہد مصطفیٰ کی لوک کو بھی بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ فلم میں فہد نے اپنا چہرہ مویچوں سے سجایا ہوا ہے۔ فلم میں مہوش حیات بھی موجود ہیں اور بہت دلی اسٹائل میں موجود ہیں کچھ ناقدین

کا کہنا یہ بھی ہے کہ لوڈ ویڈنگ کی ضرورت سے زیادہ چلبلی ہو رہی ہے ورنہ یہ لوگ جو تعریفیں کرتے نہیں تھک رہے کہاں تھے اس وقت جب فلم کو ریلیز ہوئی تھی جو واقعی میں دیکھنے والی فلم تھی۔

آپ پر الزام ہے کہ.....

عاطف اسلم پر الزام ہے کہ انہوں نے نیویارک میں یوم پاکستان کے موقع پر ہندوستانی گانا گاکر پاکستانیوں کی دل آزاری تو کی تھی اس پر سونے پر سہاگہ پاکستانی جھنڈا اٹھانے سے بھی



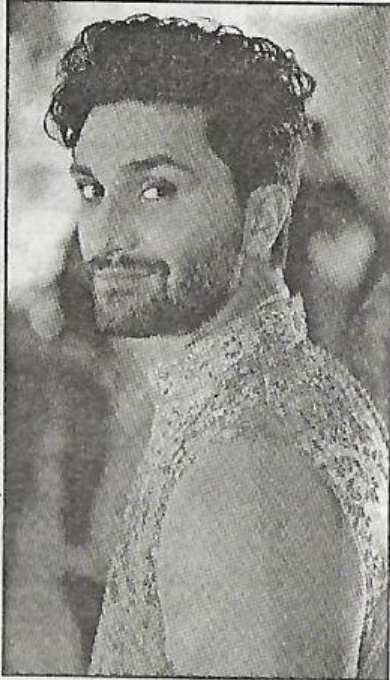
انکار کر دیا۔ اور یہی بات پاکستانی کمیونٹی کے شدید غصے کا باعث بنی لیکن جواب میں عاطف اسلم کے مداحوں نے اس بات کو صرف الزام قرار دیا۔

عاطف اسلم نے کہا کہ مجھے اپنے وطن اور پرچم سے محبت ہے اور میں شکریہ ادا کرتا ہوں

اپنے فیئز کا جنہوں نے ان بے سروپہ باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔

پرفیکٹ جوڑی

آصف رضا میر کے صاحبزادے احمد میر آج کل خبروں میں بہت ان ہیں وجہ ان کی اداکاری نہیں بلکہ کوآرٹسٹ محفل کے ساتھ تعلقات ہیں۔



اس سے محفل کا نام فیروز خان کے ساتھ لیا جاتا رہا ہے۔

احمد میر کا کہنا ہے کہ ڈرامہ یقین کا سفر کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ ہم دونوں کا کام کرنے کا انداز ایک سا ہے اور ہماری فیملیز بھی ایک دوسرے کو پسند کرتی ہیں۔

محفل سے ملاقات کو میں اپنی زندگی کا خوبصورت ترین دن تصور کرتا ہوں۔

تیری جنس کیوں؟

مارویہ ملک پاکستان کی پہلی خواجہ سرا نیوز کاسٹر جو کہ نور چینل سے وابستہ ہیں کہتی ہیں کہ کہوہ



نور چینل میرا مضبوط سہارا بنا مجھے تو میرے گھر والوں نے بھی دھتکار دیا تھا مگر چینل نے مجھے عزت کا روزگار فراہم کیا۔ آسٹریلیا کی ہائی کشنر نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور جرمن سفیر بذات خود محفل کر مجھ سے ملنے آئے۔ شہرت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب لوگ عزت دیتے ہیں رویے بدل گئے ہیں اور میری تمام پاکستانیوں سے گزارش ہے کہ وہ ہمیں بھی انسان سمجھیں جب مرد پہلی اور عورت دوسری جنس نہیں کہلاتے تو ہم تیری جنس کیوں؟

☆☆.....☆☆

ایک نہایت ہی منفرد دلچسپ ڈراما سلسلہ جسے آپ عرصہ دراز تک یاد رکھیں گے

المنقاس

علامہ سید احسن رضوی کا خیال

اس دل کا تحیر تھا آئینہ اس سر کا تصور تھا موقلم
تصال پہ نقطے لگا کیے تصویر بدلتی چلی جی

(قسط نمبر 11)

شازی سعید مغل

”اوہ..... اس نے پیٹنگ ہی بنا ڈالی..... انوکھی پیٹنگ.....“
”واقعی انوکھی ہے واقعی اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ اس نے انجانے میں کیا کر ڈالا ہے
یا اس سے کیا کروایا گیا ہے۔“ نگار خود کلامی کے انداز میں مسلسل بڑبڑاتی تھی۔
”کیا ہوا..... آنٹی کیا بات ہے؟“ سنہرا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
”ہوں.....“ نگار نے ایک گہرا ٹھنڈا سا کس خارج کرتے ہوئے کہا۔
”سنہرا تجھے وہاں پہنچنے میں دیر ہوگئی..... وہ پیٹنگ نہیں بنی چاہیے تھی اس کے مکمل ہونے سے پہلے
تجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا تو ایسی صورت حال پیش نہ آتی، خیر میرا نام بھی نگار ہے مجھے کچھ بھی کر کے اس
صورت حال پر قابو پانا ہی ہوگا۔“
”کیا کرو گی تم؟“ سنہرا نے جانتا چاہا۔
”دیکھتی جاؤ..... لاڈرا میرا فون تو اٹھا کر دے۔“ نگار نے دور پڑے اپنے سیل فون کی جانب اشارہ
کیا۔ سنہرا نے نگار کا فون اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ نگار نے فون لے کر کسی کا نمبر ملایا۔
”ہاں پرویز کیسے ہو؟“ نگار نے دوسری جانب سے فون اٹھانے پر نرم لہجے میں کہا۔
”میں ٹھیک ہوں نگار صابہ..... آپ نے ناچیز کو یاد فرمایا خوش نصیبی ہے میری.....“ بڑی لجاجت و
فرمانبرداری سے اس نے کہا۔
”میں فون سنہرا کو دے رہی ہوں..... یہ تمہیں ایک پتہ سمجھائے گی اچھی طرح سمجھ لیتا لکھ لیتا پھر میں
بات کرتی ہوں تم سے۔“ یہ کہہ کر نگار نے سنہرا کی جانب فون بڑھا دیا۔
”لو اس کو اس لڑکے کی نام ہے اس کا اور نگار صابہ کے گھر کا پتہ بتاؤ۔“ سنہرا نے فون ہاتھ میں لے لیا۔
دھیرے سے بولی۔

آواز لگائی اب اس کا یہاں بیٹھا محال تھا فائزہ دوا یک بار پہلے بھی اُسے بلا چکی تھی۔ اب بھی ناجائز تو خود آجاتی پھر جانا ہی پڑتا۔ چنانچہ وہ بادل خواستہ اٹھ کر اندر چل دیا۔ رات کا کھانا سب کے ساتھ مل کر کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ اپنے گوشہ مصوری کی طرف آ کر اس نے بلا مقصد کیونں پر اسٹروک لگانے شروع کر دیے کچھ دیر بے دلی سے اُلٹے سیدھے اسٹروک لگاتا رہا پھر گھر کے پچھلے سائیڈ بنے چھوٹے سے لان میں نکل آیا۔

اور لان میں ٹہلنے لگا۔ باہر ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا چاند بھی اس وقت کسی نہ کسی بادل کی اوٹ میں باری باری چھپ رہا تھا چند سیکنڈ تک اور نگزیب منہ اٹھانے چاند کی بادلوں کے ساتھ چھین چھپائی دیکھتا رہا پھر چند گہرے سانس لے کر لان کی نرم گھاس پر ٹہلنے لگا۔ ابھی اُسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ماں نے باہر آ کر جھانکا۔

”کیا رات بھر ٹہلنے کا ارادہ ہے آج تمہارا؟“

”نہیں بس امی جا رہا ہوں کمرے میں.....“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔
”چلو پھر تم اندر جاؤ..... میں غیر ضروری لائٹس وغیرہ بند کرنے آئی تھی تو تمہیں دیکھا مجھے پتہ ہے تم آج سنہرا کے ساتھ ملاقات کے وقت جو افراتفری ہوئی تھی اس وجہ سے پریشان ہو تم سے بات کرنی مگر جج تمہارے دادا اور دادی کی فلائٹ ہے۔“

”کہاں..... کہاں جا رہی ہیں دادی جان مجھے معلوم نہیں؟“ اور نگزیب لاعلمی پر حیران ہوا۔
”ہاں تمہیں فرصت نہیں ہے آج کل اور میں بھی بتانا بھول گئی اسی سلسلے میں آج مارکیٹ گئی تھی وہ اہل کے ساتھ پروگرام اچانک بنانا کا اماں کے بھانجی کی اکٹوٹی بیٹی کی شادی ہے لاہور جا رہی ہیں بہت اصرار سے بلایا ہے اس نے اماں کی بہن تو رہی نہیں اب اماں کا جانا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ہم سب ایک ساتھ نہیں جاسکتے اہل کے پیپر ہو رہے ہیں۔“

”اچھا.....“ اور نگزیب نے ماں کی بات سن کر کہا۔
”امی میں جا رہا ہوں سونے.....“ یہ کہہ کر اور نگزیب کمرے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ لاؤنج میں رکھے فون کی تیل ہونے لگی۔

”جی فرمائیے.....“ فون اٹھا کر کہا۔

”اوہ..... اچھی اس وقت.....“ دوسری طرف کی بات سن کر وہ بولا۔
”اوہ نو..... نو پر ایلیم ٹھیک ہے اوکے بائے۔“ جلد بازی سے فون رکھ کر مڑا فائزہ پشت پر کھڑی تھیں پوچھنے سے پہلے ہی جگت میں اور نگزیب بول پڑا۔

”امی وہ میری ایک پیٹنگ کے لیے سنہرا نے کسی سے بات کی ہے وہ ابھی لینے آ رہے ہیں۔“

”اس وقت..... رات کے گیارہ سے اوپر ہو رہے ہیں۔“

”جی امی سنہرا کا کہنا ہے وہ بھی صبح کی فلائٹ سے کہیں جا رہے ہیں تو کیا کریں مجبوری ہے.....“
”اوہ..... یہ بات ہے لگتا ہے کل سارے شہر کو صبح کی فلائٹ سے جانا ہے۔“ کہتی فائزہ کمرے میں جانے کے بجائے کچن کی جانب چل دیں۔ چند سیکنڈ بعد اور نگزیب گیٹ کھول رہا تھا اُسے سنہرا نے متوجہ کیا

تھا دروازہ کھول دو..... اتنی رات میں اطلاعی گھنٹی بجنے سے سب ڈسٹرب ہوتے اور نگزیب خود بھی یہی چاہتا تھا وہ سنہرا کی عقل مندی کا بار بار قائل ہو رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر خندہ پیشانی سے آنے والے کا استقبال کیا اور ساتھ لے کر نشست گاہ میں پہنچا۔
آنے والا اپنے فربہی مائل جسم کو لے کر دانتوں کی نمائش کرتا بغیر وقت ضائع کیے آرام دہ صوفے میں دھنس گیا۔

”اور نگزیب صاحب میں معافی چاہتا ہوں اس وقت تکلیف دی۔“ وہ ایسے شروع ہوا جیسے بٹن دبا دیا گیا ہو۔

”سنہرا جی نے بس اتنی تعریف کی نا کہ ہم جیسے قدر دان فن برداشت نہ کر سکے اور دیکھیے آن دھمکے..... کیا سمجھے.....“

”جی نہیں جناب میری خوش قسمتی ہے یہ کہ آپ میری پیٹنگ خریدنا چاہتے ہیں۔“ اور نگزیب تشکر آمیز لہجے میں بولا۔

”سنہرا جی فن کی بہت بڑی قدر دان ہیں آج مجھے پورا یقین آ گیا ہے۔“ اور نگزیب سر تا پیر سنہرا کے خلوص و محبت فن کی قدر دانی کا قائل ہو چکا تھا۔

”اور میں آپ جیسے قدر دانوں کا بے حد شکر گزار ہوں۔“ اور نگزیب نے خلوص سے کہا۔
”ارے..... اس تعریف سے مجھے شرمندہ نہ کیجئے مجھے صبح کی فلائٹ سے روانہ ہونا ہے کاروباری مسئلہ ہے کچھ ورنہ میں ضرور کہتا کہ آپ کل دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔“ آنے والے نے دانتوں کی نمائش جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہاں میں ذرا اپنا کام بننا کر آ جاؤں پھر ملتے ہیں۔ یہاں شہر سے باہر میرا فارم ہاؤس ہے سرسبز و شاداب، خوبصورت اور مضافات میں ہونے کے باعث آلودگی سے پاک فارم ہاؤس دور تک گھنے درختوں کا سلسلہ امید ہے آپ کو جگہ پسند آئے گی آپ جیسے فنکار لوگ ایسی جگہوں کی تلاش میں ہوتے ہیں ہا ہا ہا.....“ ایک بے ہنگم ہنسنے کے ساتھ اس نے جیب سے چیک بک نکالی اور بلینک چیک پر دستخط کر کے اور نگزیب کی جانب بڑھا دیا۔

”فن کی قدر دان ضرور ہوں مگر قیمت لگائی آج تک نہیں آئی آپ نے جو سوچا ہو گا وہ قیمت لگا دیجیے گا۔“ اس نے اور نگزیب کا کندھا تھپتھپایا پیٹنگ اٹھائی۔

”ارے میں رکھوا دیتا ہوں گاڑی میں رکھیے۔“ اور نگزیب نے اس کے ہاتھ سے پیٹنگ واپس لینی چاہیے۔

”ارے نہیں جناب اب تو یہ ہماری ہے۔“ اس نے پھر ایک بے ہنگم سا تہقہہ لگایا۔

”اچھا اب اجازت دیں مجھے جلدی کہیں پہنچنا ہے پھر ملتے ہیں اور آپ سے مزید تصاویر کے متنی رہیں گے۔“ اور نگزیب سے بات کرتا وہ گیٹ تک آیا۔ باہر باوردی ڈرائیور کھڑا تھا پیٹنگ گاڑی میں رکھوا کر وہ گاڑی میں بیٹھ کر طوفانوں کی طرح روانہ ہو گیا۔ اور نگزیب گاڑی کی سرخ بنیاں دیکھتا رہ گیا۔

اور پھر اپنے ہاتھ میں پکڑا بلینک چیک..... سب کچھ تیزی سے وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ وہ سنہرا کے خلوص کا

قائل تو ہو رہا تھا مگر آج اُسے ایک عجیب سا احساس پہلی بار محسوس ہوا جیسے کچھ اور ہے جو پس پردہ ہے اُسے عجیب سی بے چینی نے آن گھیرا..... گیٹ بند کر کے اندر آیا تو فائرہ منتظر تھی۔
”میں نے ساری باتیں سن لیں ہیں تمہیں پہلی کامیابی بہت بہت مبارک ہو میرے لال.....“ کہہ کر فائرہ نے اور نگزیب کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”تم نے اپنے ابو کے سامنے میرا سرخسر سے بلند کر دیا ہے میں جب اُن کو یہ بتاؤں گی تو یقین جانو تم نہیں جانتے وہ کتنا خوش ہوں گے۔“ فائرہ خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔
”امی! امی!.....“

”ہاں کیا تمہیں خوشی نہیں اس کی پریشان کیوں ہو رہے ہو کیا بات ہے؟“ فائرہ نے اور نگزیب کے متفکر چہرے کو دیکھا۔

”کچھ نہیں امی بس سمجھ نہیں آ رہا مجھے یہ سب ایسے اچانک پینٹنگ کی نمائش نہیں ہوئی اور میری وہ پینٹنگ ہی فروخت ہو گئی۔“

”ارے پاگل نمائش کون کروا رہا ہے سنہرانا؟ تو بس اس نے تو آج دیکھ لی ہے اتنی بڑی آرٹ گیلری کی مالک ہے خرید و فروخت کرتی رہتی ہے اب گیلری میں فروخت کرے یا نہیں بھی تمہیں اس سے کیا..... فن کو پروموٹ کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں کبھی بھی کہیں بھی کسی جگہ..... بس آفر کر دیتے ہیں اور فن کے دل دادہ بھی ایسے ہوتے ہیں جہاں کہیں کوئی فن پارہ پسند آ گیا کچھ نہیں دیکھتے اور خصوصاً پیسہ پاس ہو تو صرف دکھاتے ہیں..... یہ بلیک چیک۔“ فائرہ نے اور نگزیب سے بلیک چیک لیتے ہوئے کہا اور ہنس پڑی۔ اور نگزیب ماں کے اس مذاق پر چسکی سی ہنسی ہنس دیا۔

”اوہو اب سوچو تم..... جاؤ جا کر سو جاؤ..... مجھے لگا تھا تم خوشی سے دیوانے ہو جاؤ گے اپنی ایسی کسی کامیابی پر مگر تم تو سنجیدہ بلکہ رنجیدہ نظر آ رہے ہو۔“
”اوہو امی اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ اور نگزیب نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

”بہی تو میں کہہ رہی ہوں کوئی بات نہیں ہونی چاہیے ایسی تمہارے دل و دماغ میں چلو اب سو جاؤ جا کر۔“

”اچھا امی!.....“ اور نگزیب نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکرا کر کہا۔ اور اپنے کمرے میں آ کر لائٹ آن کی لائٹ آن کرتے ہی پہلی نظر غیر ارادی طور پر ایزل کی جانب اٹھ گئی چند لمحوں پہلے فروخت کی گئی پینٹنگ ایزل پر نموجوگی کا پتہ دے رہی تھی مگر دوسرے لمحے وہ اُس کی نظر کا دھوکا ثابت ہوئی وہ دوڑ کر ایزل کے پاس پہنچا وہاں کچھ بھی نہیں تھا اس نے اُس کو اپنا وہم سمجھا اور ذہن سے جھٹک دیا۔ پھر اس نے کمرے کی لائٹ آف کی اور لیٹ گیا۔ آج کے سارے دن پر غور و فکر کرنے لگا اور پھر ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا یہ خیال اس کے دل و دماغ میں کافی پہلے سے تھا مگر وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا آج کے واقعات نے اور خصوصاً اُس کی بنائی گئی ”نوٹھی پینٹنگ“ کی اس طرح انوکھی فروخت نے اسے یہ فیصلہ کرنے میں مدد دی فیصلہ کرتے ہی اُس کی بے چینی جیسے ختم سی ہو گئی اور اسے نیند نے آ لیا۔

رات کے دو بجے پرویز کے پاس نون آ گیا جس میں اسے اطلاع دی گئی کہ پینٹنگ خریدنے کا ڈراما

کامیاب ہو گیا ہے پرویز یہ سن کر بہت خوش ہوا اور پینٹنگ کو مقررہ جگہ پر پہنچانے کا حکم دے کر فون کاٹ کر دوسرا نمبر ملانے لگا۔

نگار اس وقت اپنے عملیات کے کمرے سے فارغ ہو کر نکلی تھی کہ اُس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس وقت وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی مگر پرویز کا نام دیکھ کر فون ریسو کر لیا۔ اُسے بالکل امید نہیں تھی کہ پرویز اُسے رات ہی فون کر دے گا۔

”بولو پرویز.....“ نگار نے اپنے لہجے کو قدرے نرم رکھتے ہوئے کہا۔

”میڈم جی کام ہو گیا جی.....“ اُس نے خوش خبری سنائی۔

”واقعی سچ کہہ رہے ہو.....“ نگار کی ساری کوفت دور ہو گئی۔ جو اس وقت پرویز کے فون سے پیدا ہوئی تھی۔

”جی میڈم بالکل سچ ہے.....“

”پینٹنگ کہاں ہے؟“

”انتہائی محفوظ جگہ ہے میڈم فکر مت کیجیے کہیے آپ کے پاس کب لے کر آؤں؟“

”ایسا کرو تم.....“ نگار نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تم نہیں آؤ میں کل شام تک تمہارے گھر آ کر لوں گی۔ تم کل دوپہر تک اپنے گھر منتقل کر لو اُسے.....“ پرویز پر تو شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی یہ سن کر کہ نگار جی اُس کے غریب خانے کو رونق بخشیں گی۔

”ہمارے تو بھاگ ہی جاگ گئے جی.....“ وہ سرشار ہو کر بولا۔

”ہاں میں تمہارا نصیب ہی تو جگانے آ رہی ہوں..... یہ دنیا بھی تمہارا ایسے ہی انتظار کرے گی ایک دن جیسے تم میرا کر رہے ہو۔“ نگار نے ہراساں لہجے میں کہا۔

پرویز نگار کے لہجے کی ہراساں ریت پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔

”بس میں پھر شام کو آپ کا دل و جان سے انتظار کروں گا۔“ پرویز سے خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

پرویز بارہ سال سے نگار کے ساتھ تھا..... اس کے کئی کام اس نے کیے تھے قابل بھروسہ اور نگار کے ساتھ ایماندار تھا عملیات کا بے حد شوقین تھا۔ نگار سے ملنے سے پہلے ایک بچی آبادی میں رہتا تھا کرتا کرتا کچھ نہیں تھا بڑی مشکلوں سے انٹر پاس کیا تھا دولت حاصل کرنے کے لیے بہت سے شارٹ کٹ استعمال کیے چھوٹی موٹی چوریاں بھی کیں مگر خطرہ زیادہ اور پکڑے جانے کا دھڑکا ہر وقت نگار رہتا تھا اس میں پہلے بیروں فقیروں کے چکر میں پڑا پھر جاوے کے ذریعے دولت کمانے کے لیے ادھر ادھر دھکے کھاتا بالآخر ایک دن نگار کی گاڑی سے آ کر ٹکرا گیا۔ بس جب سے اُس کا بے دام غلام بن گیا جو کہتی کرتا۔

صرف اس لیے کہ نگار اسے عملیات سکھا دے اور ایک دن جادو کی دنیا کا بادشاہ بنا دے۔ مگر نگار نے کوئی کچی گولیاں تھوڑا ہی کھلی ہوئی تھیں دو چار چھوٹے موٹے عمل اُس نے اُسے ضرور سکھا دیے تھے باقی کے لیے خوبصورت خواب دکھا دیے تھے ان میں سے ایک خواب پورا کرنے وہ اُس کے گھر آ رہی تھی۔

PAKISTAN EYE BANK SOCIETY

Free
Cornea Grafting
Treatment with
Dignity

46 Years
Service to Humanity



With your Trust
We have treated over

4.0 Million
Patients Across Pakistan



PEBS & GENERAL HOSPITAL
Contribute Zakat & Donation

Phone: 021-36908052-3 / 021-36985118
Fax: 021-36908054
Email: pakistaneeyebank@hotmail.com
Web: www.pakistaneeyebank.org

Bank Account No.
PK83 SAUB00000002000828718 (Sifk Bank)
PK75 ABPA0010011795080021 (ABL)
PK29 HABB0007860079659003 (HBL)

سرشاری کے عالم میں پرویز نے نگار سے بات کر کے اپنا فون ہی آف کر دیا وہ ایک پرسکون نیند لینا چاہتا تھا تاکہ کل کی تیاری کر سکے۔

اور نگار بیک کے گھر سے تھوڑی دور جا کر گاڑی رکھ کر اس میں دو لوگ مزید آ کر بیٹھ گئے۔ جن میں سے ایک آفتاب اور دوسرے کو عمران کہہ کر پکار رہا تھا یہ تینوں اپنے کاموں میں ماہر تھے پرویز نے انہیں پینٹنگ چرانے کا منصوبہ دیا تھا مگر انہوں نے اسے ایک کامیاب ڈرامے میں تبدیل کر دیا یہ طریقہ واردات نگار کو بے حد پسند آیا دولت کی اس کے پاس کی نہ تھی اور پھر اس کا مقصد پورا ہونے کے بعد تو ساری دنیا کے خزانے اس کے قدموں میں آنے لگے۔

”ہاں بھی آفتاب مجھے یہاں اتار دو اور اب تمہارا کام شروع.....“
”اوکے باس.....“ آفتاب نے کہا۔

”پینٹنگ اپنے گھر لے جاؤ کل پرویز صاحب لے جائیں گے آکر.....“ کچھ دیر ان کی گاڑی خاموش چھوٹے راستوں پر چلتی رہی باس کا گھر ایک بڑی شاہراہ پر تھا گاڑی اس شاہراہ پر پہنچ گئی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ آفتاب اور عمران پر نیند طاری ہو رہی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی جس شاہراہ پر ڈالتی تھی وہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار یک جھکے سے تیز تر ہو گئی تھی باس کی آنکھیں غنودگی سے بند ہو رہی تھیں ایک دم کل گئیں۔

”ارے شوکت..... کہاں لیے جا رہے ہو.....“
”باس کچھ گڑبڑ ہے.....“ شوکت چلایا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا گاڑی کا کنٹرول جیسے میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا آپ کے گھر کے سامنے سے ایسے نکلی رکی نہیں۔“

”بکواس بند کرو۔ دماغ مت خراب کرو گولی مار دوں گا تمہیں یہیں۔ روکو گاڑی واپس گھماؤ ڈرامے کرتے ہو مجھ سے۔“ باس برس پڑا۔

”میں میں سچ کہہ رہا ہوں..... بریک کام کر رہا ہے گاڑی نہیں رک رہی.....“ شوکت بے ربط جملے ادا کر رہا تھا۔ اسٹیرنگ چھوڑ دیا تو آنکھیں پھٹ پڑیں گاڑی نہایت مناسب رفتار سے شاہراہ پر دوڑ رہی تھی۔ علاقے میں آبادی کم تھی صرف ادھر ادھر کی فارم میں کوئی مکان نظر آ رہا تھا جو شام کی نیم تاریکی میں خاموشی میں کھویا ہوا معلوم دیتا تھا تھوڑے فاصلے کے بعد ایسے مکانات بھی غائب ہو گئے اور جنگل کی پٹی شروع ہو گئی پینٹنگ کے خرید و فروخت کرتے وقت ڈرامے کو رچاتے وقت ان میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس تاریک رات کے آغوش میں جلد ہی ایک ایسا وقت بھی آنے والا تھا جب تیر کے کچھ مقامات سے روشناسی کرا کے جانے لگا۔

سڑک کے دونوں اطراف درختوں کا سلسلہ جنگل تک بلکہ اس سے بھی آگے جا رہا تھا گاڑی کی رفتار متوازی تھی پھر رفتار قدرے کم ہو گئی۔ باس نے دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ لاکڈ تھا آواز اس کے گلے میں پھنس رہی تھی۔ یہی حال شوکت کا تھا گاڑی میں پیچھے بیٹھے ان کے ساتھی تقریباً بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ گاڑی آگے جا کر ایک سنسان موڑ کاٹ کر رک گئی جہاں سے ایک چھوٹا راستہ جنوب مشرق کی طرف

سنہرا نمودار ہو گئی وہ نگار کی پریشانی اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اسے کچھ دیر بے قراری سے ٹہلتا ہوا دیکھتی رہی بالآخر اس سے بولے بنارہا نہیں گیا۔

”آ خر تک اس طرح سے بھوکی شیرنی کی طرح ٹھلوگی آنٹی.....“ نگار کو بریک لگ گیا۔
”تمہیں اندازہ بھی ہے کہ کیا ستم ہو گیا ہے.....“ نگار نے سنہرا کو کھانچا جانے والی نظروں سے گھورا۔
”میں پریشانی سمجھ سکتی ہوں تمہاری آنٹی۔ چند دن کی بات ہے وہ میں دوبارہ بنوا لوں گی اس احمق سے۔“ سنہرا کا اشارہ اور نگار کی جانب تھا۔

”دوبارہ؟“ اس وقت تو دنیا کی سب بڑی احمق تو ہے۔“

”میں.....“ سنہرا بولی۔

”وہ پینٹنگ دوبارہ نہیں بن سکتی بنے گی ہی نہیں۔“ نگار نے کہا۔ اچانک اس کے غصے کا رخ سنہرا کی جانب ہو گیا۔

”پرویز سے زیادہ تو تو قصور وار ہے تجھے سزا نہیں ملنی چاہیے کیا؟“ نگار کی بھنویں تن کر کمان ہو گئیں۔

”مجھے.....“ سنہرا پریشان سی ہو گئی۔

”ہاں تجھے..... کیا ضرورت تھی وہ کارروائی کی آرٹ گیلری کی دیوار پر وہ بنانے کی۔“

”کیا ضرورت تھی تجھے..... تمثال کی شکل دکھانے کی اور اس سارے منظر میں الماس کو اس کے ساتھ..... کیا ضرورت تھی تجھے..... سارا میرا آگے کا بھی بنایا کام بگاڑ ڈالا۔ اب مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ جو میں ہرگز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ورنہ میں اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوسکوں گی۔“ نگار کے دل میں آگ بھڑک رہی تھی۔

پورے دن وہ یہاں وہاں جلے پیر کی بلی کی طرح پھرتی رہی سنہرا وہیں موجود تھی مگر نگار کے سامنے وہ اس وقت آئی جب وہ رات اپنے مخصوص کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ سنہرا اس کے دو قدم پیچھے آ رہی تھی۔

”کچھ بتاؤ گی نہیں کیا کرنے والی ہو؟“ نگار کمرے تک پہنچ چکی تھی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے مڑی۔

”سوال نہیں کوئی.....“ انتہائی ٹیکسی نظروں سے اس نے سنہرا کو دیکھا سنہرا اٹھوڑا پیچھے ہٹ گئی۔

”آتی ہوں..... انتظار کرو میرا.....“ کہتے ہوئے نگار نے دروازے کا پینڈل کھمایا اور دروازہ کھول دیا کمرے میں داخل ہو کر پیچھے مڑے بغیر دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد دروازے کے پاس کھڑی سامنے کی دیوار پر بنی کھڑکیوں پر نظر گاڑے رہی جن کے شیشوں سے اس کے باغ کا آئینی ویدر اسرار منظر نمایاں تھا۔ کچھ دیر کھڑی زیر لب کوئی متر پڑھتی رہی اور کھڑکیوں کی طرف پھونک مار دی۔ اور اپنے مخصوص آسن پر آ بیٹھی جس کے چاروں جانب ایک دائرہ کھینچا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے لبوں سے ادا ہونے والے غیر مبہم الفاظوں میں تیزی آتی گئی اور اس کے جھومنے میں بھی وہ دیوانہ وار جھوم رہی تھی۔ جتنی تیزی سے وہ جھوم رہی تھی اور مترازا کر رہی تھی اتنی تیزی سے کمرے میں ایک سرد احساس اجاگر ہو رہا تھا کمرے میں سردی بڑھتی جا رہی تھی۔

رگوں میں خون جمند کرنے والی سردی..... نگار کو بھی خود ایک لمحہ انتہائی تیز برد احساس ہوا وہ جس

مڑ گیا تھا۔ یہ ایک خوبصورت جنگلی مقام تھا۔ جہاں تک نظر جاسکتی تھی جنگل کے درمیان ایک خوبصورت صاف راستہ بنا دیا گیا تھا۔ اس راستے پر دونوں طرف لگے درختوں کی شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ باہم مل کر ایک محراب کی صورت چھائی ہوئی تھیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی عظیم الشان محل کی ایک برگ پوش غلام گردش ہے جو کہ رات کی سیاہی میں ویران پڑی ہے۔

”گاڑی کیوں رک دی میاں نکالو یہاں سے۔“ باس نے چیخ کر کہا جبکہ شوکت متعدد بار گاڑی اشارت کرنے کی کوشش کرتا چلا گیا مگر گھر گھر کی آواز کے ساتھ بند ہو جاتی۔

”انجن چیک کرو جلدی کرو۔“ باس نے حکم دیا۔ شوکت دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ہانپتے کانپتے گاڑی کا بونٹ اٹھا کر انجن چیک کرنے جھکا پھر سیدھا ہو گیا۔ گاڑی اشارت ہو چکی تھی۔

”کیا کر رہے ہو۔“ شوکت نے بونٹ گرایا۔

”ارے رکو.....“ شوکت تیزی سے پیچھے ہٹا۔ گاڑی آگے کھسکی اشارت ہو چکی تھی اندر سے باس کے چیخنے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ دیوانہ وار شوکت نے گاڑی کا عقبی مڈ گاڑ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کی انگلیاں پھسل گئیں اور دوسرے ہی لمحے شوکت سڑک پر لہسا لہسا گر پڑا۔ اس نے فوراً ہی کھڑے ہونے کی کوشش کی اور جب وہ پھراٹھ کر کھڑا ہوا گاڑی اس برگ پوش غلام گردش جیسے راستے پر گرجتی ہوئی جا رہی تھی۔

”ارے باس..... ارے.....“ اس نے غصے میں کئی گالیاں اپنے بے وفا ساتھیوں کو سنا ڈالیں۔ مگر اتنی دیر میں گاڑی جنگل کی تاریکی میں گم ہو چکی تھی۔ شوکت نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا درختوں کی شاخیں محراب کے مانند باہم جہاں ایک دوسرے سے کس کس ہوئیں تھیں وہاں کوئی کھڑا تھا۔

گھنے جنگل میں پراسرار غیر معمولی لمبا قد، گہرا ساناؤ لارنگ، ترشے ہوئے کھڑے کھڑے نقوش ایسا لگتا تھا جیسے مہانگی سے تراش کر بنائے گئے ہوں وہ انتہائی پُر غرور انداز میں اُس کی جانب بڑھا شوکت کو لگا دو قدیم درخت ٹکرا گئے ہو اُس میں اس کے چلنے سے جو دھمک پیدا ہو رہی تھی بڑی ٹیکسی تھی شوکت کانپ رہا تھا۔ دوسرے لمحے ایک بار پھر وہ زمین پر آ رہا تھا۔ دوسرے دن حادثے کی خبر ملی جس میں آفتاب، عمران اور باس معمولی زخمی حالت میں بے ہوش پڑے ملے تھے جنہیں ریسیکوپٹیم نے اسپتال پہنچایا زخموں کی حالت خطرے سے باہر تھی مگر حیرت انگیز طور پر تینوں دماغی توازن کھو چکے تھے۔ شوکت دو دن لاپتہ رہا پھر شہر کی سڑکوں کو چھینچلاتا پایا گیا جسے لوگوں نے پکڑ کر ایڈھی کے مینٹل ہاسپٹل پہنچا دیا۔

میڈیا اس خبر کو بار بار نشر کر رہا تھا پرویز صبح ناشتہ کرنے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہی تھا کہ نیوز چینل کے اسکر کے سنسنی خیز انداز میں کان پھاڑی آوازیں جو سنائی دیں سامنے دیکھا تو اس کے تینوں ہر کاروں کی فوٹو سلائیڈ پر چل رہی تھی۔ جیسے تیسے حلق میں چائے انڈیل کر وہ آندھی طوفان کی طرح وہاں سے نکل آیا۔ کچھ دیر بعد وہ نگار کو روح فرسا خبر دے رہا تھا۔ خبر سنتے ہی نگار پھری ہوئی شیرنی بن گئی۔ پرویز کو خوب کھری کھوئی سنائی۔ ہاتھ آئی کامیابی جو بھسل جائے گی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ پرویز کو کوشش ہی کر دیتی۔

”اس وقت..... اس وقت..... تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ پرویز خبردار جو مجھ سے رابطہ کیا جب تک میں خود نہ رابطہ کروں۔“ پرویز نے موقع غنیمت جانا اور وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت پائی۔ پرویز کے جانے کے بعد بھی وہ اپنے کمرے میں انتہائی غصے کے عالم میں یہاں وہاں ٹہل رہی تھی کہ



آپ دوشیزہ کے خدیار میں کو ملک کو

نہ مبادلہ پیچیدگی

اندرون ملک = 1000 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

165 امریکی ڈالرز	ایران	165 امریکی ڈالرز	کویت
165 امریکی ڈالرز	سری لنکا	165 امریکی ڈالرز	سعودی عرب
165 امریکی ڈالرز	جاپان	165 امریکی ڈالرز	یو اے ای
165 امریکی ڈالرز	لیبیا	165 امریکی ڈالرز	مصر
165 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	165 امریکی ڈالرز	یونان
165 امریکی ڈالرز	جرمنی	165 امریکی ڈالرز	فرانس
165 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	165 امریکی ڈالرز	برطانیہ
165 امریکی ڈالرز	پولینڈ	165 امریکی ڈالرز	ناروے
175 امریکی ڈالرز	کینیڈا	175 امریکی ڈالرز	امریکہ
175 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	175 امریکی ڈالرز	افریقہ

ذرا سا فتنہ

اگر آپ پاکستانی کرنسی میں پاکستان کے کسی بینک کے ذریعے ادائیگی کرنا چاہیں تو 175 امریکی ڈالر کے حساب سے مندرجہ بالا شرح کے مطابق بینک ڈرافٹ ارسال فرمائیں۔ مطلوبہ رقم کا ڈرافٹ Sach-Chee Kahaniyan Monthly کے نام بھیجیں۔ آپ کو ایک سال تک آپ کا پسندیدہ رسالہ ہوائی ڈاک سے بذریعہ رجسٹرڈ مٹلر رہے گا۔

آج ہی رابطہ کیجیے II C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی P.O Box # 3129 P.E.C.H.S Karachi-75400. فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

دائرے کے اندر آسن جمائے ہوئے تھی اس کے ارد گرد منجھد کر دینے والی سردی چکر لگا رہی تھی۔ اسی وقت اچانک کمرے میں لگے واحد روشن برقی قہقہے کی روشنی تھرائی اور دھندلی پڑتی چلی گئی۔ اتنی دھندلی کے قہقہے کے اندر محض ہلکے سرخ تار آتشیں لکیروں کی طرح چمکتے نظر آنے لگے یہ ایک وسیع کمرہ تھا جو آہستہ آہستہ تاریک سائے کی آغوش میں ڈوب گیا۔

دائرے سے باہر سردی اب سٹ کر ایک جگہ ٹھہر گئی تھی اور اس میں نفثی کمرہ پیدا ہو کر اوپر اٹھنے لگا۔ اتنی ناقابل یقین تیزی سے لہراتا ہوا اور چکراتا ہوا جیسے کسی ریگستان میں کوئی شیطانی روح ایک بگولے کی شکل اختیار کر کے طوفانی رفتار سے لپک رہی ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کمرے میں اونچائی اور موٹائی پیدا ہو گئی۔ اور ادھر ادھر پھیل کر وہ ایک دھوئیں کا جسم سامنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی بجھتے ہوئے قہقہے کے آتشیں لکیروں کی طرح چمکتے تاریکی کا حصہ بن گئے۔ اب کمرے میں نفثی کمرے سے پھوٹنے والی فاسفورس جیسی چمک پھیل رہی تھی۔

چمک اتنی تھی کہ کمرے میں رکھی چیزیں ہمہ نقوش سے واضح ہو رہی تھیں۔ یکا یک ایک تیز قسم کی بو کمرے میں پکڑنے لگی۔ جیسے کہ بہت سی چیزیں ایک ساتھ گلنے اور سڑنے لگی ہوں۔ عجیب بات تھی کہ باوجود ناگوار بو کے اس بدبو میں ایک نامعلوم قسم کا میٹھا پن تھا۔

نگار کے منٹروں میں مزید تیزی آ رہی تھی اس نے آنکھیں کھول دیں تھیں اور اب اس کی نظریں نفثی کمرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی وقت ایک ناقابل یقین اور خوفناک منظر کمرے کے در و دیواروں نے دیکھا۔ نگار کے ساتھ صرف کمرے کے در و دیوار اس ناقابل یقین منظر کے گواہ تھے۔

فرش سے تقریباً سات فٹ اوپر کمرہ اب خود بخود سکڑنے سمٹنے لگا تھا پھر وہ سٹ کر ایک سفید پھر سرمئی چہرے میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ سرمئی دھواں چہرے کے نقوش میں ڈھلنے لگا۔ دو آنکھیں جن کے ڈھیلے سفید تھے چہرہ سرمئی سے کالا تھا اب کمرہ دھیرے دھیرے اس طرح پکڑنے لگا کہیں سے سمٹنے اور سکڑنے لگا کہ جسم کا ایک ایک حصہ خود بخود دبنا جا رہا تھا۔

اب نگار کے سامنے نمودار ہوتی ہوئی شکل سر سے پاؤں تک مکمل ہو گئی تھی وہ عفریت نگار کے سامنے ایک مینار کی طرح کھڑی تھی اس کی آنکھیں جو ناک کی طرف ترجھی جمی ہوئی تھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں خوف و دہشت کے جو معنی عام طور پر سمجھے جاتے ہیں نگار کی حالت اس سے بہت مختلف تھی۔ اس کی کیفیت اس منزل سے کہیں آگے بڑھ گئی تھی جب ایک عام انسان اس قسم کے زبردست شیطانی مظاہرے کی تاب نہیں لاسکتا۔ چیخ مارتا ہے یا اس جگہ سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن نگار معمولی عورت نہ تھی طاغوت کی پیروکار تھی پجاری تھی ابلیس کی غلام تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے اب اپنے آقا کے سامنے کھڑی تھی اس کے سامنے پراسرار ہیولہ جس کی شکل انسانی بھی معلوم ہوتی تھی اور شیطانی بھی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ دھواں اس کے ارد گرد سمندر کی لہروں کی طرح لہراتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ کمرہ پورے کمرے میں بھر گیا کمرے کا گوشہ گوشہ ایک انتہائی ناگوار تیز بدبو سے بھر گیا۔ یہ بدبو ایک خاص قسم کی بوتھی جو ایک شیطانی جسم کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔

(جاری ہے)

مسئلہ ہے

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد ہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ذمہ داری کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی، اجتماعی و دعا اور مسلمانین و مسلمین (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعا ہے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بروقتی ہونی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اشاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ذمہ داری کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 500/- روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مدد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات نوکین منی 500/- روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا فرضی ناموں سے جوئے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ یا ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II - خیابان جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

عزیزانِ من! اللہ میرے بچوں کو ہمیشہ اپنی اماں میں رکھے۔ ذوالحجہ کا مبارک ماہ بھی اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک دن ہم سب کی زندگیاں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بس فرق یہ ہے کہ انسان ایک بار دنیا سے منہ موڑنے کے بعد دوبارہ نہیں آئے گا لہذا اس وقت کو غنیمت جانیں اور نیک عمل کرتے جائیں کیا پتہ کب زندگی کی شام ہو جائے۔ نماز اور استغفار کو اپنی عادت میں شامل کر لیں۔ قرآن مجید کا روز مطالعہ انسان کو انسانیت کی معراج کی طرف پہنچاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ اُن تمام لوگوں کو صحت کاملہ عطا فرمائے جو بیمار ہیں جو بچیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں اللہ انہیں نیک لوگ عطا فرمائے بے روزگاروں کو روزگار عطا ہو جس کی جو بھی پریشانی ہے وہ دور ہو اور وہ لوگ جو دنیا سے جا چکے ہیں اللہ پاک اُن کی مغفرت فرمائے آمین۔

□ نسیب الرحمان، کراچی

○ پیارے بابا جی، السلام علیکم! امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گے میں آپ کو پہلی بار خط لکھ رہا ہوں اور بڑی امید سے خط لکھ رہا ہوں۔ میرا نام نسیب الرحمان ہے۔ میری عمر سترہ سال ہے لیکن میں کہیں سے بھی سترہ سال کا نہیں لگتا۔ بابا جی میں بہت پریشان ہوں نہ میرا قد بڑھ رہا ہے اور نہ ہی

میں صحت مند ہو رہا ہوں میں بہت کمزور ہوں۔ میں لوگوں کے طعنے سن کر تنگ آ گیا ہوں۔ بابا جی آپ اللہ کے نیک بندے ہیں مہربانی کر کے مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتادیں جس سے میرا قد بھی بڑھ جائے اور میں صحت مند و تندرست بھی ہو جاؤں۔ میں آپ کا بہت مشکور رہوں گا۔

☆ بیٹے نسیب! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تم اپنی غذا متوازن کرو اور ورزش شروع کرو۔ صبح ناشتے سے پہلے ایک گھنٹہ دوڑا کرو۔ پھر خوب ڈٹ کر ناشتہ کرو جس میں ابلے ہوئے انڈے اور دودھ شامل ہو۔ رات کو سونے سے قبل دو انڈے توڑ کر دودھ میں ملاؤ اور پی لو چلتے پھرتے سبحان اللہ کا ورد ضرور کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔ □ پلو شہ۔ کراچی

○ بابا صاحب! میں بہت ممنون ہوں آپ کی کہ آپ نے میرے اتنے بڑے مسئلے کو توجہ دی اور حل کیا۔ سب سے پہلے تو شکریہ کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کیا۔ میری بیٹی کو عرصہ 3 سال سے اُس کا رشتہ کا چچا ہر اسال کر رہا تھا مگر یہ بات ماننے کو کوئی تیار نہیں تھا کیونکہ ان صاحب نے اپنے اوپر مذہب کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا بلکہ میری ساس نے تو مجھے ہی بالکل قرار دے دیا تھا۔ اب دس سال کی بچی سے کیا گواہی دلواتی وہ تو ویسے ہی بہت خوف زدہ رہتی تھی۔

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ اس نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C-II - فرسٹ فلور - خیابان جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی
مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے 021-35893121-35893122

چہرے پر رونق نہیں ہے، کیل مہاسے، جھانیاں
ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے دواچی
کہانیاں کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

آپ سے تعویذ لیا اور باباجی یقین کریں اس انسان
کا مکر وہ چہرہ خاندان والوں کے سامنے آ گیا میں
اب بہت مطمئن ہوں۔ دوسرا بڑا مرحلہ اب بچی کی
ذہنی نشوونما ہے مشورہ دیں کیا کروں؟
☆ بیٹی پلوش اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے کرم
کیا۔ خود بھی نماز کی پابندی کر دو اور بیٹی کو بھی اب نماز
کا پابند بناؤ۔ تعویذ انھی ایسے ہی رہتے دو جیسے ہے۔
بچی کو کسی اچھی نفسیاتی معالج کو ضرور دکھاؤ کئی ماہ کے
سیشن کے بعد وہ نارمل زندگی کی طرف لوٹے گی۔
بیٹی تمہارا فرض ہے کہ اپنے بچوں پر نظر رکھو جس
اذیت سے بچی گزری ہے اس کی کسی حد تک تم بھی
ذمہ دار ہو۔ اسی لیے کہتے ہیں اولاد پیدا کرنا آسان
ہے پالنا بہت مشکل، صبح و شام تمام بچوں کو آیت
الکرسی کے حصار میں رکھو۔

□ نہیب بیگم

○ باباجی! میری والدہ آپ کے رابطے میں رہتی
تھیں اب وہ بہت ضعیف ہو گئی ہیں مگر مجھے کہہ رہی
ہیں کہ اپنے مسئلے کے لیے آپ کو خط لکھوں سب سے
پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے واٹس اپ نمبر کی
سہولت دے دی ورنہ خط پوسٹ کرنے اور جواب
آنے میں بہت دن لگ جاتے ہیں۔ باباجی میں بیہوش
میں رہتی ہوں شادی ہو کر آئی تھی اب تو 24 سال
گزر گئے۔ میرے 2 بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ باباجی
یہاں کا ماحول بہت خراب ہے۔ میں جانتی ہوں کہ

جلد از جلد بیٹی کی شادی کروں بیٹے ابھی چھوٹے
ہیں مگر یہاں دوستیوں کا رواج عام ہے بیٹی کے فرض
سے فارغ ہو جاؤں تو پھر لڑکوں کا سوچوں گی۔ پایا
جی مجھے تعویذ عنایت کر دیں کیونکہ میں بھی جاب کرنی
ہوں اکثر نمازی فقہ پر مبنی پڑتی ہے۔

☆ بیٹی نہیب! شکریہ بچی کہانیاں والوں کا کہ
انہوں نے واٹس اپ کی سہولت باہر والوں کے لیے
رکھی ہے ورنہ میں تو عام فون بھی استعمال نہیں کرتا
عبادت کے لیے ہی وقت کم لگتا ہے پھر فون یا
ملاقات کے بعد تو شاید فرض نمازیں بھی خشوع و
خضوع سے ادا کرنا مشکل ہو جائے۔ بہر حال
پریشان مت ہو بچی کے لیے میں تعویذ تیار کر دوں
گا۔ بلکہ میں مشورہ دوں گا کہ بیٹوں کے لیے بھی
تعویذ منگو الوم مجھے اپنا پتہ ارسال کر دو مہرا DHL
کی فیس تمہارے تعویذ گھر کے پتے پر ارسال کر دیے
جائیں گے۔ تمہاری خواہش تھی کہ جواب بچی
کہانیاں میں بھی دیا جائے تو دیکھ لو جواب موجود ہے
بس میں نے فرضی نام سے خط شائع کیا ہے۔

□ شاہین شیخ ملتان

○ محترم باباجان! عرض یہ ہے کہ ہم نے تین
سال پہلے یہ گھر خریدا تھا۔ جب سے ہم اس گھر میں
آئے ہیں ہمیں شدید نقصان ہو رہا ہے جس کام
میں ہاتھ ڈالتے ہیں بننے بننے کام گڑ جاتے ہیں نہ
ہی بچوں کو کوئی جاب مل رہی ہے نہ ہی کوئی کام ہو رہا
ہے۔ دو چار عالموں سے پتا کروایا ہے کوئی کہتا ہے
کہ آپ کے رشتے دار آپ سے بہت حد کرتے
ہیں۔ آپ رشتے داروں سے دور چلے جائیں تو
آپ کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ

بے اولاد جوڑوں کے لیے شرطیہ علاج یا کچھ پن یا کسی اور وجہ سے اگر اولاد نہ ہوتی ہو تو فوری رابطہ کریں۔ اور
چند ماہ کے علاج کے بعد اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں کھلائیں۔

بالوں کا گرنا، خشکی، بے جان بال ان سب کے
لیے جڑی بوٹیوں سے تیار 150 سو لپ پرائز
نسخہ..... اب آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ رابطہ
35893121-35893122.....

پہلے دوبارہ اپلائی کیا تھا لیکن انہوں نے ہماری فیملی
کے ویزے refuse کر دیے ہیں۔ باباجی! ہمارے
تمام مسائل کے حل کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیں۔
میرے خط کا جواب مارچ کے شمارے میں ضرور
دے دیں مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی شاہین! اللہ تمہارے مسائل حل
فرمائے۔ لاہور شفٹ ہونے میں ابتدا میں تو مسائل
ہوں گے مگر بعد میں حالات قابو میں آئیں گے۔ تم
جو کچھ پڑھ رہی ہو پڑھتی رہو، کچھ دنوں کے لیے
سورۃ یٰسین پڑھنا ترک کر دو۔ بیٹے پر الحمد شریف اور
چاروں قل پڑھ کر دن میں 5 بار ضرور دم کیا کرو۔

Hyd-A.B.C.□

○ محترم بزرگ! السلام علیکم! امید ہے کہ
خیریت سے ہوں گے۔ اللہ رب العزت آپ کا
سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ اس سے پہلے بھی
آپ کو کوئی خط پوسٹ کروا کر کوئی جواب نہ آیا۔
ڈاک کی خرابی ہے آپ تک تو پہنچ جاتے ہیں مگر پھر
نہیں پتا؟ بہر حال اب مجھے رسالے میں ہی جلد از
جلد جواب دے دیں۔ حالات بہت سنگین ہیں۔
میری عمر 33 سال ہو چکی ہے اب تک رشتے آئے
اور ختم ہو گئے۔ کافی عالموں کو دکھایا۔ تمام حالات
بتانے بیٹھ گئی تو کئی کا پیاں بھر جائیں گی۔ اصل مسئلہ
جو کھل کر سامنے آیا وہ یہ ہے کہ میری امی کے ساتھ

پر کسی نے کالا جادو کروایا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ کی
چھیلی پر ہوائی جیڑوں کے اثرات ہیں۔ اب کسی نے
بتایا ہے کہ آپ کا گھر قبرستان کے پاس ہے آپ
کے گھر جنات کا سایہ ہے آپ فوراً یہ گھر بیچ دیں۔
باباجی! ہمیں سمجھ نہیں لگ رہی کہ کیا کریں؟ پچھلے
سال میں نے اپنے بیٹے خرم میر کے لیے کاروبار کے
لیے تعویذ بھی منگوایا تھا لیکن اس سے بھی کوئی کام کا
سلسلہ نہیں بنا، جو بھی کام کیا ہے اس میں نقصان ہی
ہوا ہے۔ اپنے ذاتی 23'22 لاکھ کا نقصان ہوا ہے اور
اوپر سے دس پندرہ لاکھ کا قرضہ بھی چڑھ گیا ہے۔
باباجی! میں نے تقریباً گیارہ ماہ حسبنا اللہ و نفعم
الوکیل کا وظیفہ تھپ کے نام 450 مرتبہ یہ بھی کیا
ہے۔ آخر میں روزانہ فجر کے بعد سورۃ یٰسین سورۃ
رحمن اور سورۃ مزمل پڑھتی ہوں۔ عشاء کے بعد سورۃ
واقفہ بھی پڑھتی ہوں لیکن پھر بھی کوئی کام نہیں ہو رہا۔
ہمیں کسی نے بتایا ہے کہ آپ پر جو اثرات ہیں اس
کی وجہ سے آپ کے ہر کام میں رکاوٹ آ رہی ہے۔
باباجی! ہماری تمام رکاوٹیں ختم ہو جائیں، اس کے
لیے کوئی وظیفہ بتا دیں اور یہ بھی بتائیں کہ اگر ہم گھر
بیچ کر لاہور شفٹ ہو جائیں تو کیا ہمارے تمام
مسائل حل ہو جائیں گے؟ ہمارے لیے کیا لاہور جانا
بہتر رہے گا؟ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا
اس سال سی ایس ایس کے پیپر دے رہا ہے اس کے
لیے دُعا کرویں کہ اس کا سی ایس ایس کلیئر ہو جائے
اور اس کو بہت اچھی جاب بھی مل جائے اس کو پڑھنے
کے لیے کچھ بتا دیں۔ باباجی! ہمارے پانچ سال
پہلے انگلینڈ کے ویزے لگے تھے جو کہ جنوری 2009ء
میں ختم ہو رہے ہیں۔ باباجی! ہم نے تقریباً ڈیڑھ ماہ

وہ بچے اور بچیاں جو دلچسپی سے پڑھنا ہیں اور لوگوں کے چٹک آمیز جملوں کا نشانہ بننے میں فوری طور پر
رابطہ کریں 2 مہینے کے علاج سے اس مسئلے سے جان چھوٹ جائے گی۔

اندرونی اور بیرونی زخموں آپریشن کے بعد ٹانگوں کا کچارہ جانا یا کسی بھی قسم کی چوٹ کے لیے دوا دستیاب ہے۔ جن گھروں میں چھوٹے بچے ہیں وہاں اکثر کھیل کود کے دوران سر پر چوٹ لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوا سر میں خون جمنے نہیں دیتی دوا حاصل کرنے کے لیے جی کھانیاں کے دفتر فون کریں۔

بلند فشار خون کے لیے دوا دستیاب ہے

دانتوں کے جلد امراض کے لیے اکثر دوا ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے اپنا آرڈر جی کھانیاں کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

□ رقیہ - کراچی

☆ بیٹی رقیہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہارے خواب تمہارے ذہنی انتشار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بیٹی! تعویذ احتیاط سے رکھو اور ورد جاری رکھو۔ اللہ تمہارے لیے بہتر سبب پیدا کرے گا۔

□ فضیلہ - کلر سیدان

☆ بیٹی فضیلہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ رکاوٹ مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے۔ مناسب ہوگا مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ بیٹی! دوا تیار ہے مگر ڈاک خانے والے دوا ارسال کرنے کو تیار نہیں۔ بقول ان کے پالیسی نہیں ہے۔ تم دوا ”جی کھانیاں“ کے دفتر سے منگوا لو۔ طریقہ استعمال دوا کے ساتھ دے دیا جائے گا۔

□ پروین - ایئر پورٹ

☆ بیٹی پروین! اللہ تمہارے بیٹے اور شوہر کی روزی میں برکت دے۔ نماز فجر کے بعد 1100 بار پڑھو یا تحفۃ القانم پھر دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ حمیرا - نواب شاہ

☆ بیٹی حمیرا! تمہیں سب نے ایسا اس لیے کہا کہ قصور تمہارا نہیں ہے تم ایک بہت اچھی ماں بیوی اور بیٹی ہو مگر کیا کیا جائے اگر دوسرا شخص ذہنی اور نفسیاتی مریض ہو؟ احساس کمتری میں مبتلا مرد ہو یا عورت وہ زندگی میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہنا بہت سہل ہے مگر بیٹی! بعض اوقات مشکل راستے پر چل کر ہی انسان کا میاب ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو گھر بچوں اور اپنی ذمہ داریوں میں

ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جدوجہد اور جستجو کرنا چھوڑ دے۔ تم نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ تم ناکام ہی ہو گی اسی لیے ناکام ہی ہو رہی ہو۔ ہر گھر میں مسائل ہوتے ہیں اور وہ حل بھی ہو جاتے ہیں۔ تمہارے گھر میں جو مسائل ہیں ان کی ذمہ داری تمہیں لہذا اپنے آپ کو سزا مت دو۔ حالات بدلنا چاہتی ہو تو خوب محنت کرو اور سب سے پہلے اپنی سوچ مثبت کر لو۔ جس قدر ممکن ہو پڑھو۔ رُب زدنہی علما پھر کامیابی کی دُعا کرو۔ یہ ورد نتیجہ آنے تک جاری رکھو۔

□ ع - خ - کراچی

☆ بیٹی! ہدیہ لفافے میں مت رکھا کرو۔ ڈاک خانے والے ایسے خطوط ادارے تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ بہر حال مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ بے شک بندش ہے۔ تفصیل ”جی کھانیاں“ کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو یا جوابی لفاظی ارسال کر کے معلوم کر لو۔

□ شانہ شاہ - مقام نامعلوم

☆ بیٹی شانہ! اپنے شوہر کا حسب استطاعت صدقہ نکال دو۔ خواب مسائل اور مشکلات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ الحمد شریف اور چاروں نکل پڑھ کر دم بھی کرو۔

□ عبد اللہ - ماتلی

☆ بیٹی عبد اللہ! اللہ تمہیں خوش رکھے اور مالی مسائل حل فرمائے۔ یاد رکھو زندگی میں جلد بازی اکثر نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ بہر حال نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۃ منزل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

پاک سینٹ فیکٹری میں ایک معمولی سی نوکری کرتے ہیں اور میں نے ابھی پڑھائی ختم کی ہے۔ بہت پریشان ہوں مہربانی کر کے میری پریشانی کا کوئی حل لکائیں۔ میری بہن پریشانی ہے کہ میرے والد کا ذیل پاک سینٹ میں گولڈن فیکٹری ہینڈ کے پیسے رکے ہوئے ہیں اور پیسے دینے سے انکار کر رہے ہیں جس کی وجہ سے میرے والد بہت پریشان ہیں۔ میری دوسری پریشانی یہ ہے کہ میرا کام میں بالکل بھی دل نہیں لگتا اگر کام نہ ملے تو پریشان رہتا ہوں اور اگر کام ملے تو کام نہیں ہوتا ہے۔ باباجی! میرے لیے دُعا کریں۔ مجھے فوج میں جانے کا بہت شوق ہے لیکن ناکامی سے ڈر لگتا ہے۔

☆ بیٹی! اختر! اپنے والد سے کہو نیت کر لیں کہ رقم وصول ہونے کے بعد کچھ رقم غریبوں میں ضرور تقسیم کریں گے۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو بیٹے! ڈرنے والے کچھ نہیں کر پاتے۔ قدم بڑھاؤ گے، یہ بھی آگے بڑھو گے۔ ناکامی اور کامیابی دونوں زندگی کا حصہ ہیں۔ ناکامی سے گھبرانا نہیں چاہیے اور کامیابی پر آپے سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور ہر نماز کے بعد 7 تسبیح یا تحفۃ القانم کی ضرورت پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ عارفہ عباسی - کھاریاں

☆ بیٹی عارفہ! تمہاری منتی سوچ ہی تم کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ انسان زندگی میں اکثر ناکام

کوئی سایہ ہے جو کہ شادی سے پہلے کا ہے اس نے مجھے (بچپن سے) میری چھوٹی بہن اور ایک بھائی ہم تنوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر کام میں بہت رکاوٹیں ہیں۔ صحت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ کسی سے بھی علاج کرواؤ تو وقتی فائدہ ہو جاتا ہے اور رشتے آنا شروع ہوتے ہیں یہ وقتی فائدہ مہینہ بھر رہتا ہے۔ کبھی خواب میں دیکھتی ہوں کہ بہت بڑی 3 منزلہ بلڈنگ ہے وہاں سے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہوں آگے سیڑھیاں تنگ ہیں اور ابھی میں یہی سوچ رہی ہوں کہ گھر اتنا اچھا ہے اور سیڑھیاں کیسی بنائی ہیں کہ وہ بلڈنگ مجھ پر آگرتی ہے اور آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی اور ابھی بہت اسی طرح کے خواب ہیں۔ امید ہے کہ اللہ رب العزت آپ کے ہاتھوں اس شیطان سے جان چھڑائیں گے۔ کوئی بہت جلالی وظیفہ اور جو بھی ہدایت دیں عطا فرمائیں۔ جس بہن اور بھائی کے ساتھ مسئلہ ہے ان کا نام بھی لکھ رہی ہوں۔ جلد از جلد جواب دیں۔ بہت پریشان ہیں۔

☆ بیٹی! تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا، بس اللہ سے دُعا کرو اور والدہ سے کہو کہ اپنے نام سے تعویذ منگوا کر گھر میں محفوظ مقام پر رکھیں۔ انشاء اللہ مسائل حل ہوں گے۔

□ اختر اچوٹ - سندھ

☆ بیٹی عارفہ! اللہ تمہاری منتی سوچ ہی تم کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ انسان زندگی میں اکثر ناکام

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرے والد ذیل

بچیاں جن کی شادی میں رکاوٹ ہے اپنی والدہ کے نام کے ساتھ لکھیں کلام الہی سے شریہ علاج انشاء اللہ چند دنوں میں رکاوٹ دور ہوگی اور من پسند شخص ملے گا۔

کتاب دوستی

کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تصنیف دوام پائے؟
کیا آپ سچی کہانیاں ڈائجسٹ میں اپنی کتاب پر
مفصل آرٹیکل دیکھنا چاہتے ہیں؟

احمد سجاد بابر کے فسوں رنگ انداز اور سحر کار قلم
سے.....

آج ہی اپنی کتاب کی دوکاپیاں اس پتے پر بھیجیں۔
ہم دیں گے آپ کے شہ پارے کو نیا رنگ
احمد سجاد بابر معرفت تنویر فوٹو اسٹیٹ

بلاک 10 DGK

رابطہ: 0300-7029995

مشغول کرلو۔ روناباکل ترک کر دو ہاں جب اللہ
کے سامنے سجدہ ریز ہو تو خوب دل کی بھڑاس
آنسوؤں کی صورت میں نکال لیا کرو۔
□ ایس۔ن۔ جہاں۔ کراچی۔

☆ بیٹی! جو حالات تم نے لکھے ہیں اس میں
مناسب ہوگا مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تفصیل ”سچی
کہانیاں“ کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو۔
□ کے۔ این۔ خان۔ کراچی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔
ڈاک خانے والوں نے تمہیں منی آرڈر کی رسید دی
ہوگی وہ مجھے ارسال کر دو۔ ”سچی کہانیاں“ کے دفتر
کے نمبر پر ہیں۔

□ تحریر محبوب۔ مقام نامعلوم۔
☆ بیٹی شریہ! اللہ تمہارے والد کو جنت الفردوس
میں جگہ دے۔ بیٹی! نیک ہستیاں نہ تو رقم لیتی ہیں اور
☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ اسب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود
ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

II C-88۔ فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7۔ کراچی

آپ کی ڈائری

یہ ہمے آپ کی پسند، آپ کا انتخاب

تاریخ

چمکتے موتی

- (1) اللہ سے ڈرنے والا شخص سب سے پہلے اس کے بندوں کے معاملے میں محتاط رہتا ہے۔
- (2) دعا دستک کی طرح ہے اور مسلسل دستک سے دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔
- (3) غصہ کرنے کا مطلب ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں کا انتقام اپنے آپ سے لے رہے ہیں۔
- (4) دوست ہزار بھی کم ہیں دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔
- (5) دنیا میں سب سے بڑا گناہ لوگوں کو اذیت اور تکلیف دینا ہے۔

مرسلہ: فرح شاہد۔ کراچی

وظیفہ

ہر غم کا ہر دکھ کا
وظیفہ کرتا تھا وہ
پھر مجھ سے چھڑ گیا
زخمِ جدائی سہہ گیا
کوئی جا کر پوچھے اُس سے
میرے غم کا اُس جدائی کا
کوئی بھی وظیفہ
کیا اُسے یاد نہیں؟

.....

حدیث نبوی

بنی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جتنی سخت آزمائشیں اور مصیبت ہوتی ہے۔ اتنا ہی بڑا اس کا صلہ ہوتا ہے اور خدا جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو ان کو مزید نکھارنے کے لیے، کندن بنانے کے لیے آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پس جو خدا کی رضا پر راضی ہوں، خدا بھی اُن سے راضی ہو جاتا ہے۔
مرسلہ: ہدایت اللہ۔ کراچی

اقوال حضرت علیؑ

☆ اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہارا رزق اللہ کے پاس ہے تو پھر رزق کی تلاش نہ کرو بلکہ اللہ کو تلاش کرو جس کے پاس تمہارا رزق ہے۔
☆ جو شخص اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھتا وہ ندامت اٹھاتا ہے۔ زبان کی حفاظت دولت کی حفاظت سے زیادہ مشکل ہے۔
☆ کسی محتاج کو کوئی چیز عطا کرنے میں کل تک کا انتظار مت کرو۔ تمہیں کیا معلوم کل تک تمہیں یا اُسے کیا پیش آئے گا۔
☆ صبر کی تلقین کو کامیابی کی لذت اور شیرینی دور کرتی ہے۔
☆ صدقہ بلا اور عذاب ہٹانے کا ذریعہ ہے۔
مرسلہ: مسز نورین۔ کراچی

پیار کیے جا

آنکھ ہرزہ سہرا ہے اتنی ان کی بس
چھوڑ سب باتیں چپ چاپ بس اعتبار کیے جا
وہ کہتے رہے وہ ہمارے ہیں
ان کا جھوٹ جان کر بھی بس پیار کیے جا
وہ ہر جا کی ہے میرے دل کا دعویٰ ہے سچا
بھول جا یہ سب سچ بس دیدار کیے جا
ہم ان پہ ہیں خدا ان کی رب جانے
چھوڑ سب حساب بس اقرار کیے جا
دل ہی چلتا ہے دل ہی کہتا ہے
وہ بے وفا ہے مگر ندان سے نکرار کیے جا
جھوٹ سرشت میں شامل ہے ان کی
بھول جان کی کج ادائیاں بس پیار کیے جا
.....

قطعہ

جوسو دوزیاں کی فکر کرے
وہ عشق نہیں مزدوری ہے
میں تجھے کتنا چاہتی ہوں
یہ کہنا غیر ضروری ہے

عابدہ مغل۔ کراچی

ایک سوال

اشفاق احمد کہتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے ایک سوال نے مجھے بہت پریشان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ملنے والوں سے اکثر اس سوال کے بارے میں پوچھا۔ مگر مجھے کسی نے بھی اس کا جواب نہیں دیا۔
سوال یہ تھا۔

”مومن اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟“ ایک دفعہ ایک گاؤں گیا۔ وہاں ایک بزرگ سے ملا تو ان کے پاس گیا اور ان سے پوچھا۔
”مومن اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟“ انہوں

نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولے۔

”مسلمان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے اور مومن وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی کی مانتا ہے۔“
.....

دوست اور دوستی

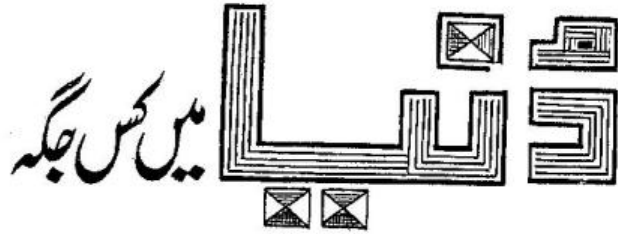
انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک دوستی کی تلاش میں نکلتا ہے مگر دوستی اس پھول کی مانند ہے جو ذرا سی گرم سی لو سے کھلا جاتی ہے، کوشش کیجیے گا کہ آپ کے گرم مزاج کی گرمی آپ کے دوستوں تک نہ پہنچے دوست کی نیکیوں کو یاد رکھتے ہوئے اُس کی کمزوریوں کو نظر انداز کریں، تو دوستی کا یہ پھول سدا مہک کر سب کو معطر کر سکتا ہے۔
عثمان غنی۔ پشاور

تخت اور تاج

تیمور لنگ اور بجاہت میں جنگ ہوئی۔ بجاہت بے چارے کی ایک آنکھ تھی۔ وہ جنگ میں شکست کھا گیا۔ اور گرفتار کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا۔ تیمور اُسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ تو درباریوں نے ڈرتے ڈرتے اس کی وجہ اس سے پوچھی۔ تیمور نے کہا۔ ”میں اس لیے ہنس رہا ہوں کہ خدا کی نظر میں یہ تخت و تاج اتنی معمولی چیز ہے کہ اس نے کانے سے چھین کر لنگڑے کے حوالے کر دی۔“
مرسلہ: ہنس علی۔ کھاریاں

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی روشن باتیں

☆ ہم میں سے وہی زندہ رہے گا۔ جو دلوں میں زندہ رہے گا اور دلوں میں وہی زندہ رہے گا جو خیر بنائے گا، بخشش بنائے گا اور آسانیاں پیدا کرے گا۔ (اشفاق احمد)
☆ خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے۔ جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں



سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اس لیے کہ ”سچی کہانیاں“ کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ ”سچی کہانیاں“ کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ”سچی کہانیاں“ پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے۔ ”سچی کہانیاں“ میں آپ بیتیاں جگ بیتیاں اعترافات جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابل تھین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلے کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین دہریہ کے درمیان دلچسپ لڑکھونڈک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ ”سچی کہانیاں“ میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا۔ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پیرل پبلی کیشنز : II-88 فرسٹ فلور خیابان جلی کرشل۔

ڈیفنس چیمبر اتھارٹی۔ فیز۔ 7۔ کراچی فون نمبر: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

☆ ایک تعمیراتی ورکر کی۔ جو پل بنا سکے، پڑوسیوں کے درمیان۔
☆ ایک مالی کی جو اچھی سوچ کا شت کر سکے۔
☆ ایک استاد کی جو دل سے پڑھا سکے۔
☆ ایک ریاضی دان کی جو ہم سب کو سکھا سکے کہ کس طرح ہم خوشیوں کو بانٹ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی زندگیوں میں۔
مرسلہ: موہن خان۔ کراچی
تھکن

انسان تھکتا ہے کسی کام کو کرنے یا کوئی بوجھ اٹھانے سے نہیں۔ بلکہ تب جب میلوں کا سفر محلوں میں طے کرنا پڑتا ہے۔ جب اپنے ہی درد کو بیان نہیں کر پاتا جب خود کو نفرت اور محبت کے ترازو میں اوپر نیچے ہوتے دیکھتا ہے جب کسی بات کا جواب بھی مجرم بن کر دینا پڑتا ہے۔ جب بے تصور ہو کر سڑکیں چلنا پڑتا ہے۔ جب تکلیف چھپا کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ٹھیک ہوں۔ جب دل میں درد کا انبار آٹھوں میں آٹسو ہوں۔ مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ لانی پڑے جب کسی کو اتنا چاہتے ہوئے بھی اس کی چاہت سے محروم رہنا پڑے۔ جب اپنے ہی دل کو اپنے ہی آنسوؤں میں ڈوبا ہوا دیکھنا پڑتا ہے۔ جب کہنے کو بہت کچھ مگر کہنے کا حوصلہ نہ پڑے جب کسی کو فقط ایک نظر دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں بند میں بھی کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔ جب کسی سے دور رہ کر اس کے احساس میں چلنا پڑتا ہے جب جاگتی آنکھوں کے خواب کی تعبیر بھی تلاش کرنے کے لیے بھٹکتا ہے جب خیالوں کے گہرے سمندر میں غوطہ زن ہو کر حقیقت کا کنارہ تلاش کرتا ہے۔ جب جینا مشکل اور مرنا آسان لگتا ہے۔ تب تھکتا ہے انسان اور پھر ایسی تھکن کہ مرنے پر بھی اس کا جسم اسی تھکن میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ اور اسی اکڑے ہوئے وجود کو لے کر

خونفردہ رہتے ہیں۔ (بانو قدسیہ)
مرسلہ: نعمان حبیب۔ حیدر آباد
اصلاح
ایک چھوٹی سی بچی نے اپنی ٹیچر کو بتایا رات کو میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ سویا تھا۔ ٹیچر نے جملے کی اصلاح کو درست کرتے ہوئے فقرے کو درست کر کے دہرایا۔ ”رات کو میں ڈیڈی کے ساتھ سوئی تھی۔ بچی یہ فقرہ سن کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ یہ اس وقت ہوا ہوگا جب میں سوچا تھا۔

مرسلہ: پرویز شاہ۔ گھونگی
پر دیسی سا جن کے نام
اب کے سا جن جب تم آنا
میرے لیے چند تھکے لانا
جوتوں، کپڑوں، پرنیوم کے علاوہ
میک اپ کی ایک کٹ بھی لانا
اب کے سا جن جب تم آنا
چھوٹی سی فرمائش ہے بس ایک
تھوڑے سے کچھ ڈالر بھی
ایک بڑے سے بیگ میں بھر کر لانا
اب کے سا جن جب تم آنا
دیکھو کچھ بھی بھول نہ جانا
شاعرہ: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ لاہور
فوری ضرورت ہے

☆ خون کی نہیں، صرف ایک الیکٹریشن کی، جو دوبارہ کرنٹ دوڑا سکے، ان لوگوں کے درمیان جو لوگوں کے درمیان ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔
☆ ایک (Optician) عینک ساز کی جو لوگوں کا آؤٹ لک تبدیل کر سکے۔
☆ ایک آرٹسٹ کی جو ہر کسی کے چہرے پر مسکراہٹ بنا سکے۔

انسان اس نرم مٹی میں دفن ہو جاتا ہے۔

حمیرا ظفری۔ کراچی

سخت جان

گدا گرنے ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو خاتون خانہ باہر نکلیں۔ فقیر کو دیکھ کر وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ ”میں نے تمہیں پچھلے سال بھی کھانا دیا تھا۔“

فقیر نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا بیگم صاحبہ! دراصل آپ نے مجھ اکیلے کو کھانا نہیں دیا تھا۔ ہم تین فقیر اکٹھے آئے تھے۔ آپ نے ہم تینوں کو کھانا کھلایا تھا۔ اتفاق سے ان میں سے صرف میں ہی زندہ بچا ہوں۔“

مرسلہ: اشعر فیضان۔ لاہور

سادگی پر تیرے.....

سردار اپنے بیٹے کے لیے رشتہ لینے گیا۔ لڑکی والے: ابھی تو ہماری بیٹی پڑھ رہی ہے۔ سردار: چلو کوئی بات نہیں ہم ایک گھنٹے بعد پھر آ جائیں گے۔

مرسلہ: انوار علی۔ کراچی

غزل

قرب کے نہ وفا کے ہوتے ہیں
سارے جھگڑے انا کے ہوتے ہیں
بات نیت کی ہے صرف ورنہ
وقت سارے دعا کے ہوتے ہیں
بھول جاتے ہیں مت برا کہنا
لوگ پتلے خطا کے ہوتے ہیں
وہ جو بظاہر کچھ نہیں لگتے
اُن سے رشتے بلا کہ ہوتے ہیں
وہ ہمارا ہے اس طرح سے فیض
جیسے بندے خدا کے ہوتے ہیں
انتخاب۔ عامر مغل۔ کراچی

گھر کی مرغی

سیکرٹری نے اپنے پاس کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”سر! ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنے کے لیے آئی ہیں۔“

”کیا وہ خوبصورت ہے.....؟“

پاس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جی ہاں انتہائی خوبصورت اور دلکش۔“

سیکرٹری نے جواب دیا۔

”اچھا..... اسے اندر بھیج دو۔“ پاس نے کہا اور جلدی جلدی اپنے بال سنوارنے لگا۔

جب وہ عورت ملاقات کر کے چلی گئی تو پاس نے اپنے سیکرٹری کو طلب کیا۔ ”تم احمق تو نہیں ہو؟“

پاس نے غصے سے کہا۔ ”اس بد صورت عورت میں حسن کہاں سے تمہیں نظر آ گیا؟“

”میں معذرت خواہ ہوں سر!“ سیکرٹری نے لاجت میں کہا۔ ”انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ ان کے انداز سے میں سمجھا کہ وہ آپ کی بیوی ہیں۔“

”وہ میری بیوی ہی تھی۔“ پاس نے آہستہ سے کہا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔“

مرسلہ: بسمہ احسن۔ کوٹری

جیب کترا

دہلی میں، ایک جیب کرتا تھا، جس کا انگوٹھا قینچی کے پھل کی طرح دو دھارا تھا۔ اس نے کلمے کی انگلی بھی پتھر پر گھس گھس کر شیشے کی مانند سخت کر لی تھی۔ باہر کے ایک صاحب جو، خواجہ حسن نظامی کے ہاں آئے اور شکایت کی کہ ”دہلی کے جیب کتروں کی بڑی سنی تھی۔ آج ہمیں دہلی کے بازاروں میں پھرتے چارون ہو گئے۔ لیکن کسی کو جال نہیں ہوئی کہ کوئی ہماری جیب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لے۔“ خواجہ صاحب نے اس چنگی باز کو بلوایا اور ان

صاحب سے اس چنگی باز کا آئنا سامنا کرایا۔ اس ہنرمند نے مسکرا کر کہا ”خواجہ صاحب! میرے شاگردوں نے ان صاحب کا حلیہ بتایا تھا۔ چارون سے انگرکھے کے اندر کی جیب میں پتیل کے آٹھ ماشے وزن کے سکے ڈالے گھوم رہے ہیں اور وہ بھی گنتی کے چار۔ آپ ہی بتائیے کون جعلی سکوں پر اپنی نیت خراب کرے گا۔“

اخلاق احمد دہلوی کی کتاب ”پھر وہ اپنا بیان“ سے مصباح شاہ، کراچی کا انتخاب کا انتخاب

غزل

نہ دل سے آہ نہ دل سے صدا نکلتی ہے
مگر یہ بات بڑی دور جا نکلتی ہے
ستم تو یہ ہے کہ عہد ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے
وصال بحر کی حسرت میں بُوئے کم مایہ
کبھی کبھی کسی صحرا میں جا نکلتی ہے
میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے
وہ زندگی ہو کہ دنیا فراز کیا کیجیے
کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے
شاعر: احمد فراز پسند: اقبال علیم۔ پنڈی

چھوٹی چھوٹی باتیں

داوی جان نے ٹھنڈی سانس لے کر پوچھی سے کہا۔ ”آج کل کی لڑکیاں تو کسی بات پر نہیں شرما تیں۔ ہمارا زمانہ اور تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑکیوں کے چہرے شرم سے سرخ ہو جاتے تھے۔“

”کیا آپ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے بتانا پسند کریں گی؟“ پوچھی نے سنجیدگی سے فرمائش کی۔

مرسلہ: انیس پاشا۔ چیچہ وطنی

یادداشت

ایک پروفیسر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر پہنچے اور کافی دیر تک اس کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔

کھانے کا وقت ہوا تو انہوں نے وہیں کھانا بھی ایک ساتھ کھالیا۔ پھر شطرنج کی بساط بچھ گئی۔ کئی گھنٹے بعد جب پروفیسر رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر دوست نے رسماً پوچھا۔

”گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟“

پروفیسر نے چونک کر جواب دیا۔ ”خوب یاد دلایا تم نے۔ دراصل میں تمہارے پاس اس لیے آیا تھا کہ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔“

مرسلہ: نور فاطمہ۔ مٹلی

برائے مہربانی

مشہور ارب پتی راک فیلر ایک دن اپنے دفتر سے اُٹھے تو انہیں ایک اجنبی نے روک کر اپنی ڈکھ بھری داستان سنائی اور امداد کرنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔

”مسٹر راک فیلر! میں بیس میل پیدل چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ راستے میں مجھے جتنے بھی لوگ ملے سب نے بتایا نیویارک میں آپ سے رحم دل کوئی نہیں۔“

راک فیلر نے پوچھا۔ ”کیا آپ اسی راستے سے واپس جائیں گے؟“

”اجنبی نے کہا۔“ ہاں۔“

راک فیلر نے کہا۔ ”تو میرا ایک کام کر دیجیے۔ براہ مہربانی واپسی پر اس افواہ کی تردید کرتے جائیے۔“

اقبال حسین۔ کراچی



میں کس جگہ
سچی کہانیاں
کے چمچے نہیں

آپ دوشیزہ کے خریدارین کو ملے گا
نرماد لہ پیچھے

اندرون ملک = 1000 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

کویت	165 امریکی ڈالرز	ایمان	165 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	165 امریکی ڈالرز	سری لنکا	165 امریکی ڈالرز
یو اے ای	165 امریکی ڈالرز	جاپان	165 امریکی ڈالرز
مصر	165 امریکی ڈالرز	لیبیا	165 امریکی ڈالرز
یونان	165 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	165 امریکی ڈالرز
فرانس	165 امریکی ڈالرز	جرمنی	165 امریکی ڈالرز
برطانیہ	165 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	165 امریکی ڈالرز
ناروے	165 امریکی ڈالرز	پولینڈ	165 امریکی ڈالرز
امریکہ	175 امریکی ڈالرز	کینیڈا	175 امریکی ڈالرز
افریقہ	175 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	175 امریکی ڈالرز

زرسالت

اگر آپ پاکستانی کرنسی میں پاکستان کے کسی بینک کے ذریعے ادائیگی کرنا چاہیں تو
175 امریکی ڈالر کے حساب سے مندرجہ بالا شرح کے مطابق بینک ڈرافٹ ارسال
فرمائیں۔ مطلوب رقم کا ڈرافٹ Monthly Sach-Chee Kahaniyan کے نام بھیجیں۔
آپ کو ایک سال تک آپ کا پسندیدہ رسالہ ہوائی ڈاک سے بذریعہ جبری ملتا رہے گا۔

آج ہی رابطہ کیجیے II C-88 فرسٹ فلور، خیابان جامی کرشل، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی
P.O Box # 3129 P.E.C.H.S Karachi-75400. فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ 5 منٹ بعد وارڈ کا
دروازہ کھلا اور پارٹ ٹائم جعدار اندر داخل ہوا اور
اس نے جلدی سے اس پنگ کا لائف سپورٹ پنگ
سسٹم نکالا اور اپنا موبائل چارج پر لگا دیا۔
مرسلہ: نذیب شاہ۔ شہزاد کوٹ

مزے کی بات
☆ جانوروں کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ عید بقر عید اور
شادیوں پر بجٹ کا کیا کیا جائے۔
☆ ان کے آخری لمحات غیر ضروری رسوں اور
بوجھل تکلفات سے دور ہوتے ہیں۔

☆ ان کے کفن دفن پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔
☆ ان کی موت کے بعد جائیداد کے سلسلے میں
خاندان میں نفرتیں اور شیشیں پیدا ہوتی ہیں۔
☆ انہیں آخرت میں سوال و جواب کا کوئی
خوف نہیں ہوتا۔

مرسلہ: شہزاد عدیل۔ کراچی
غرور و تکبر

حافظ بن المذہب راہی کتاب 'الحجاب الغریبہ'
میں لکھتے ہیں۔ میں نے نجران کی مسجد میں ایک
جوان کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اس کی
خوبصورتی، درازی قد اور مضبوطی سے متعجب
ہو گیا۔ اس جوان نے کہا۔ ”تم میری طرف اتنے
غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”میں نے کہا کہ آپ کے جمال و کمال پر
حیران ہوں۔“ وہ کہنے لگا۔

”تو ہی کیا، خود اللہ تعالیٰ کو بھی تعجب ہے۔“
یہ جملہ کہتے ہی وہ گھٹنے اور پستہ قد ہونے لگا اور
کم ہوتے ہوتے ایک بالشت رہ گیا۔ اس کے کسی
رشتہ دار نے اسے آستین میں رکھا اور لے گیا۔

مرسلہ: آصفہ عدیل۔ کراچی

جدائی

ہوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے جدا کئی بار
لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا
دو گھڑی، اس سے رہو، دور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایہ دیوار سے دیوار جدا
یہ جدائی کی گھڑی ہے کہ چھڑی ساون کی
میں جدا گریہ کنائ، ابر جدا، یار جدا
پسند: حمید اللہ۔ مٹھوکی

ماں کا حق

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی ماں کی
بہت خدمت کی، اس کی بیماری کا علاج کروایا، اسے
سہولتیں فراہم کی، اس کے پاؤں دبائے اس طرح ہم
نے ماں کا حق ادا کر دیا ایسے لوگوں کے بارے میں
حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تمہاری عمر ریت
کے ذروں، بارش کے قطروں اور درخت کے پتوں
جیسی ہو اور تم اس ساری زندگی میں اپنی ماں کی
خدمت کرتے رہو تو تب بھی تم اپنی ماں کا ہتھکڑیاں ایک
حق ادا نہیں کر سکتے جو اس نے نو ماہ تک اپنے پیٹ
میں اٹھائے رکھا، اس سے سمجھ لیں کہ ماں کی کتنی
عظمت اور فضیلت ہے۔ آپ نماز پڑھیں روزے
رکھیں لیکن یاد رکھیں اگر آپ کی ماں آپ سے
ناراض ہے تو آپ کا کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں۔
مرسلہ: مسز مہدی۔ اسلام آباد

وجہ

ہاسپٹل کے آئی سی یو وارڈ کے ایک پنگ پر ہر
اتوار کو موجود مریض کی انتہائی ڈرامائی صورت میں
ٹھیک 11 بجے موت واقع ہو جاتی تھی سب ڈاکٹرز
نے اس غیر معمولی صورت حال کی وجہ جاننے کے
لیے اتوار کی صبح گیارہ بجے سے ٹھیک سات منٹ
پہلے اس مخصوص پنگ کے مریض کے پاس بہت

شعر و سخن

شکاری اپنے مطلب کا نشانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
اُن کی جنگ میں آخر بھرم قائم بھی رکھنا ہے
تویوں کرتے ہیں راستہ درمیانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
خضر حیات۔ روڈ ہٹھل

غزل

بچپن کے سبھی خواب سہانے لگتے ہیں
اپنوں کے دیے درد پرانے لگتے ہیں
تم بن میری ذات ادھوری لگتی ہے
گزری باتیں سب افسانے لگتے ہیں
خواب کی مانند یاد تھیں تیری باتیں
گزرے ہوئے سال زمانے لگتے ہیں
نہر کھیت باغ میں دونوں ملتے تھے
بستی کے نشان ٹھکانے لگتے ہیں
سوچا تھا سبھی گھاؤ تمہیں دکھاؤں گا
اب تو سبھی زخم پرانے لگتے ہیں
تم بن ہے سنان عمری مدت سے
تہائیوں میں زخم جلانے لگتے ہیں
آج بھی دل میں زندہ چاہت ہے تری
اب حسن تمہیں کیوں بیگانے لگتے ہیں
ایم حسن نظامی۔ قبولہ شریف

غزل

تم محبت کے دیپ جلا کر تو دیکھو
ہمارے دل سے دل لگا کر تو دیکھو
پھر دیکھنا تاریکی میں روشنی پھیلے گی
تاریکی میں جتنوں کو چھو کر تو دیکھو
ہوگی پھر ہر طرف رونق عاشقی
اک بار محفل ملاقات سجا کر تو دیکھو

نظم

جن ہنسنا غم سے بوجھل ہو
اور یاد کسی کی آئی ہو
تب بند کرے میں بند ہو جانا
اور چکے چکے رو لینا
جب آنکھیں گیلی ہو جائیں
اور یاد میں کسی بہہ آئیں
پھر خود کو دھوکہ مت دینا
اور چکے چکے رو لینا
جب پائیں قرب سے موندی ہو
اور سن سمجھے کہ غم سوئے ہو
تب نگہ منہ پر رکھ دینا
اور چکے چکے رو لینا
تم سب کے سامنے چپ رہنا
اور کچھ بھی کسی سے نہ کہنا
تہائی میں تم جب ہو کسی
اور چکے چکے رو لینا

عثمان غنی۔ پشاور

غزل

کسی دن تم سے ملنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
چلو کچھ سال پہلے کا زمانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
اندھیرا کتنا ہی گہرا ہو
راتیں کتنی ہی کالی ہوں
برندے اپنا آستانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
مٹکے ہم سے بھی لگتا ہے کوئی درد کا مرا
کیسے دل سوخنا کا ہم بھی شاد ڈھونڈ لیتے ہیں
خدا محفوظ رکھے اُن کی ضد پر ہم نہ آجائیں

محبت ہی محبت ہوگی ہر طرف
تم دھرتوں میں بسا کر تو دیکھو
میشہ کے لیے ہو جائے گا تمہارا
اک بار نام محبت پکار کر تو دیکھو
پھر میں عاشق ہوں فقط تمہارا فیصل
تم محبت کے دیپ جلا کر تو دیکھو
فیصل مشتاق۔ قبولہ شریف

غزل

بیقرار ہے دل کو قرار بھی تو نہیں ہے
اب کسی کا مگر انتظار بھی تو نہیں ہے
کیا گلہ ہو پھولوں سے بے پرواہی کا
پہلے کی طرح چمن میں سوگوار بھی تو نہیں ہے
گوچ کرے کدھر کو یادوں کا کرواں
ہمرا کوئی راہبری کی پکار بھی تو نہیں ہے
سنگ برسا رہا ہے یہ ہر جانی موسم
کچھ اس کا مزاج خوشگوار بھی تو نہیں ہے
پڑ گئے پاؤں میں جھالے چلتے چلتے
اور کچھ راستہ ہموار چھٹی تو نہیں ہے
طے کیسے ہوتے اس دوری کے فاصلے
راہ کوئی ملن کی استوار بھی تو نہیں ہے
بچ بھنور گھوم رہی ہے تمنائوں کی کشتی
ہاتھ اپنے کوئی چتوار بھی تو نہیں ہے
عامر شہزاد۔ نکانہ صاحب

غزل

محبت کے ضمن میں موت کو خیانت کہتے ہیں
وہ میری عاجزی کو اب ندامت کہتے ہیں
میری بے مائیگی و آشفۃ خالی کی قسم
نہ بچو گے اس روز کہ جسے قیامت کہتے ہیں
مڑ مڑ کے دیکھنا اور دیکھتے ہی رہنا
نظروں کی وفا کو صاحب عداوت کہتے ہیں

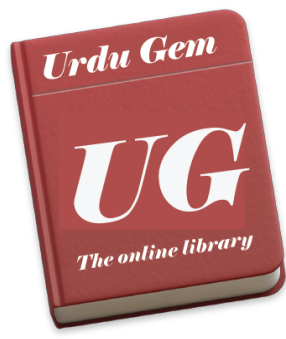
پوروں پہ چن رکھا ہے جنہیں ہم نے
ان آنسوؤں کو تیری امانت کہتے ہیں
برسوں یاد کو خانہ دل میں جو رکھا
ہائے اہل زمانا اسے ذہانت کہتے ہیں
خاک دل بھی جواڑے دے لیں
لوگ اس وہم و نشین کو محبت کرتے ہیں
ملین افضل و ڈرائیج۔ شاد پوال، گجرات

غزل

باغیاں نے شاخ کائی جس پہ میرا تھا آشیان
کوئی نہ اپنا بنا آزمایا سارا جہاں
اپنے مقصد کے لیے ایک دوسرے سے ہیں رابطے
بے سبب کوئی کسی سے بھی نہیں ملتا یہاں
آشیانے سے گری منزل نہ پھر مجھ کو ملی
قریب قریب پھر کے دیکھا میں نے یہ سارا جہاں
غیروں نے روندنا مجھے اپنوں نے ٹھکرایا مجھے
دیکھو قسمت نے مجھے لاکر گرایا ہے کہاں
بے سبب کی ہمتیں آئیں میرے حصے میں سب
نیت اللہ چاہتا ہے کون جانے گا یہاں
جس کو بھی اپنا بنایا نکلا غیروں کا وہی
میرے جذبوں کی ہوئی تذلیل کیسے اور کہاں
دنیا نے چھیننا تھا مجھ سے جو میرا صبر و قرار
اپنے رب کے سائے میں آکر ملی مجھ کو اماں
چھوڑ دے نفو تو دنیا میں کسی سے بھی امید
اب تو یہ سچ مان لے کوئی نہیں تیرا یہاں
پسند: نفیسہ فضل محمود

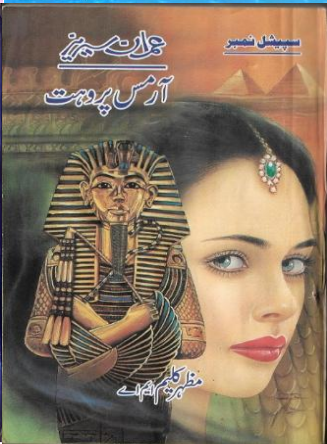
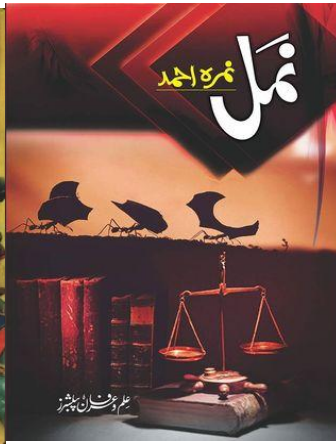
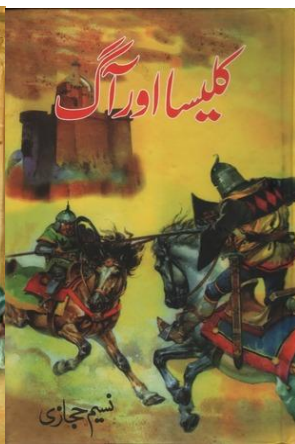
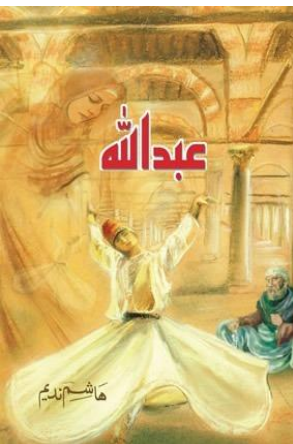
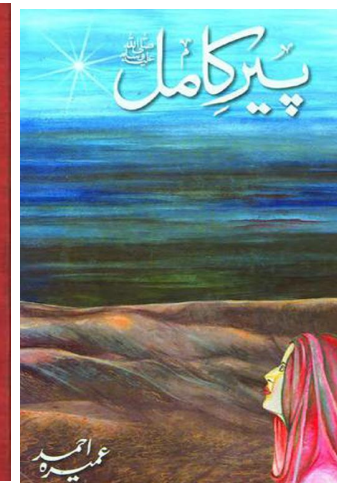
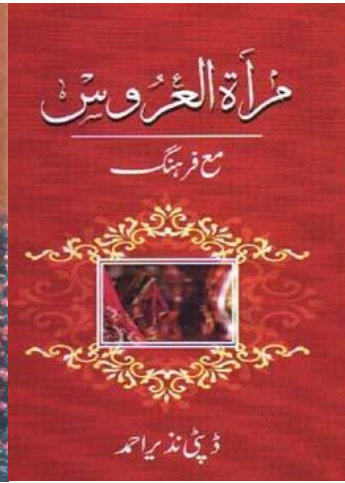
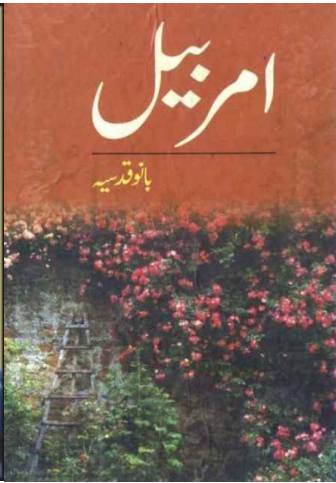
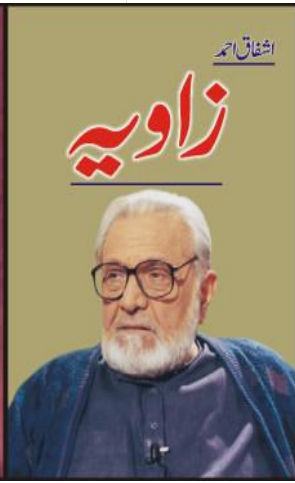
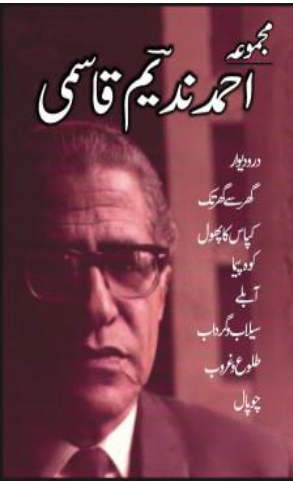
نیند بھاگ جائے

میرے گھر کی چھت پر
امیدوں کی طرح ایک ٹوٹی میڑھی
پڑی ہے
ساتھ کچھ رکھوں کے ڈبے نسان سوکے لیے

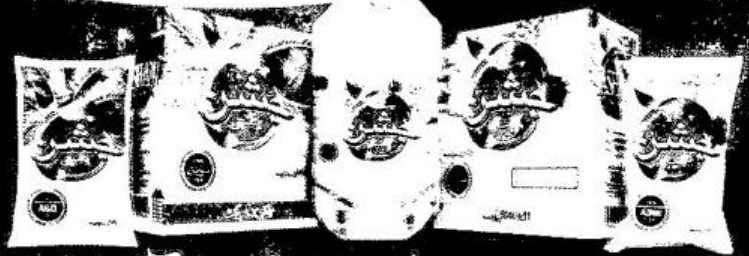


UrduGem.com

URDU KA KHAZAANA



مکتوب



سناسپتی اینڈ کوکنگ آئل

لیکن

16 مارچ اور بہار کا موسم
تمہیں میری یاد ضرور دلائے گا
مگر مجھے کیا معلوم تھا
فراموشی کی حد کیا ہے
امید سے ناامیدی کا سفر
کتنا مختصر ہے

شاعرہ: دیبا علی صدیقی

کیوں؟

اچھا تھا اسی روز جدا ہو جاتے
وہ خفا تھے ہم بھی خفا ہو جاتے
اب جو مجبور بیٹھے ہیں
خود سے بھی دور بیٹھے ہیں
اب جو چلتے چلتے پاؤں تھکے ہیں
راستے بھی یوگی راستوں میں رُکے ہیں
جیت جیت ہم خود کو ہار رہے ہیں
لحہ خود کو مار رہے ہیں
مغرور تھے ہم..... کیوں غرور میں نہ رہے ہم
پھر عاجز ہوئے تو کیوں ڈنڈھوڑے دے ڈالے

آئینہ دیکھا جا بجا قصور وار تھے
کیوں ہم وفاؤں میں اُلجھے رہے
کیوں ہم جفا سے آشنا نہ ہو پائے
کیوں اس سے جدا نہ ہو پائے
کیوں ہم خفا نہ ہو پائے
پھر اب کیوں
ہم خود سے دور بیٹھے ہیں
کیوں اتنے مجبور بیٹھے ہیں
شاعرہ: عائشہ نور عاشر شادیوال گجرات

☆☆.....☆☆

پڑے ہیں خالی

کہ جیسے جذبات سے عاری آنکھیں
کسی کے چہرے پر
اواسیوں کے رنگ چھوڑ جائیں
ایک بالٹی زنگ لگی سی
اویں محبت کے روٹھ جانے
کا زکم کھائے ہوئے دل کے جیسی

پڑی ہے چھت پر

ہیں زرد پتے و دھول مٹی و کاغذ کے پُر زے
مڑے ترے سے، ہوا کے جھوکوں سے لڑتے پھرتے
شور کرتے ادھر ادھر بھاگتے ہیں پھرتے
کہ جیسے سوچ میں، خوابوں کے ٹوٹے ریزے
لا حاصل خواہشوں کے سوکھے پتے

باد کی جب ہوا چلتی تو
کبھی شمس قدر چائیں
کہ آنکھیں سوندھ پائیں
اور نیند بھی ان کے سنگ
کہیں بھاگ جائے

شاعرہ: خولہ عرفان

امید

اک موہوم سی امید
ہاں
آج ٹوٹ گئی
نجانے کیوں مجھ کو گمان گزر رہا تھا
کہ شاید
تمہاری سوچ کے کسی کونے میں
میرا مٹا مٹا سا نام باقی ہے
بھیلے ہی سال کے باقی دن
تم مجھے یاد کرنا بھول جاؤ